اکبر الہ آبادی

از

طالب الہ آبادی

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

اکبر الہ آبادی

از طالب الہ آبادی

مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد

قیمت فی جلد قسم اوّل مجلّد

دفعہ اوّل

فہرست اکبر الہ آبادی

آئینۂ اکبر

دیباچہ ا۔ اکبر کا تعارف۔ بعض وجوہ شہرت۔ بقاے کلام کے دلائل۔ مطالعہ مصنف کی اہمیت۔ تحریر حیات۔ انتخاب سوانح۔ موصوف کے خیالات خود اپنی حیات کے بابتہ۔ کلیات کی اشاعت اور اُس کی ترتیب۔ حیات اکبر لکھنے میں مشکلات۔ معاونین کا شکریہ۔ خطوط کے اقتباسات۔ نتائج۔ پیدائش۔ مقام بارہ۔ لوگوں کی غلطیاں۔ کلام اکبر کی خصوصیات۔ آفتاب سخن اور سماوی آفتاب کا مقابلہ۔ زمانہ کا رُخ۔

"صبح" ادوار۔ حیات و کلام۔ ضرورت تقسیم۔ مشکلات تقسیم۔ ادوار "صبح" دوپہر۔ شام۔ وجوہ پسند۔ شعرالہند اور تاریخ ادب اُردو پر ایک نظر۔ حسب و نسب سید تفضل حسین صاحب۔ اور میر وارث علی صاحب۔ تحصیلداری کی شان۔ اکبر کے والد کی علمی حالت۔

ابتدائی تعلیم۔ جمنا مشن اسکول۔ علامہ فاروق۔ شوق مطالعہ۔ شاعری کی ابتدا۔ کلام کے نمونے اور تنقید۔ مولوی وحید الدین صاحب وحید۔ غلطبیانیاں عذر کے بعد اودی حالت۔ وحید کے کلام کے نمونے۔ موت کا افسانہ۔ تاریخ وفات۔ استاد کے کلام کا اکبر کی ابتدائی غزلوں پر اثر اکبر کے اشغال زندگی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۹ء تک۔ جمنا برج کی نوکری۔ ریلوے مالگدام کی نوکری۔ کچہری میں درخواست دو لطیفے۔ نقل نویسی۔ ۱۸۶۶ء میں امتحان وکالت۔ حافظہ۔ نائب تحصیلداری۔ وکالت۔ ابتدائی کلام کے نمونے معہ تنقید۔ مشاعرے۔ اپنی حیات و کلام کے متعلق خود اکبر کے خیالات انھیں کے کلام سے شواہد۔ معہ ضروری تشریحات کے۔ اکبر اور اودھ پنچ۔ نظم و نثر کے مضامین معہ اقتباسات و تنقید۔ جنگ نامہ روم و روس۔

مقدمہ

اکبر کا تعارف ۔ بعض خاص وجوہ شہرت ۔ بقائے کلام کے دلائل ۔ مطالعہ مصنف کی اہمیت ۔ ضروری خیالات ۔ شواہد خارجی و داخلی ۔ انتخاب سوانح ۔

اکبر کا دور حیات ۱۸۴۶ء سے شروع ہوا اور ظاہرا ۱۹۲۱ء میں ختم ہو گیا ۔ مگر اِن کا کلام اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک فطرت انسانی میں احساس اور اثر پذیری کی قوتیں باقی ہیں ۔

ظاہر بیں نگاہوں کے لئے میرا یہ دعویٰ مبالغہ سے لبریز اور بیجا ستائش سے مملو ہو گا لیکن میں سچائی اور صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ دعوئ بالا میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس میں غلو کی چھانوں یا شخصیت پرستی کا لگاؤ ہو ۔

دُنیا میں ہر شخص دوہری زندگی بسر کرتا ہے ۔ ایک تو وہ حیات جو ساعتوں اور دنوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے اور دوسری وہ ہے جو مکان اور زمان کے قیود سے آزاد ہے ۔ یہی دوسری زندگی اصلی زندگی ہے ۔

آج کل کی نسلوں کی تمام جسمانی قوتیں گھٹتے گھٹتے اِس درجہ پر آ گئی ہیں کہ ضعف اعضاء کے ساتھ ہی عمر طبیعی بھی بہت کم رہ گئی ہے ۔ اب ہم میں سے مشکل سے ایسے لوگ نکلتے ہیں جو سَو سَوا سَو برس کی زندگی پائیں ۔ بہت سے بہت چلے تو ستّر بہتّر تک پہنچ گئے ۔

اِس تنزّل کے اسباب سے بحث کرنا میرے احاطۂ موضوع سے باہر ہے ۔ اصلی سبب ضعف ایمان ہو یا وراثت کی قانون شکنی ہو یا آئین فطرت کا نتیجہ ہو اِن سب سے قطع نظر ہم اپنی آنکھوں سے آئے دن دیکھتے ہیں کہ پُرانی ہڈیوں کا دم خم ۔ بوڑھے جسموں کی قوتیں پشت بہ پُشت گھٹتی ہی جاتی ہیں ۔ ہمیں اِس سے غرض نہیں کہ ہندوستان کی غربت اور غلّہ کی گرانی اِس کا سبب ہے یا اسلام سے بے خبری اور مضر اشغال کی کثرت اس کی خاص وجہ ہے بہر طور یہ مسلم ہے کہ بقول جناب دستور صاحب ایم ۔ اے پروفیسر زبان انگریزی

الہ آباد یونیورسٹی اگر کسی باکمال اور نکتہ سنج مصور سے کہا جاے کہ ماضی وحال و مستقبل عالم کے تین مختصر مگر جامع مرقعے کھینچ دو، اور ہر حالت کے لئے کسی عضو انسانی کی ترجمانی سے مدد لو تو ماضی کی تصویر میں صرف دو نہایت مضبوط کشرتی ہاتھ دکھائے جائیں گے۔ حال کے لئے ایک بہت بڑا سا دل اور مستقبل کے لئے ایک بہت بڑا سر کھینچ لیا جاے گا۔ انھیں تینوں تصویروں سے ازمنہ ثلاثہ کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے گی۔

آپ کو اکبر ایسے بلیغ اور بلند مرتبت ہستی کے حیات و کلام کی سیر کرنی ہے لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے حرف حرف پر غور کرنے کی عادت ڈالیئے اور تمام اشارات کو سمجھکر لطف اُٹھائیے۔

بظاہر میری عبارت میں اکثر جگہ معترضہ اور دور از کار جملے نظر آئیں گے مگر ایک پورا مفہوم جس وقت مکمل طور پر ضبط تحریر میں آجائے گا اُس وقت تمام اجزاے ترکیبی اپنی اپنی پوری شان سے بصیرت فروز ہوں گے۔

اِس انتشار ظاہری اور اجتماع باطنی کی بالکل وہی کیفیت ہے جیسے ایک مشاق مصور تصویر کے مختلف ٹکڑوں میں مختلف اعضاے انسانی کو اس طور پر ترتیب دے کہ ہاتھ کے ایک اشارے سے جیتا جاگتا انسان نظر آئے اور دوسرے اشارے سے صرف چند عضو جسمانی تتر بتر دکھائی دیں۔

اس اسلوب کا مقصد صرف یہی ہے کہ پڑھنے والے اپنے قواے ذہنیہ سے بھی مدد لیں ورنہ اکبر ایسے نکتہ سنج سے پورے طور پر محظوظ و مستفید نہیں ہو سکتے۔

میری یہ کتاب۔ یہ تو نہیں کہتا کہ ادب اُردو کے اور صحائف سے بالاتر ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اگر آپ گاؤ تکئے سے لگے ہوئے پیچوان سے شغل فرماتے ہوئے چاہیں کہ اِس کے صفحات سے لطف اندوز و بصیرت اندوز ہوں تو ناکامی یقینی ہے۔

ہاں میں آپ کو انسان کی دوہری زندگی کا امتیاز دکھا رہا تھا غالباً اب ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ اعداد وسال حیات اصلی کا معیار نہیں ہیں۔ حیات اصلی کیا ہے کب سے شروع ہوتی ہے کب سے اِس کی ابتدا ہوتی ہے۔ کب تک رہتی ہے۔ یہ بحثیں موقع موقع سے ہوتی رہیں گی۔

پہلی اور ظاہری زندگی کے لیئے اسلام کے ایک زبردست فلسفی فقیہ عالم اور حکیم نے کہا ہے کا اگر آپ کسی شخص کی عمر ساٹھ کی فرض کریں تو سطحی نقطۂ نگاہ سے بھی تیس ۳۰ سال یعنی زندگی کا ادھا حصّہ راتوں کے بے خبر سونے میں گذر جاتا ہے۔ باقی تیس میں سے بچپن کے پانچ برس عدم شعور اور آخر کے کچھ روز بڑھاپے کی بے گنتی مصیبتوںمیں ختم ہو جاتے ہیں اس طور پر ساٹھ برس والا مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ دس بارہ برس زندہ رہا۔

اب اس دس بارہ برس میں بھی صرف وہی لمحات اصلی زندگی کے جوہر کہے جا سکتے ہیں جو حکماء عالم کے نزدیک عمدہ افکار و افعال، تبلیغ و رہبری، خدمت و عبادت، یا انکشاف و ایجاد میں صرف ہوئے ہیں۔

اب ذرا حساب تو لگائیے وہ ساٹھ برس والا کے گھنٹہ زندہ رہا۔ کیا آپ کو انگلستان کے شیریں کلام شاعر ٹینیسن (Tennyson) کا یہ مصرعہ یاد نہیں۔

"As though to breathe were life" گویا سانس لینا ہی زندگی ہے؟

اس استفہام انکاریہ کا نتیجہ ظاہر ہے اسی طور پر مشرق کے زبردست فلسفی سعدی کا یہ مصرعہ لوح دماغ پر نقش کر لینے کے قابل ہے۔

"تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است"

یہی وجہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جو صدہا برس زندہ رہے وہ ایسے بھلا دئے گئے کہ آج اُن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا مرنے کے بعد کا ذکر تو درکنار وہ لوگ جو صرف اکہری ظاہری زندگی بسر کرتے ہیں اکثر اپنی حیات ہی میں گمنامی کے سمندر میں کھو جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف فلاطون، سقراط، شیکسپیر، ملٹن، حافظ، عمر خیام، انیس و دبیر، چند روزہ زندگی بسر کر کے ظاہراً اُٹھ گئے مگر ہمارے دلوں میں اب تک زندہ ہیں اور اپنی قابلیت و اثر کے بقدر موزوں زمانے تک زندہ رہیں گے۔

اکبر بھی عالم کے ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں جن کی باطنی اور اصلی زندگی کا کوئی احصا نہیں ہو سکتا۔

وہ فطرت کے پیامی تھے ۔ لہذا اِن کی حیات کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ ابتدا اِس لئے نہیں ہے کہ تواریخ وسیر و تذکرہ جات کی ورق گردانی اور ازمنۂ اسلاف کی سیر فرمایئے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں فطرت کا ایک نہ ایک پیامی موجود نہ رہا ہو۔

فطرت سے زیادہ عالم کا نباض کون ہوسکتا ہے؟ جب دُنیا کو منطق۔ فلسفہ اور کلام کی ضرورت ہوئی تو خطۂ یونان سے سقراط افلاطوں اور ارسطاطالیس نے ظہور کیا جب صبر و مسیحائی کی حاجت ہوئی تو حضرت عیسیٰ تشریف لائے۔ اسی طرح مختلف زمانوں میں ماحولِ فضا و احتیاج کی مناسبت سے اوتار، رسول، اصحاب، رشی، حکیم، بادشاہ، شاعر، صناع اور موجد ہوتے آئے ہیں۔

ارتقاء کا تقاضہ یہی ہے کہ تہذیب یافتہ جذبات اور ترقی یافتہ حیات کے تناسب سے طریقۂ پیغام رسانی استعمال کیا جائے۔ لہذا مختلف ادوار عالم میں مختلف طرق پیام رسانی کام میں لائے گئے۔ کبھی قوائے روحانی سے مدد لی گئی۔ کبھی فلسفہ و منطق کے سورج نے جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور کر دیا۔ کبھی ہلالی تلوار کی آب و تاب سے نخوت و غرور کے کاسے چور چور ہو گئے۔

اکبر بھی اپنے زمانہ کے مصلح ہیں۔ ان کے وجود کی ظاہری ابتدا اور انتہا کی کوئی حیثیت نہیں ہے وہ بھی مصلحین عالم کی زنجیر کی ایک کڑی ہیں۔ اسی لئے اِن کی حیات کی ابتدا اُس وقت سے ہے جب سے فطرت کو عالم میں اپنا پیامی بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ریاضیات اور دیگر قیاسات کے حدود ہیں۔ طوفانِ نوح کی داستانیں کس کی آویزۂ گوش نہیں بن چکی ہیں۔ مصر کے آثار قدیمہ کے انکشافات سے تعلیم یافتہ اور اخبار خواں طبقے خوب واقف ہیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ دُنیا کئی بار اپنے معراج کمال تک پہنچی۔ نقش دریا کی طرح مٹی اور پھر نئے سر سے اُبھری۔ لہذا سلسلہ مصلحین کی ابتدا قیود ماہ و سنہ یا حدود و اعداد میں ناممکن ہے۔

کہیں اِس جگہ کسی لفظ پرست حضرت کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ارسطاطالیس اور حضرت عیسیٰ یا اکبر اور افلاطوں کو ایک سمجھتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ مراتب کا خیال اور مدارج کا امتیاز میری نگاہوں میں ہر وقت رہتا ہے۔ مگر کچھ خوبیاں بنی نوع انسان میں بہ حیثیت انسان

مشترک ہیں۔ میرے لئے وجوہ شبہ وہی خوبیاں ہیں۔ مثلاً عقل و فہم و ذکا کے اعتبار سے مذہب و معلومات سے قطع نظر میں ان تمام حضرات متذکرہ صدر میں نہایت معمولی سے فروق پاتا ہوں۔ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں اِس لئے کہتا ہوں کہ سب فطرت کی طرف سے بھیجے ہوئے تھے اور سب بنی نوع انسان کے لئے مصلح و رہبر تھے۔

اسی طرح حیات اکبر کی کوئی حقیقی انتہا نہیں ہے۔ اِن کی قبر کا خاکی نشان دستبرد زمانہ سے برباد ہو جائے مگر ان کی وہ قبر جو ہر سمجھنے والے کے سینہ میں تمام خارجی اثرات سے محفوظ موجود ہے آیندہ نسلوں میں سینہ بہ سینہ پشت بہ پشت منتقل ہوتی جائے گی۔

کیا اکبر مر گئے؟ ہاں عناصر ظاہرہ کی ترتیب خارجی میں فرق ضرور آ گیا۔ مگر بقاے روح میں کس کو کلام ہو سکتا ہے ان کا کلام جو ان کی حیات کا جوہر اور ان کی روح کا لباس ہے زندہ ہے لہذا ظاہراً وہ مر تو گئے مگر مر کر زندہ جاوید ہو گئے۔

اگر انگلستان کے زبردست شاعر اور بے نظیر فلسفی براؤننگ کا نظریہ درست ہے تو حضرت اکبر حیات ظاہر کے اِس درجہ سے گذر گئے جس میں امتحانات کی کشمکش تنازع للبقا کی گرم بازاری اور داد و ستد کی ہماہمی رہتی ہے۔ اب وہ ذات واحد سے قریب تر ہو گئے اور اسی طرح لطیف ترین و نفیس ترین درجات میں تہذیب و نشو کی منزلیں طے کرتے ہوئے آخر کار وصل حقیقی سے سرشار ہو جائیں گے جو جوہر حیات ہے۔

اکبر کسی تعارف کے محتاج نہیں؟ اُردو داں طبقہ خصوصیت کے ساتھ ان سے واقف ہے وہ شاعر تھے نثار تھے مصلح تھے بزرگ تھے مختلف طبقات اِن کے لئے مختلف نظرئے رکھتے ہیں کوئی زبردست سیاسی رکن سمجھتا ہے۔ کسی کے نزدیک ملک و قوم کے مصلح تھے۔ کوئی شاعر محض یا ظریف محض سمجھتا ہے کوئی تمدن و معاشرت کا رہبر خیال کرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اُتنی ہی باتیں ہیں۔ اِس تصنیف کا مقصد اوّلیں یہی ہے کہ اکبر، مکمل اکبر کو مکمل طور پر آپ کے سامنے لایا جائے۔

مکمل اکبر سے میری مراد اکبر بہ حیثیت انسان نہیں ہیں بلکہ اکبر بہ حیثیت مصنف، وہ شاعر اور نثار دونوں تھے۔ میں ان حالات کو جو اکبر کے خانگی معاملات، عزیز داری کے برتاؤ یا ایسے

دیگر مخصوص ذاتی امور سے متعلّق ہیں قطعاً غیر متعلّق سمجھتا ہوں اور ان کے اظہار سے مطلقاً پرہیز کروں گا اکبر مجلسی حیثیت سے کسی سماجی کے لئے دلفریب ہوں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہ میں اکبر کو شہری، یا شوہر یا پدر یا صاحب دول ہونے کی حیثیت سے دکھانا چاہتا ہوں۔ حالات اخلاق اور رفتار مزاج سے بھی صرف وہی منتخب پہلو لئے جائیں گے جن کا اثر کلام اکبر پر یا جن پر کلام اکبر کا کوئی اثر ہوا ہو لہذا "مکمل اکبر" صرف "مکمل مصنف" کا مترادف ہے اور کچھ نہیں۔

اکبر کو جزوی حیثیت سے مختلف گروہ جو جو سمجھتے ہیں اکبر وہ سب تھے اور اُن کے مجموعہ سے بھی زیادہ یعنی فطرت کے پیامی تھے۔ اِن کی تعلیم کسی خاص زمانہ یا خاص طبقہ کے لئے مخصوص رہی ہو محدود نہ تھی وہ تمام عالم کے لئے خلق و راستی، صدق و صفا کے پیام مجسم ہیں اور جاتی دُنیا تک رہیں گے۔

ان کی شہرت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ ہر دلعزیز ہیں روحانی ذوق رکھنے والوں کے لئے اِن کے کلام میں تصوف علوے نفس اور تہذیب باطن کے جواہر موجود ہیں ادبی مذاق والوں کے لئے خوش فکری، بذلہ سنجی، زبان وخیال پر قدرت، حُسن زبان، صنائع لفظی و معنوی سبھی کچھ ہے مجلسیوں کے لئے معاشرت و تمدّن کی پیچیدگیاں سُلجھائی گئی ہیں، سیاست، فلسفہ اور ظرافت پسند طبقوں کے واسطے سیاست کے نازک مسئلے حل کئے گئے ہیں فلسفہ جسم و روح کی موشگافیاں ہوئی ہیں اور ظرافت کے موتی رولے گئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے زبردست سے زبردست دماغوں پر ان کا سکّہ بیٹھا ہوا ہے۔ سر اقبال کا سر عبدالقادر ان کے سامنے سر ارادت جھکاتے ہیں۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ دیانرائن نگم۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو۔ صدر الصدور حضرت شیروانی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مولانا عبدالماجد (مصنّف فلسفہ جذبات)۔ حسن نظامی، حسرت موہانی، ناطق، اعظم حفیظ افسر احسن اور عزیز کے علاوہ اور بہت سے ممتاز حضرات اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے لطف اندوز و مدح سرا ہوتے ہیں۔ میں نے محض چند ناموں پر اکتفا کی ہے ورنہ اگر موصوف کے مداحین کا شمار کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر مرتب ہو جائے۔

مگر اس حد کی ہر دلعزیزی کیوں ہے؟ یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں بورڈ کے امتحانات میں

گراں قدر اخبارات ومجلات میں مختلف مجالس ومحافل میں اِن کے کلام سے لطف وزینت کا اضافہ کیوں کیا جاتا ہے، لوگوں کے دل پران کی بلاواسطہ تعلیم کا اتنا گہرا اثر کیوں ہوتا ہے؟ اِن کے اشعار لوگوں کو ان کے اور معاصرین کے مقابلہ میں بہت زیادہ کیوں یاد رہتے ہیں؟ ان کی تصانیف اور دواوین کی طباعت اور اس کی مانگ روز افزوں کیوں ہے؟ ایک ایک دیوان کی اشاعت وطباعت دس دس بارہ بارہ مرتبہ کیوں ہو چکی ہے؟ آئے دن مختلف انتخاباب کیوں ہوتے رہتے ہیں؟ بعض حصص کلام مثلاً رباعیات یا نظم یا غزلوں کے جداگانہ ایڈیشن کیوں نکلتے رہتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ وہ فطرت کے پیامی اور عالم کے نباض تھے وہ باریک سے باریک بات کو ظریفانہ انداز میں اِس طرح ادا کر جاتے تھے کہ اصلی مفہوم ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا عنصر خوش طبعی، ظرافت اور بذلہ سنجی ہے۔

ظرافت کے لئے ذہن وفہم کے علاوہ، ذکاوت حاضر جوابی، اور حسن بیان کی چاشنی بھی ضروری ہے۔ یہ تمام اجزا اِن کے کلام میں بہ قدر مناسب موجود ہیں۔

جس طرح کڑوی دوائیں شیرینی کی مدد سے مریضوں اور بچوں کو کھلائی پلائی جاتی ہیں اسی طرح اکبر کی نصیحتوں کے گھونٹ مرضا کے گلے کے نیچے ظرافت کی مٹھاس سے غٹاغٹ اُترتے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ دوا کی تلخی محسوس بھی نہیں ہوتی اور تاثیر پوری پوری ہوتی ہے باتیں اتنی گہری اور اس مزے سے کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو برا بھی نہ معلوم ہو۔ مخاطب کے دل پر اثر بھی کر جائے اور عالم کے لئے صحیفہ عبرت بھی بن جائے۔

بقائے کلام کے دلائل

پہلی دلیل خارجی ہے یعنی ذات شاعر سے جدا ذات مخاطب سے متعلق ہے۔

اکبر کا کلام باقی رہے گا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ جوہر ظرافت طبع انسانی کا ایک لطیف عنصر ہے۔ ماہرین نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ تبسم اور ہنسی فطرت انسانی کے خاصّے ہیں پھر وہ کلام جو تبسم یا ہنسی پیدا کرے یا ان قوا کا معاون یا محرک ہو سکے فانی کیسے ہو سکتا ہے دوسری دلیل داخلی حیثیت رکھتی ہے۔ اکبر کے کلام میں صدق وراستی معاشرت وتمدن

فلسفہ وسیاست، تصوف و تغزل کے جو جواہر پارے موجود ہیں اس کا اثر عالمگیر ہے اور ان کی ضرورت تمام دُنیا کو ہر زمانہ میں پڑتی رہے گی لہذا ان کا کلام باقی رہے گا۔

مطالعہ مصنّف کی اہمیت

بعض مصنّفین ایسے گذرے ہیں جن کا کلام ان کی ذات سے بالکل الگ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے جن کی تصانیف کے مطالعہ کے لئے ہم کو خود مُصنّف کی سوانح حیات اور خارجی انقلابات کے مطالعہ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے مگر چند نفوس ایسے بھی ہیں جن کے کلام کو ہم اِس وقت تک مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے" جب تک ہم ان کی حیات سے بھی پورے پورے واقف نہ ہو جائیں، شکسپیر، ہومر، خسرو، حافظ، ولی اور وجدی اوّل الذکر طبقہ میں داخل ہیں، انیس، آزاد، حالی، شبلی، سرسید، نذیر احمد اور اکبر موخر الذکر گروہ میں شامل ہیں۔ بعض ناقدین اور بعض ادب پرست حضرات تو یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ مکمل حیات کے مطالعہ کے بغیر ہم کسی مصنّف کو مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے بہرکیف مطالعہ تصنیف کے ساتھ مطالعہ مصنف بھی ضروری ہے۔

تحریر حیات

ابھی تک اُردو میں حیات نویسی کا صحیح مذاق پیدا نہیں ہوا بعض تذکرہ نویس محض نام ولدیت اور مولد و مدفن پر قناعت کرتے ہیں بعض حیات لکھنے والے حمد و ثنا کو اپنا اصلی معیار قرار دیتے ہیں اور بعض غیر ضروری حالات کا انبار کر دیا کرتے ہیں۔

حیات لکھنے والوں میں مولانا حالی ایک گراں قدر حیثیت رکھتے ہیں۔ حیات نذیر میں کافی دماغ سوزی سے کام لیا گیا ہے اور منطقی ترتیب کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ کلیات ولی مطبوعہ اورنگ آباد کے مصنف نے بھی بڑی عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے اور حیات نویسی کے اکثر اجزاء کی پوری پوری داد دی ہے پھر بھی اِس کی ضرورت ہے کہ ادب اُردو کے اکثر محسنین کی حیات حکیمانہ انداز سے قلمبند کی جائے۔

داخلی اور خارجی شواہد

حیات کے سب سے بڑے عنصر دو ہیں۔ داخلی اور خارجی شواہد۔ یعنی وہ حالات جو خارجی ذرائع سے جمع کئے جائیں اور وہ شواہد جو خود تصانیف سے اخذ کئے جائیں۔ میں کوشش کروں گا کہ حیات اکبر میں تمام موزوں شواہد خارجیہ و داخلیہ جمع ہو جائیں مگر خارجی شواہد کا پلّہ اس تصنیف یا تالیف میں اسے جو کچھ کیئے بہت ہلکا رہے گا اس واسطے کہ میں اپنا معیار سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں۔

انتخاب سوانح

بعض حضرات مصنّف کے حالات کا یا تو انتخاب ہی نہیں کرتے یا ایسا انتخاب کرتے ہیں جو بالکل غیر ضروری اور غیر متعلق ہوتا ہے۔

مصنّف کی صرف وہ سوانح جمع کئے جانے چاہئیں جن کا اثر اس کی حیات اور کلام پر بالواسطہ یا بلا واسطہ پڑتا ہو، آپ خود دیکھیں گے کہ اس صحیفہ میں صرف وہی حالات جمع کئے گئے ہیں جو خاص اثرات کے حامل ہیں۔

چونکہ میں حیات و کلام اکبر کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا اس لئے دونوں کا بیان بھی دوش بدوش ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حیات اور کلام ایک دوسرے پر اثر کرتے رہتے ہیں اور ایک تصویر کے دو رُخ ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک رُخ تاریک ہے اور دوسرا روشن۔ بلکہ جس طرح ہم کسی شے کو فاعلی یا انفعالی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں اسی طرح حیات و کلام محض دو نقطۂ خیالی کا نتیجہ ہیں ورنہ ملٹن کے بقول شاعر مجسم شعر ہوتا ہے اور حیات و کلام دونوں ایک دوسرے کے عکس ہوا کرتے ہیں۔

موصوف کے خیالات خود اپنی حیات کے متعلق

اِس وقت تک کلیات اکبر کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ حصّہ اوّل طبع دوئم میں موصوف نے دیباچہ کے سلسلے میں اپنے کچھ حالات خود لکھے ہیں لوگوں کے شوق کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ

لائف اور تصویر بھی چاہتے ہیں۔ ان کی بعض تصویریں بھی ان کی وفات کے بعد ھندوستان کے چند معزز رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ لائف ابھی مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی سُنا ہے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب اور مولانا عبدالماجد صاحب مصنّف فلسفہ جذبات بھی حیات لکھنے کی فکر میں ہیں۔ خدا دونوں کو مبارک اور کامیاب کرے۔

موصوف کو اپنی حیات کا لکھا جانا پسند تھا یا نہیں؟ اس کا جواب قول و عمل کے موازنہ سے بڑی مشکل سے مل سکتا ہے۔ جب حضرت اکبر اس بارے میں دوسروں کے شوق کا تذکرہ فرماتے ہیں تو لفظ لفظ سے بے نیازی اور حرف حرف سے انکساری ٹپکتی ہے اسلوب بیان اور لہجۂ تحریر سے بے تعلّقی ظاہر ہوتی ہے مگر ان کے چھیتے بیٹے عشرت کا ایک اشتہار جو کسی ایڈیشن کے سرورق کے آخری صفحات پر ہے پکارے گلے کہتا ہے کہ خود جناب مصنف اپنے حالات جمع کر رہے ہیں میں نے بڑی کوشش کی کہ مصنّف کے خود نوشتہ حالات عشرت صاحب کے کتب خانہ سے یا عشرت منزل سے حاصل ہو جائیں مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی خدا جانے ان کی حفاظت میں کیا راز پنہاں ہے۔

بہر کیف اکبر صاحب کو اپنی حیات کا لکھا جانا نا پسند نہ تھا۔ لوگوں کے اصرار سے سہی۔ رنگ زمانہ کے تقاضہ سے سہی آیندہ نسلوں کی بہبودی کے خیال سے سہی موصوف اس امر پر نہ صرف راضی ہو گئے تھے کہ ان کی حیات لکھی جائے بلکہ یہاں تک آمادہ تھے کہ اپنے حالات خود ہی جمع فرمائیں۔

اب میں ذیل میں مرحوم کے خطوط سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے بصیرت فروزی سے قطع نظر حیات کے متعلق ان کے اپنے خیالات کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

خطوط بنام منشی شرف الدین احمد خاں صاحب مصنّف "خیالات"، مؤلف بوعلی سینا وغیرہ (رقعات اکبر صفحہ ۹۶ و ۹۷)

"ہر گاہ آپ مدت سے فکر میں ہیں کہ میری نسبت کچھ لکھیں تو ایک گونہ حق ہو گیا ہے لیکن اشعار مطبوعہ کو جانے دیجئے پبلک زیادہ تر مشتاق غیر مطبوعہ اشعار کی ہے۔ اشعار مطبوعہ کا ضبط و حصر آپ کو دشوار ہے۔ اکثر پر ریمارک کرنا ہے یہ سب کام میری ہدایت و نگرانی میں

ہو سکتے ہیں ...... آپ مجموعہ نظم بھیجدیجیئے - اغلاط کی صحت ہو جائے گی - لائف میں کام آئے گا
نواب محسن الملک، مولوی شبلی، اخبار زمانہ، ایڈیٹر مخزن، البشیر کے ایک دوست اور دیگر حضرات نے تحریکیں کیں اور میں خاموش رہا...... اکثر بزرگوں نے از انجملہ البشیر اور حاجی اسمٰعیل خاں صاحب نے مجھ سے استدعا کی کہ میں اپنے حالات سے ان کو مطلع کروں اور وہ میری سوانحعمری لکھیں میں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ اپنے مُنہ سے اپنی تعریف نہیں ہو سکتی اور یہ ہے بھی ہیچ۔

بھائی شرف الدین! میری لائف درحقیقت بہت عجیب اور رنگارنگ ہے اور اس سے بہت سے سبق حاصل ہو سکتے ہیں آپ لکھنے پر اصرار کر رہے ہیں تو اختیار ہے سلسلہ میں کچھ اشعار بھی آجائیں گے - آپ کو اس کام کے لئے ہفتہ دو ہفتہ یہاں رہنا چاہیئے تاکہ مواد مل سکے۔

خطوط بنام آنریبل سر شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا سابق وزیر تعلیمات وسابق ایڈیٹر مخزن
(رقعات اکبر صفحہ ۱۳۲)

۲۰/۱ - "بموجب ارشاد سابق کچھ نوٹ لکھ لئے ہیں کچھ باقی ہیں لیکن روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ سب فضول و ہیچ ہے - سمجھ کہتی ہے کہ تمہارے لئے فضول و ہیچ ہوجینے والوں کے لئے کیوں ہیچ ہیں!!

۱۲ر جنوری ۱۹۲۰ء "میں نے قلم برداشتہ حالات لکھکر بھیجدئے ہیں - بہت کچھ ہے کہاں تک لکھوں - میرے اصول اور طریق عمل تو نظموں کے انتخاب سے ظاہر ہو سکتے ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے داخلی شواہد پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ خطوط واشعار سے حیات کے زیادہ پہلوؤں پر زیادہ روشنی ڈالوں شاعر کا دماغ بھی جوہر حیات ہوتا ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ اکبر کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ذاتی لگاؤ اور رنگ طبیعت Personal Touch سے مالامال ہے۔

۳۱ر مارچ ۱۹۲۱ء "حمیدیہ بک ایجنسی سوہدرہ ضلع گجرانوالہ کے منیجر صاحب لائف کے لئے جان کھائے جاتے ہیں"۔

خط بنام حضرت عزیز لکھنوی (صفحہ ۱۰۶ مکاتیب اکبر)
۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء "خیال وسعت تحقیق تا کجا اکبر ٭ کہ ہر نگاہ ہے محتاج اک فسانے کی"

دہلی ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۹ء "خطیب میں نامہ نگار نے بالکل ناقص وناتمام مضامین کو غتربود کر دیا۔ نہ میں نے کوئی اسپیچ دی نہ مضمون لکھا تھا۔ مختلف اوقات کی گپ کو اس لڑکے نے اپنے الفاظ میں مفہوم کے موافق لکھ دیا میں بے خبر تھا۔ ابھی خطیب کو دیکھا تو ایک مختصر تحریر تردید میں لکھی۔"

اقتباسات بالاسے، ذیل کے نکات اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) وہ اپنی اصلی لائف اپنے اشعار میں سمجھتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے۔

(۲) وہ شہرت ونمود کے خیال سے نہیں بلکہ آیندہ نسلوں کے سبق آموز ہونے کے خیال سے اپنے سوانح حیات کی قدر کرتے تھے۔

(۳) غیر مربوط اور "غلط سلط" واقعات کی نسبت اپنی طرف ہرگز نہیں چاہتے تھے امید ہے کہ سوانح نویس ان نکات کو ملحوظ رکھیں گے۔

اب میں اسی سلسلہ میں مرحوم کے دو شعر جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں درج کرکے اس بحث کو ختم کرتا ہوں کہ خود موصوف کے خیالات حیات نویسی اور سوانح نگاری کے متعلق کیا تھے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

لکھو لائف میری ایام جوانی کے سوا   سب بتادوں گا تمھیں افتدودانی کے سوا

ایام جوانی سے کچھ ایسے شرمناک افعال یا ناگفتہ بہ حالات متعلق نہیں ہیں جن کو موصوف چھپانا چاہتے ہوں بلکہ میری نگاہ میں اس شعر سے کئی پہلو نکلتے ہیں۔

(۱) میرے ایام جوانی کے واقعات کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتے وہ ایسے ہیں جو قریب قریب ہر شخص پر گذرتے رہتے ہیں۔

(۲) "افتدودانی" کی بلاغت بتاتی ہے کہ بعض امور بیان کئے جاتے ہیں مگر بعض باتیں مثلاً تقاضائے شباب کیف بے خودی وغیرہ محسوسات لطیفہ پر منحصر ہیں۔ افتدودانی سے صاف یہی پہلو نکلتا ہے کہ جب تم پر پڑے گی خود ہی جان جاؤگے اگر ہم پہلے سے بتادیں گے تو "دانی"، کے لطف میں کمی آجائے گی اور تجربہ ذاتی کے بغیر حقیقی کیفیت کے احساس کی صلاحیت بھی تم میں پیدا نہ ہوگی۔

(۳) لائف میں وہ حالات ہونے چاہئیں جو سبق آموز ہوں یا مخصوص ہوں اس حصۂ عمر میں

عموماً کشتی حیات طوفان جذبات میں رہتی ہے۔ دماغی ارتقاء اور ذہن و ذکا کی نشو و نما پورے طور پر ایام جوانی کے گذر جانے کے بعد ہوا کرتی ہے۔

(۴) ایام جوانی میں افتد و دانی کی سرخی سے مرحوم نے ایک نہایت پرائیوٹ مثنوی لکھی تھی ان کے بھائی اکبر حسن صاحب اِس زمانہ میں گورنمنٹ اسکول الٰہ آباد میں جواب گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج ہے پڑھا کرتے تھے۔ یہ قصّہ آج سے چالیس بیالیس برس پہلے کا ہے۔ اکبر حسن صاحب کے ایک ہم سبق دوست موصوف کے ہمنام اکبر حسین صاحب تھے انھوں نے وہ مثنوی دیکھی۔ نہایت ذہین تھے۔ پورے اشعار حفظ کر لئے۔ ایک عرصہ کے بعد مرحوم شاعر کو خیال آیا کہ لوگ میرے لفظ لفظ کو خواہ وہ کسی عالم میں زبان و قلم سے نکل گیا ہو مشتہر کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے ہمنام کو بلا کر پوچھا کہ بھائی شاید اکبر حسن نے تم کو افتد و دانی والی مثنوی دی ہو وہ نہایت درجہ پرائیوٹ ہے اسے واپس کر دو مخاطب نے عرض کی کہ حضور عالی اب وہ علم سفینہ نہیں علم سینہ ہے کاغذ پر نہیں میرے دماغ میں محفوظ ہے۔ ہاتھوں نے مادی کاغذ کے پرزے کر کے برباد کر دیا مگر روح نے اس کو محفوظ کر لیا۔

مرحوم محظوظ و متبسم ہوئے کہنے لگے "میں اپنا ریمارک واپس لیتا ہوں"

یہ حالات مجھے خود اکبر حسین صاحب کے ہمنام سے معلوم ہوئے اب ان کا سن پچاس سے زائد ہے سب رجسٹرار تھے پنشن لے کر رانی منڈی الٰہ آباد میں رہتے ہیں۔ عربی فارسی کی کتابیں نکل چکی ہیں ان کو مرحوم کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ اکبر کے پجاریوں میں ہیں۔ کلیات کے حافظ ہیں۔ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے غیر مطبوعہ کلام بھی لکھوایا۔ کچھ حالات بھی بتائے۔

میں نے افتد و دانی والی مثنوی پوری پوری سُنی ہے اس کے کچھ اشعار نقل کر دیتا مگر دو وجہوں سے نہیں کرتا ایک تو یہ کہ خود مرحوم نے اس کے اخفاء میں کوشش بلیغ کی تھی۔ حالانکہ مومن دہلوی کو لے لیجئے۔ نساخ کا تذکرۂ سخن شعرا اُٹھا لیجئے ایک پوری مثنوی راجہ اندر کے اکھاڑے کی ایک پری کی شان میں ہے۔

دوسری اور اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ مثنوی ابتدائے مشق کی ہے اس میں کوئی خاص حُسن نہیں ہے

صرف سادگی ہے اور روانی وہ بھی ہر شعر میں نہیں ہے۔ نہایت مختصر ہے خاص مواقع بھی نظر انداز کردئے گئے ہیں۔

(کلام اکبر الہ آبادی صفحہ ۲) "حکیم محمد شمس الحسن مرحوم نے دوران حیات میں آرزو کی کہ لسان العصر کے حالات میں تازہ خیالات درج صفحات ہوں" لیکن مرحوم نے صرف ایک شعر لکھ کر بھیجدیا جو پوری لائف پر بھاری ہے۔

ہیں معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں　　گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

اس شعر کی تطبیق خود مرحوم پر بھی ضرور ہوتی ہے مگر ایک خاص پہلو سے اور ایک خاص حد تک اگر آپ اعتدال پسندی کو کام میں لاکر ناگفتنی کے معنی سوقیانہ اور شرمناک کے نہ لیں بلکہ اس لفظ سے صرف غیر ضروری اور غیر متعلق سمجھیں تو یہ شعر مرحوم کی زندگی کا خلاصہ ہے اس لئے کہ مملکت شعر میں انہوں نے جو سکے چلائے ہیں جو ایجادات اختراعات اور اکتشافات کئے ہیں اِن سے قطع نظر خود نفس سوانح میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

اِس شعر میں ذاتی عنصر (Personal Touch) ضرور ہے اور ممکن ہے کہ مرحوم نے یہ شعر یادِ شباب کی تحریک سے لکھا ہو مگر استقرا اتنا عالمگیر و پاکیزہ ہے کہ لوگوں کو رنگ زمانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے اور سوانح نگار کو بھی ہدایت مل جاتی ہے کہ غیر ضروری حالات کے بیان سے پرہیز کرے۔ آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ اِس زمانہ کے معزز آدمیوں میں کتنے نفوس واقعی اس قابل ہیں جن کی "گفتنی لائف" "درج گزٹ" سے زائد ہو اور کتنے سوانح نگار حضرات ایسے ہیں جو اس نکتہ کی صحیح قدر کرتے ہیں۔

کلیات اشاعت اور اس کی ترتیب

کلیات اکبر کے تین حصص اب تک شائع ہو چکے ہیں اور ہر حصّہ کئی کئی بار چھپ چکا ہے ملک میں اُردو کتابوں کی مانگ حوصلہ شکن ہے اور اُردو مطبوعات کی داد و ستد بھی ہمت افزا نہیں ہے مگر اکبر کے کلام میں عالمگیری بقا اور ظرافت کی چاشنی اس حد تک ہے کہ ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے ہیں اور ختم ہوتے جاتے ہیں بعض صائب الرائے حضرات کو کلیات کے ہر سہ حصص کی

ترتیب کے متعلق شکایت ہے کہ موجودہ نظم کلیات نہ تو منطقی حیثیت سے کوئی وقعت رکھتا ہے نہ ردیف وار ہے نہ موضوع مبحث اور عنوان کے اعتبار سے مکمل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حصہ چہارم کی اشاعت کے بعد سید عشرت حسین صاحب اِس طرف پوری توجہ فرمائیں گے۔ خود مصنف کے زمانہ حیات میں لوگوں نے دیوان غالب کی طرح انتخاب کی صلاح دی تھی اور مرحوم کے اِن خطوط سے جو عبدالماجد صاحب عزیز صاحب اور حسن نظامی صاحب کے نام میں صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اِس تجویز کو پسند فرمایا تھا کاش اِن کی زندگی ہی میں لائف مکمل ہوجاتی انتخاب کلام ہوجاتا اور ترتیب کلیات ہوجاتی اب ان کی وفات کے بعد حیات نویس کی ذمہ داریاں مقابلتاً نہایت کثیر اور نازک ہوگئی ہیں۔ بہت سے لطیف اشارات تھے جو صرف مرحوم کے ذہن میں محفوظ تھے۔ یا جن سے دو ایک نفوس اور واقف تھے اب اِن میں سے کوئی نہیں ہے خود ایک جگہ سے زیادہ مرحوم نے لوگوں کو لکھا ہے کہ بہت سے اشعار پر ریمارک کرنا ہے۔ نوٹ لکھنا ہے ۔

مشکلات

اکبر مرحوم کی لائف لکھنے میں اور کلام کی تنقید کرنے میں میری ذاتی کمی صلاحیت اور کمی قابلیت سے قطع نظر اور دقتیں جو مجھے اُٹھانی پڑی ہیں اُن سے وہ لوگ خوب واقف ہیں جو اس طرح کا کام کر چکے ہیں

اِس جگہ صرف چند مشکلات کا ذکر اِس نظر سے کئے دیتا ہوں کہ ناظرین کی ترچھی نگاہوں اور ناقدین کی دلدوز نظروں میں لطف وکرم کی چاشنی بھی شامل رہے۔

(۱) اشعار کو Classify کرنے یعنی جداگانہ عنوان کے ماتحت تقسیم کرنے میں دانتوں پسینہ آگیا ہے۔ تینوں دیوان کئی کئی بار پڑھنے پڑے اور ہر شعر کے مختلف پہلوؤں پر بہت دیر دیر تک غور کرنا پڑا ہے۔

(۲) حالات وواقعات کی فراہمی کے لئے تمام ممکن مواد کا لفظ لفظ پڑھنے کے علاوہ بہت سے حضرات سے ملنا پڑا ہے اور گھنٹوں کی گفتگو کے بعد بعض حالات کا انتخاب اس کی توضیح

تصحیح اور تصدیق کرنی پڑی ہے۔

(۳) نثر کی کتابیں جن کے حالات آیندہ صفحات میں ہیں بڑی دشواری سے دستیاب ہوئے ہیں۔

(۴) انتخاب اشعار بھی بہ ظاہر دشوار نہ سہی مگر اکبر ایسے ہمہ داں شاعر کے کلام کے انتخاب میں جو دقتیں ہوئی ہیں اِس کا اندازہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خود انتخاب کرنا چاہیں اور اصول و قوانین مقرر کر کے انتخاب کریں ایک معمولی سی دقت یہ ہے کہ ہر شعر سے بہت سے پہلو نکلتے ہیں سب سے غالب پہلو کون ہے؟ اس کی چھان بنان بھی آسان نہیں ہے۔

(۵) خود میری مصروفیت و علالت نے دوران کار میں بہت سی ناگزیر رکاوٹیں ڈالی ہیں۔

(۶) مجھے امید تھی کہ اگر عشرت صاحب (جیسا انھوں نے اپنے پہلے خط میں وعدہ کیا تھا) اپنی امکانی مدد مجھے دیتے تو میری مشکلات کا پلہ ایک بڑی حد تک ہلکا ہو جاتا مگر میں اب بھی شکوہ سنج نہیں شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ہمت افزائی کی اجازت دی اور مسودہ کے دیکھنے میں جو مدد مجھے دی وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ پنچ کے مضامین غیر مطبوعہ کلام کے اجزا اور خود نوشتہ حالات کے نہ ملنے سے ایک گونہ کمی ضرور رہ گئی ہے مگر خیر دیدہ باید شد کبھی نہ کبھی یہ جواہر بھی اس صحیفہ میں داخل ہو کر میرے اوراق کو مکمل کر ہی دیں گے۔

شکریہ

اسی سلسلہ میں میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کر دینا چاہتا ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی طور پر میری ہمت افزائی کی ہے اور مجھے مدد دی ہے۔

(۱) سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر ہردوئی۔ ان کے احسانات کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے۔

(۲) سید ضامن علی صاحب ایم۔ اے لکچرر اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی:۔ موصوف نے میرا پہلا لائحہ عمل دیکھ کر پسند کیا اور بعض خاص نکات وقتاً فوقتاً بتاتے رہے۔

(۳) خاں صاحب سید زاہد حسین صاحب اسسٹنٹ سرجن۔ مرحوم کے حقیقی بھانجے جنھوں نے بہت سے حالات و لطائف بتائے۔

(۴) جناب سید اکبر حسین صاحب ریٹائرڈ سب رجسٹرار جن سے "افند و دانی" کے مفصل حالات معلوم ہوئے۔ کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی ملا۔

(۵) جناب سید محمد متین صاحب وکیل ہائی کورٹ جن سے اکبر مرحوم کے اُستاد وحید صاحب کے حالات اور بعض قابل قدر واقعات دستیاب ہوئے۔

(۶) جناب سید اسرار احمد صاحب فاضل ادب و دینیات جنھوں نے مرحوم کی نثر کی بعض کتابیں عطا کیں۔

جن کتب اور مضامین سے مدد لی گئی ہے ان کے مصنّفین اور مؤلّفین کا شکریہ ادا نہ کرنا بھی ادبی حق تلفی ہے

(۱) رسائل اکبر الہ آباد۔

(۲) تاریخ زبان اُردو بزبان انگریزی مصنّفۂ بابو رام سکسینہ۔

(۳) "اکبر کی شاعری کا آخری دور" دو قسطوں میں عبدالماجد صاحب (مصنف فلسفہ جذبات)

(۴) رسالہ نگار اپریل ۲۶ء۔

(۵) سخن شعر انساخ

(۶) کلام اکبر الہ آبادی حضرت شفق عماد پوری۔

(۷) خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی حصۂ اوّل۔

(۸) مکاتیب اکبر بنام عبدالماجد دریابادی

(۹) مرقعات اکبر مرتبہ نصیر ہمایوں۔

(۱۰) اسلام کی حالت آیندہ۔

(۱۱) مضامین متعلقہ ہند۔

(۱۲) مکاتیب اکبر بنام عزیز لکھنوی مرتبہ محبوب علی صاحب۔



ادوارِ حیات و کلام

یہ بالکل صحیح ہے کہ لسان العصر اکبر کے کلام میں کیا معنی، دنیا کے ہر زمانہ کے مصنفین وشعرا کے کلام میں تنزل وارتقاء کے مختلف درجات پائے جاتے ہیں۔ ابتدائی کلام کی خصوصیات شباب کے کلام سے اور شباب کے کلام کی امتیازی حیثیات کلامِ شیب سے جدا ہوتی ہیں۔

اکبر کے یہاں بھی تینوں درجوں کے کلام پائے جاتے ہیں بات یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا ہر دور (طفلی۔ شباب اور شیب) اپنے ذہنی ارتقاء، حسیات وجذبات کے جوش و متانت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ اِس لئے میں نے بھی تین دور قائم کئے ہیں۔

پہلا دور "صبح" ہے اس کی ابتدا ابتدائے عمر و آغاز کلام سے ہوتی ہے اور انتہا ۱۸۷۹ء تک ہے

دوسرا دور "دوپہر" ہے اِس کی ابتدا ۱۸۸۰ء سے ہوتی ہے اور انتہا ۱۹۰۳ء تک ہے۔

تیسرا دور "شام" ہے اِس کی ابتدا ۱۹۰۴ء سے ہوتی ہے اور انتہا حضرت اکبر کے وفات سے ہمکنار ہے یعنی ۱۹۲۱ء تک ہے۔

خصوصیات کا پتہ ادوار کے مطالعہ سے ہوگا۔

اِن ادوار کے قائم کرنے میں مجھے سب سے بڑی دقت اِس لئے محسوس ہوئی کہ کلیاتِ اکبر کی ترتیب عجیب طور پر ہوئی ہے۔ آپ کو موجودہ حالت میں مرحوم کے کلام سے ارتقائے ذہنی کا پتا لگا لینا اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہے اس لئے کہ نظم کلیات کا اندازِ ترتیب ابتدا و انتہا سے بے نیاز ہے یہ نہیں کہ ابتدا میں ابتدا کا کلام ہو یا کلام کی تقسیم ادوارِ حیات یا درجاتِ ارتقاء کے ماتحت کی گئی ہو۔

اِن کی تصانیف نثر (جن کا مجمل بیان دورِ دوئم میں ہوگا) کی طرزِ تحریر اور اعداد سنین سے اور خطوط و کلام کے غائر مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں ادوارِ حیات اسی نتیجہ کے حاصل ہیں۔ یہ ادوار آئین فطرت اور قوانین طبع انسانی کے مخالف نہیں موافق ہیں۔ انسان بچّہ سے جوان ہوتا ہے۔ جوان سے بوڑھا ہوتا ہے۔ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی مصنف فلسفہ جذبات

نے بھی شاعری کا آخری دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک رکھا ہے مگر معلوم نہیں اِن کے ذہن میں اور ادوار کب سے کب تک کے ہیں۔

میں نے اِن ادوار کے لئے صبح - دوپہر اور شام کی سُرخیاں اِس لئے پسند کی ہیں کہ صبح بنارس اور شام اودھ اپنی نظر نوازیوں کے اعتبار سے کشمیر جنّت نظیر کی دوپہر سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو فطرتیں شوخی جوش اور زور بیان پر دلدادہ ہیں ان کے لئے "صبح" صبح دلکشا ہے۔ جو بیخودی شباب سرمستی اور بے خبری چاہتے ہیں انھیں "دوپہر" کی سیر میں خاص کیفیت حاصل ہوگی اور جو متانت سنجیدگی، تحقیق فلسفہ اور تصوف کے وارفتہ ہیں ان کے لئے شفق شام کی دلچسپیاں جاذب نگاہ ہوں گی۔

میں بنفس خود کسی خاص دور کو ترجیح نہیں دیتا اس لئے کہ میرے نزدیک حیات وکلام اکبر میں دو خاص باتیں ہیں ایک تو فردیت ہے Unity اور دوسرے سلسلہ Continuity ہے۔ فردیت کا لفظ میں نے اس مجبوری سے پسند کیا ہے کہ Unity کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی جامع لفظ نہیں مل سکا۔ فردیت سے مراد یہ ہے کہ جیسے انسان حیات کے ہر دور میں انسان رہتا ہے ویسے ہی اکبر کا کلام ہر دور میں کلام اکبر ہی رہا ہے۔ خفیف سی تبدیلیاں تقاضاے ارتقاء کی بدولت ظاہر ہوتی گئی ہیں لیکن جو ہر کلام جو زبان سے زیادہ خیالات سے تعلق رکھتا ہے اِس کی شان میں فرق نہیں آیا اکبر ہر دور اور ہر رنگ میں وہی رہے ہیں جو اِن کو ہونا چاہئے تھا۔ سلسلہ بھی غالباً پورے طور پر اِس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جو Continuity میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوانین فطرت کے ماتحت جس طرح ایک چھوٹے سے بیج سے پودا، پودے سے درخت اور پھر پھول پھل پتوں والا درخت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حیات وکلام اکبر میں بھی ظاہری نشوونما آخری سانس تک ہوا کی مگر باطناً کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔

ترتیب کلام کی نادرستی اور غیر ذمہ دارانہ حیات نویسی کی برکتوں سے بابو رام صاحب سکسینہ مؤلف تاریخ ادب اُردو (بزبان انگریزی) کو بھی اکبر کے حالات جمع کرنے اور لکھنے میں بہت سے مغالطے ہوگئے ہیں جن کا ذکر موقعہ موقعہ سے آتا رہے گا۔ افسوس ہے کہ آپ کے حالات نویسوں اور تنقید کرنے والوں نے بہت رواروی سے کام لیا ہے۔ ابھی کل ہی شام کو

شعرالہند کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ تعجب ہے کہ فاضل مصنّف نے محض ظرافت اور اسالیب کے تحت اکبر کے متعلق چند معمولی باتیں لکھ کر اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کرلی ہے حالانکہ مرحوم کے تعلقات بھی ان سے بہت خلصے تھے جس کا اعتراف مصنّف صاحب کو ہے ظاہر ہے کہ مرحوم کے بہت سے حالات اُن کو معلوم ہوں گے اور پھر وہ صاحب نظر بھی ہیں۔ میں نے بڑی امیدوں سے شعرالہند حصّۂ اوّل کے آخری باب "دورِ آخر" کی سیر کرنی چاہئے تھی مگر نگاہیں نہایت مایوسی کے ساتھ واپس آئیں اور انگلیوں نے بلاقصد صفحات کتاب کو بند کردیا میں یہ نہیں کہتا کہ حسرت موہانی حالی جوہر یا اور دوسرے شعرا کو زیادہ صفحات نہ دئے جاتے مگر اکبر غالباً اس سلوک کے مستحق نہ تھے جو ان کے ساتھ کیا گیا۔

خیر یہ تو آمد سخن کی بات تھی آیئے ذرا تاریخ ادب اُردو کے صفحات ۲۲۸ سے ۲۳۰ تک کی سیر کریں اس لئے کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں ادب اردو کی تاریخ کے متعلق نقش اوّل ہے آیندہ نسلیں اِس کو خدا جانے کیا کچھ سمجھیں گی۔

قابل مؤلف نے اکبر کی شاعرانہ حیات کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ تقسیم خود اکبر نے کی ہے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ فاضل مؤلف نے اکبر پر اتہام رکھا ہے مگر غالباً اِس جملہ کے لکھنے میں اِن کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے اگر کوئی روحانی خواب یا علم سینہ یا الہام اس جملہ کا ذمہ دار نہیں ہے تو یہ فقرہ حقیقت سے اُسی قدر دور ہے جتنا جنوب سے شمال۔ اکبر کے تمام مطبوعہ خطوط اِن کی نثر کی مطبوعہ تصانیف (جن سے مؤلف صاحب کلیۃً ناواقف ہیں) اِن کے پنچ کے مضامین کا معتدبہ حصّہ اور اِن کے مطبوعہ کلام کا پورا حصّہ میں نے لفظ بہ لفظ پڑھا ہے بہت سے غیر مطبوعہ کلام وخطوط بھی میری نگاہ سے گذرے ہیں آج دو برس سے اِس چھان بین میں شب و روز رہتا ہوں مگر کہیں کسی جگہ اکبر نے خود اپنی حیات کے دور قائم نہیں کئے۔ کلیات کے حصّۂ اوّل اور صرف حصّۂ اوّل میں بعض جگہ خاص اشارات ہیں اور بعض جگہ اشعار کے سنین درج ہیں مگر وہ سنین انھیں اشعار کے لئے مخصوص ہیں اِن کا دامن اِدھر اُدھر نہیں بڑھتا ممکن ہے کہ فاضل مؤلف اِن کی ظاہری شان و شوکت سے مرعوب ہو کر انھیں کو ادوار کی سُرخیاں سمجھ بیٹھے ہوں۔

پہلا دور انھوں نے ۱۸۶۶ء تک رکھا ہے۔ فاضل مؤلف نے بعض باتیں نہایت لطیف و

نفیس لکھی ہیں جنکا اعتراف ہر صاحب نظر کا عین فرض ہے ۔ اِس دور کو انھوں نے غزلوں کے لئے مخصوص کردیا ہے ۔ شاعری کی ابتدا بے نومشقی کا زمانہ ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اکبر روش قدیم پر گامزن ہیں ان کا رنگ کلام پسند احباب کے مطابق ہے ۔ مگر مؤلف صاحب نے بعض بیانات میں بڑی بے پروائی سے کام لیا ہے ایک تو یہی کہ دور اوّل کو ۱۸۶۶ء تک کیوں ختم کردیا جس کے لئے کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ہے ۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ شرکت مشاعرہ اور سلسلہ غزل خوانی اِس وقت تک جاری رہا جب تک وہ ۱۹۰۳ء میں منصف ہوکر علیگڈھ نہیں چلے گئے؟ اِس کی کیفیت آیندہ صفحات میں دی جائے گی۔

دوسری عجیب و غریب بات ملاحظہ فرمائیے ۔

"He writes after the approved style of Lucknow Schools and Durbari poets."

وہ لکھنؤ والوں کی پسندیدہ طرز اور درباری شاعروں کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ لکھنؤ والوں میں ناسخ اور آتش کی راہیں بالکل جدا جدا تھیں ۔ طرزِ ادا، خیالات، زبان، مذاق ایک دوسرے سے مختلف تھا (۱) کیا اکبر دونوں کے رنگ میں غزلیں کہتے تھے ۔ یا صرف کسی ایک کے ؛ اکبر نے کبھی ابتداے عمر میں بھی ناسخ کے رنگ میں شعر نہیں کہے ۔ اِن کے حالات سے ظاہر ہوجائے گا کہ وہ پکے آتشی تھے (۲) اکبر نے درباری شاعروں کے تتبّع میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا ۔ نہ وہ خود درباری تھے نہ اِن کو دربارداری کی ضرورت ہی کبھی محسوس ہوئی ۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل مؤلف نے درباری شاعروں کو اُس زمانہ کے دیگر شعراسے ممتاز کیوں قرار دیا ہے "درباری" کا مفہوم ان کے ذہن میں جو کچھ ہو لفظوں سے کچھ ادا نہیں ہوتا اگر یہ مطلب ہے کہ شاہ پسند اشعار کے ناظم شاعر تھے یا رنگ دربار دیکھ کر شعر کہتے تھے، یا نوابین کو خوش کرنے کے لئے درجۂ مصاحبت و قربت بڑھانے کے لئے طمع زر و جاہ میں قصیدے نہیں غزلیں کہی جاتی تھیں تو اکبر کا دامن نظم ان تمام آلائشوں سے پاک ہے۔

حوالے اور شواہد کی ضرورت تو فاضل مؤلف نے ایک طرف سے سمجھی ہی نہیں طبع سلیم کا فیض سمجھئے یا تہذیب قواے باطنی کا طفیل کیئے فاضل مؤلف نے ان ادوار کے قائم کرنے اور ان کی

خصوصیات کے حصر میں بہت سے ایسے انمول موتی رول دئے ہیں جو دامن ادب اُردو کے لئے ہمیشہ ہمیشہ باعث افتخار اور مایہ ناز ہوں گے مگر جہاں کہیں رائے قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے میں جلد بازی کی ہے یا شاندار الفاظ کے سامنے حقیقت مفہوم کا خیال نہیں رکھا وہیں کمزوریاں آگئی ہیں۔

مجھے اِن کی تقسیم ادوار سے کلیتہً اختلاف ہے جس کے وجوہ سطور گذشتہ میں عرض کر چکا ہوں مگر میں فاضل مؤلف کے بعض بلیغ فقرات کی قدر کرتا ہوں۔

دوسرا دوار ان کے نزدیک ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء تک ہے۔ خصوصیات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

(1) Emotion has more play.

شعر کی تصویر میں رنگ جذبات غالب ہے۔ کس قدر صحیح مطالعہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں

(2) Personality is breaking the firm bonds of conventionality.

عنصرِ ذاتی رسوم و رواج کے سخت قیود کو برہم کئے دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مطالعہ میں عنصر ذاتی کی رنگ آمیزیاں شروع ہوگئی ہیں۔ ایک تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے پہلے عنصر ذاتی کا فقدان تھا یا تعطل؟ اِس کے علاوہ رسوم یا مروجہ قیود شاعری کی شکست سے ان کی مراد کیا ہے۔ اکبر نے سوا ایک نظم کے جو Blank verse میں ہے کبھی رنگ جدید کی کوئی نظم نہیں کہی۔ غزلوں میں سراسر متقدمین کے پیرو رہے۔ ذاتی عنصر ہمیشہ غالب رہا۔ آئین عروض کی پابندیاں انھوں نے ہمیشہ سختی سے کیں۔ جہاں کہیں قوافی یا تراکیب کے متعلق ان کو خفیف سی کمزوری بھی نظر آئی ہے اِس کو فوراً نوٹ میں ظاہر کر دیا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۹ء تک ہے۔

Ghazals still predominate.

اب بھی غزلوں کا پلہ بھاری ہے۔ اگر اکبر نے غزلیں نسبتاً کم کہی ہیں تو اسی زمانہ میں کہی ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ظرافت نکتہ سنجی اور تعریض کا پہلو اس زمانہ میں غالب رہا ہے مگر اس کی ابتدا بہت پہلے سے ہو چکی تھی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "تصوف، مذہب اخلاق

اور روحانیات کا رنگ خاص طور پر بصیرت فروز ہے یہ تعریف بالکل سچی - حد درجہ مناسب اور نہایت حق بجانب ہے۔

مگر دور سابق کے "ذاتی عنصر" اور شکست رسوم کے بعد ہی اسی سانس میں ذیل کا جملہ عجیب لطف انگیز جملہ ہے۔

"But the Ghazals have not ceased to be Ghazals in character spirit and language, not do they fragrantly outrage the principles and Canons laid down for Ghazals."

مگر غزلیں اب تک طرز ادا خیالات اور زبان کے لحاظ سے وہی غزلیں ہیں (جو پہلے تھیں اور جو آئین و قواعد غزل گوئی کے لئے مقرر ہیں ان کی خلاف ورزیاں نہیں ہوئی ہیں۔

ان دونوں بیانات میں جو مغالطہ نفسی - Self contradiction ہے میں اس کی تشریح تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔

چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک ہے۔

جس کو فاضل مؤلف نے تیسرے دور کا ضمیمہ قرار دینے میں نہایت نکتہ سنجی سے کام لیا ہے یہ بالکل صحیح ہے کہ فلسفیانہ انداز کلام نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ تصوف اور روحانیت کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اکثر بیانات میں نہایت درجہ لاپروائی کی گئی ہے۔

مثلاً Akbar is fast becoming the

اکبر بہت تیزی کے ساتھ لسان العصر ہوتے جاتے ہیں۔ وہ اس سے بہت پہلے لسان العصر ہو چکے تھے علیگڈھ کی تحریکات اور فیشن و پردہ کی اکثر اصلاحی نظمیں اس سے پہلے کی ہیں۔

پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک ہے۔

اس سلسلہ میں "دوپہر" پسند کرنے والوں کے نقطۂ نگاہ سے ایک نہایت بلیغ جملہ ہے

It is true that there is not that elasticity, buoyancy and exhilaration as in the foregoing periods.

یہ صحیح ہے کہ اب اُن کے کلام میں ادوار سابقہ کی سی لچک سرمستی اور شوخی نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں فاضل مؤلف نے کچھ ایسے جملے لکھے ہیں جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں
مثلاً "Life has a meaning for him" وہ حقیقت حیات پا گئے
ہیں۔ حیات ان کے لئے ایک معنی خیز چیز ہو گئی ہے کاش اس جملہ کے آخر میں More than ever
ہمیشہ سے زیادہ لکھ دیا جاتا اِس لئے کہ اکبر کو ۱۸۴۶ئہ سے ۱۹۱۲ئہ تک ناواقف معنی حیات
سمجھنا میرے نزدیک ایسا ہی ہے جیسا کسی شاعر کے لئے یہ کہنا کہ شیب سے پہلے اس کے قوائے
ذہنیہ ہمیشہ معطل رہے۔

بہرطور فاضل مؤلف نے اکثر جزئیات میں لغزشیں اور اکثر بیانات میں صریح غلطیاں کی ہیں
پھر بھی خصوصیات ادوار بہ حیثیت مجموعی قابل مطالعہ و لائق استفادہ ہیں۔

غالباً اب میرے قائم کردہ ادوار۔ صبح۔ دوپہر اور شام کی اصلی کیفیت آپ نے خود محسوس
کر لی ہوگی۔

پیدائش

سیّد اکبر حسین صاحب ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء مطابق شوال المکرّم ۱۲۶۱ھ کو پیدا ہوئے۔ یہ نور کا ٹکڑا جو ایک روز مطلع سخن پر آفتاب عالمتاب بن کر چمکنے والا تھا الہ آباد کے مفصل میں ایک نہایت معمولی سے موضع میں جس کا نام بارہ ہے ظاہر ہوا۔ یہ موضع جس کو اس مولود مسعود کی ولادت کا شرف حاصل ہوا۔ الہ آباد سے کچھ ہٹ کر شہر سے بارہ میل کے فاصلہ پر دوآبہ میں بارہ کے نام سے مشہور ہے تحصیل بھی اسی نام سے ہے۔ سر عبدالقادر اور محمد نصیر ہمایوں نے قومی کتب خانہ لاہور سے رقعاتِ اکبر شائع کئے ہیں اِس میں یہ مقام "باڑہ" غلط ہے اسی طرح کلام اکبر الہ آبادی کے عنوان سے ایک مختصر سا گلدستہ شفق عماد پوری نے لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ انھوں نے نہایت ستم ظریفی سے کام لیا ہے سوچے ہوں گے کہ پنجاب والوں کے یہاں "ڈ" اور "ڑ" کی زیادتی ہے اِس لئے بارہ باڑہ ہوگیا تو ہم اہل زبان ہیں اسم معرفہ میں حد صنائع نقاطکیوں صرف نہ کریں۔ مقلوب کر دینے سے ہمارا نقصان ہی کیا ہے ۸۰ڈگری کا فرق ہوگیا ہے اور بارہ کا نارہ ہوگیا ہے۔ یا غالبًا نوح ناروی کے طوفان میں شفق صاحب بھی کھو گئے ہوں اور اکبر کو بھی نارہ ہی کا سمجھے ہوں۔ افسوس ہے کہ تذکرہ نویس حضرات اپنی ذمہ داریاں ذرا بھی محسوس نہیں کرتے۔

اکبر کی دادی نے جو نہایت روشن ضمیر اور روشن دماغ تھیں خواب میں دیکھا کہ اِس بچّے کا نام اکبر حسین رکھا جائے (رقعات اکبر مرتبہ ہمایوں) اور زچہ نے بھی پدر یوسف کی طرح ستاروں کو پائے پسر پر تو نہیں دیکھا مگر یہ ضرور دیکھا کہ ایک چاند میری گود میں آگیا ہے۔

وہی چاند ظاہر ہوا اور فصاحت و بلاغت کی بسط و شرح کے دوش بدوش سارے ہندوستان میں جلوہ گر ہوگیا۔ اب اِس کامل مہر درخشاں کی کرنیں فیض رسانی کے لئے بیتاب ہیں۔ اِس میں اور فضائی آفتاب میں فرق ہے۔ فضائی آفتاب دنیائے نباتات، حیوانات، جمادات، انا میں فطرت اور حیات انسانی کا ایک محسن ہے مگر یہ آفتاب جہالت کی تاریک گھٹاؤں کو دور کرتا ہے عقل و فہم کو جلا دیتا ہے ضمائر اور قلوب کو آئینہ بناتا ہے یاس و حسرت کو امید و حوصلہ سے بدل دیتا ہے

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فیض رسانی کے لئے۔ اپنے مخاطب میں قوت استعداد کو نشوونما دیتا ہے۔ آفتاب تمام روئے زمین پر چمکتا ہے مگر ہر قطعہ زمین پر اس کا اثر یکساں نہیں ہوتا بلکہ قطعہ زمین کی قابلیت اثر پذیری اور استعداد فطری کے تناسب سے فیض شعاع بھی بر سر کار رہتا ہے مگر ہمارے آفتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے مخاطب کو پہلے تو اپنی سلاست ظرافت، موسیقی اور ایک سحر پوشیدہ کی کرنوں سے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور مخاطب کے قوائے استدراک ونقد سخن فہمی ونکتہ سنجی کی بتدریج مگر یقینی طور پر تہذیب کرتا رہتا ہے اور جیسے جیسے یہ قوتیں معمول میں نشوونما پاتی جاتی ہیں ویسے ہی ویسے وہی شعاعیں زیادہ فیض رساں ہوتی جاتی ہیں۔ ہم اکبر کے جس شعر کے معنی شروع میں جس قدر لطیف سمجھتے ہیں کچھ دنوں کے مطالعہ کے بعد اسی شعر کے معانی ہمارے لئے کہیں زیادہ لطیف اور کہیں زیادہ بلند ہو جاتے ہیں۔

ماحول

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی تک دفاتر سرکاری میں اُردو سرکاری اور لازمی زبان نہیں ہوئی تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین اپنی مساعی میں مصروف تھے۔ شمس العلما حضرت آزاد کے والد محترم کا سب سے پہلا اردو کا پرچہ ”اُردو اخبار“ کے نام سے نکل کر بند ہو چکا تھا۔ ذرا فطرت کی متانت دیکھئے ادھر آزاد ایسا نثار دہلی میں پیدا ہوا۔ سرسید اور حالی قومی تحریکات میں مصروف ہوئے۔ نذیر احمد و شبلی ملک و ادب کی پرستش و تحقیق میں لگ گئے۔ تاسخ و آتش فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے اور ان سب کے ساتھ ہی ساتھ میر انیس کو لکھنؤ اور اکبر کو الہ آباد میں فطرت کا پیامی بنا کر بھیجا گیا۔

یہاں بھی شاید کسی لفظ پرست کو دھوکا ہو کہ میں نے انیس و اکبر کو ایک ہی درجہ دیا ہے ہرگز نہیں فطرت کا پیامی ہونے کی حیثیت سے بھی میں انیس کو ہمیران سخن میں کامل ترین بلکہ خدائے سخن سمجھتا ہوں میرے مشاغل اور مصروفیت نے اجازت دی تو ”حیات انیس“ لکھنے کا ارادہ ہے جس میں ان کے مرتبہ پر مکمل طور سے روشنی ڈالی جائے گی۔

دونوں کی روشیں جدا جدا وہ مرثیہ نویس یہ غزل گو۔ دونوں کا طریقہ پیام رسانی الگ الگ

وہاں متانت اور حکیمانہ مطالعہ فطرت انسانی یہاں ظرافت وتصوف وہاں جذبات کی تصویر کشی اور حسیات لطیف کی موقلمی یہاں جذبات وحسیات کی ہنستی بولتی مورتیں نظر آتی ہیں مگر حقیقت اتنی ضرور ہے کہ دونوں فطرت کے پیامی ہیں۔

یہ دونوں اس محفل میں آئے جہاں ایک طرف تو 'امیر و داغ' درد و شیفتہ، آزاد و حالی' سیّد و نذیر، وقار و محسن اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور دوسری طرف ہندوستان سیاسی اور ملکی تحریکات کی کشمکش میں پڑا ہوا تھا دونوں کو پیام رسانی کا میدان ملا اور دونوں نے اپنے اپنے فرائض انجام دئے۔

اُردو شاعری کا نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ حالی نے اپنے غیر فانی مسدس کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ آزاد کی طبیعت بھی فطری شاعری کی طرف مبذول ہو چلی تھی۔

حسب ونسب

سید اکبر حسین صاحب نجیب الطرفین تھے۔ مورثِ اعلیٰ طہران سے آئے تھے۔ خاندان میں سب شیعہ تھے۔ دادا کے متعلق خود مرحوم خواجہ حسن نظامی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں

"دادا سنّی سپاہی تھے آگے کا حال معلوم نہیں" "ذکر المعارف میں" پورا شجرہ درج ہے۔

سید اکبر حسین کے والد مولوی سید تفضل حسین صاحب عرف چھوٹے میاں اپنے بڑے بھائی سید وارث علی شاہ تحصیلدار کی نگرانی میں نائب تحصیلداری کی معزز عہدہ پر ممتاز تھے۔

اِن کے دادا کی شادی تحصیل سورام میں ہوئی تھی۔ جہاں اِنھوں نے مستقلاً سکونت اختیار کرلی، سید وارث علی صاحب نہایت کنبہ پرور تھے سورام اور بارہ میں تحصیلدار رہے۔ بڑا دوردورہ تھا۔ تام جھام کی سواری، عملہ و خدام کی فراوانی، شان وشوکت، خوش غذائی اور خوش پوشی دیکھنے والوں کو اب تک یاد ہے۔ اپنی زندگی کے پسندیدہ اصول اور معاشرت کے قاعدے انھوں نے خود بنالئے تھے جس پر نہایت سختی سے عمل درآمد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خود موصوف کی زندگی جیسا کہ اِن کے خطوط سے ظاہر ہے نہایت بااصول تھی۔

اُس زمانہ کی تحصیلداری آج کی کمشنری سے زیادہ دقیع تھی۔ چونکہ اکبر کی خاندانی وجاہت کا ذکر ہے جس سے اِن کی حیات وکلام کا گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں تحصیلداری کی شان کے متعلق کچھ عرض کردینا غیر ضروری نہوگا۔

غدر ۵۷ء کے فرو ہونے کے بعد کمشنر وقت نے میر وارث علی صاحب کو بلا کر کہا کہ راجہ دلیپ پور باغی ہوگیا ہے جنگلوں میں چھپا پھرتا ہے۔ فوج بھی کافی ہے اس کو حاضر دربار ہونا چاہئے ورنہ میری آبرو جاتی ہے (بیان کردہ سید زاہد حسین اسسٹنٹ سرجن) میر وارث علی صاحب چپ چاپ چلے آئے کسی کو خبر نہ دی۔ اصطبل میں خاصہ کے کئی جانور تھے، پو پھٹنے کے پہلے زین کسی سوار ہوئے۔ ڈاب میں تلوار رکھ لی اور گھوڑے کو مہمیز لگا کر یہ جا وہ جا سورام سے ۳۲ میل چل کر پرتاب گڈھ پہنچ گئے۔ حسن اتفاق دیکھئے ایک جھونپڑے کے پاس پہنچ کر، سورج کی حدت اور اور پیاس کی شدت سے اُترے ایک بوڑھیا سے پانی مانگ کر پیا۔ مٹّی کے آبخورے میں سادے

پانی نے وہ لطف دیا جو سونے کے ساغر میں برفاب سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے ٹھہرے تھے۔ آبخورہ واپس دینا بھول گئے سوچ رہے تھے کہ اچانک چلا آیا ہوں تن تنہا ہوں۔ جانے کیا آفت پڑے۔ معلوم نہیں راجہ کہاں ہے۔

بوڑھیا نے متفکر دیکھ کر پوچھا "بیٹا کس سوچ میں ہو"

کہنے لگے مائی۔ میں راجہ سے ملنا چاہتا ہوں لوگ اُس کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیسے بچاؤں، کہاں پاؤں کہ ہوشیار کروں۔

بوڑھیا بولی۔ بیٹا چل۔ میں ابھی بتائے دیتی ہوں وہ میری جھونپڑی میں چھپا ہوا ہے۔

وارث علی صاحب کی قسمت جاگ اُٹھی۔ جھونپڑی میں پہنچ کر کہنے لگے، میرا نام وارث علی ہے میں سورام کا تحصیلدار ہوں تمھیں لینے آیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے گھوڑے پر اُٹھا کر ڈال لیا اور زوال آفتاب سے پہلے کمشنر کے حضور میں حاضر کر دیا۔ بات یہ ہے کہ راجہ اپنی فوج سے جدا رہتا تھا کہ لوگ فوج پر یہ سمجھ کر حملہ کریں کہ راجہ یہیں ہوگا اور یہی ہوتا تھا کہ فوج کے سپاہی بے گناہ کام آتے تھے وہ محفوظ رہتا تھا۔

اکبر کے والد ماجد سید تفضل حسین صاحب کے فیصلے کرامت حسین جج اور خود اکبر حسین صاحب جج کے فیصلوں کی طرح اٹل اور پر مغز ہوتے تھے۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ عربی اور فارسی کی انتہائی کتابوں کا درس شائقین علم و ادب کو دیا کرتے تھے۔ ریاضیات میں یدطولےٰ حاصل تھا اور خاص شوق تھا، خطائن (عربی ریاضی کے) مشکل ترین قاعدوں کا جدید حل انھیں کی ذات سے منسوب ہے۔ خود اکبر نے دیباچہ کلیات میں ان کی کمال ریاضیات کا اظہار کیا ہے۔ سیرت ایسی پاکیزہ تھی کہ خالص درویش صفت تھے۔ عبادت و ریاضت زہد و اتقا سے نہایت درجہ دلچسپی تھی۔ عرفان و تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اِن کا انتقال ۱۳۰۲ھ میں ہوا۔

چو شد وصل ذات رب ذات او بجو سال تاریخش از ذات رب
۱۳۰۲ھ

چونکہ اکبر کی ابتدائی تعلیم بھی اسی سرچشمہ کمال کی مرہون منت تھی لہذا اِن کے اشعار میں تصوف و عرفاں کی جھلک ہمیشہ رہی اور دور "شام" یا آخری ایام عمر میں اکبر پورے عارف اور صوفی ہو گئے اِن کے اشعار پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ "تصوف اور علوے نفس" کی سرخیوں سے ہو سکتا ہے

ان کی والدہ جگدیش پور ضلع گیا کے ایک نجیب الطرفین زمیندار کی دختر بلند اختر تھیں جن کی اچھوتی تربیت سے اکبر حسین جس حد تک فیض یاب ہوئے۔ اُس حد تک ان کی زندگی مکمل زندگی رہی اور حیات کے جن شعبوں پر ان کی نوازشات کا اثر پڑا وہ شعبے قابل قدر حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے چونکہ محض اکبر مصنف اکبر سے مطلب ہے لہذا جزئیات کی تشریح نہیں کرتا۔

ابتدائی تعلیم

اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی - ابھی چار پانچ برس سے زائد کے نہوئے تھے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات - افعال واقوال سے تیزی اور ذہانت کے غیر معمولی آثار ظاہر ہوئے (رقعات اکبر صفحہ ۶) معلوم نہیں اکبر مرحوم کے حالات زندگی لکھنے والے خواہ سر عبدالقادر ہوں یا محمد نصیر ہمایوں لکھتے ہیں۔ "تعلیم بہت معمولی ہوئی"۔ اسی سانس میں کہتے ہیں ابھی دس سال عمر نہ ہوئی تھی کہ اکبر اُردو میں بے تکلف خطوط لکھنے لگے اور فارسی میں اپنے ہم عمروں سے بہت بڑھ گئے ان کے مضمون سے حیرت ہوتی ہے کہ خدا جانے ان کے نزدیک معمولی تعلیم کے کیا معنی ہیں۔

اسی طور پر بابو رام سکسینہ صاحب بھی ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۶ء تک کی لائف ذیل کے دو جملوں میں ختم کر دیتے ہیں ملاحظہ ہو صفحہ ۲۲۷

Syed Akbar Husan Razvi was bron on 16th November, 1846 A. D. of parents not in affluent circumstances. He received early education in Madrasas and Government Schools.

یعنی اکبر حسین رضوی ۱۶ / نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے - ان والدین کچھ اچھی حالت میں نہ تھے (مالی حیثیت سے) انھوں نے ابتدائی تعلیم مدرسوں اور گورنمنٹ اسکولوں میں حاصل کیا - یہ ہمارے بھائیوں کی حیات نگاری ہے، کہاں پیدا ہوئے؟ حالت کیا تھی؟ کن مدرسوں میں پڑھے؟ کیا پڑھے - ؟

سید اکبر حسین کی ابتدائی تعلیم کا حصہ زیادہ تر خود سید تفضل حسین صاحب جیسے بحر بیکراں کا حاصل رہا - جن کی عالمگیر قابلیت نے معمولی باتوں میں بھی نکات نکالے اور سمجھائے، اس کے بعد ان کی والدہ جب سید اکبر حسین صاحب کا سن ۸ و ۹ برس کا ہوگا ۱۸۵۵ء میں بچہ کی تعلیم کے خیال سے الہ آباد میں آکر محلہ چکسیہ را اپنے اعزا میں رہیں - اکبر حسین دس برس کے سن تک عربی اور فارسی درسیات کی انتہائی کتابیں پڑھ چکے تھے - ایک جگہ باپ کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں "جو پڑھا میں نے وہ اپنے باپ سے" کسی گورنمنٹ اسکول میں انھوں نے کبھی نہیں پڑھا - گھر پر مولوی البتہ مقرر تھے - شاید مہینہ دو مہینہ کو مسجد کے کسی مدرسہ میں جواب نہیں ہے کچھ پڑھے تھے ۱۸۵۶ء میں جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے اور انگریزی کی دو چار کتابیں پڑھتے

کے بعد ۱۹۰۹ء چھوڑ بیٹھے۔
سخنان الہند کیفی چریا کوٹی (اعظم گڈھ) کا بیان ہے کہ اکبر نے اِن کے والد ماجد مولوی محمد فاروق سے بھی تعلیم حاصل کی تھی یہ وہی در ہے جہاں کی جبہ سائی کو مولوی شبلی اور سرسید نے اپنا فخر سمجھا ہے چنانچہ اِن کے بقول اکبر مرحوم کیفی صاحب کو اُستادہ زادہ لکھتے تھے اور کیفی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ آخر عمر تک اکبر جو کچھ کہتے تھے وہ بنظر ارادت و اصلاح ان کے والد کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے

شوقِ مطالعہ

اکبر کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا انھوں نے اپنے آپ سے نہ صرف انگریزی کی استعداد بڑھائی بلکہ کلام شعرا کی بھی سیر کی، اِن کے بھانجے سید زاہد حسین صاحب کا بیان ہے کہ مجلس شعرا میں جب کبھی کوئی حاجت ہوتی اساتذہ فن کے فارسی اور اُردو کلام سے بہت سی سندیں پیش کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ آتش اور ناسخ جن اشعار کی وجہ سے آتش اور ناسخ ہوئے ہیں وہ میرے ناخنوں پر ہیں۔

یہی مطالعہ کا شوق تھا جس نے آخر عمر میں فلسفہ اور تصوف کی سیر میں خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ اِن کا درسی کتب خانہ قابل دید ہے اِن کے بعض خطوط سے جو عبدالماجد صاحب کے نام ہیں شوق مطالعہ کا حال کھلتا ہے۔ شوق مطالعہ کے ساتھ ہی ساتھ ذوق تحقیق بھی بہت تھا جس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ اُس زمانے کے مشاعرے آج کے مشاعروں سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے تھے آج جو حالت ادب کے اُن جلسوں کی ہے جہاں نہایت آزادی سے مقرر کی زبان پر اور خیالات پر تنقیدیں ہوتی ہیں اور آپس میں مباحثہ ہوتا ہے وہی حالت اُس وقت کے مشاعروں کی ہوتی تھی۔ اکبر حسین صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور یاران بادہ خوار کے دور میں ان کی حیثیت اچھی خاصی تھی۔ خوب نوک جھوک کی ہوا کرتی تھی۔ آخر عمر میں مل اور سنسپر وغیرہ کے کتابوں کا عمیق مطالعہ کرنے لگے تھے اور ان کے مطالب پر آزادی سے گفتگو اور تبادلہ خیالات کر لیا کرتے تھے۔

Raiburen and Akbar

ریبرن اور اکبر کے نام سے سید عشرت حسین صاحب نے ایک مختصر سا رسالہ پانیر پریس الٰہ آباد سے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ میں اس جگہ صرف اس نظر سے ذکر کر رہا ہوں کہ آپ کو موصوف کے شوق مطالعہ بعد نظری اور ذوق مصوری کا کچھ اندازہ ہو جائے سرورق دبیز ہے شروع میں دو صفحہ کا تعارف تمہید کے نام سے ہے یہ تمہید بہ حیثیت خود کوئی ادبی شان نہیں رکھتی۔ اکثر جگہ روانی اور روابط کی کمی ہے مگر تحریر کا لب و لہجہ انگریزی عبارت کی طرح صاف اور سلیس

معنی خیزاور دلچسپ ہے۔

اس رسالہ میں یورپ کے مشہور مصور ریبرن کی سات شاہکار تصویریں آرٹ پیپر پر چھپی ہیں اور ہر تصویر کے مقابل ایک یا زائد شعر جو اس تصویر کے متعلق ہیں درج کئے گئے ہیں۔ مگر معلوم نہیں کس مصلحت سے تصویریں سیاہ سفید چھپی ہیں۔ جن سے دوہری کمی ہو گئی ہے ایک تو یہ کہ اصلی تصویروں میں جو خاص رنگ خاص اثرات کے حامل ہیں ان کے نہ ہونے سے ریبرن کے کمال کا پورا اثر دیکھنے والے پر نہیں ہوتا اور دوسرے اکبر کے اشعار جو رنگین تصویروں کے اثر کا نتیجہ ہیں وہ بھی سادہ تصویروں کے ساتھ بہت پھیکے ہو جاتے ہیں اور الفاظ ان خاص جذبات کی دوبارہ تحریک نہیں کر سکتے جن کے ماتحت وہ رنگین تصویریں دیکھ کر شاعر کے دماغ میں آئے تھے۔

بہرطور رسالہ قابل دید ہے۔ عشرت صاحب سے مل سکتا ہے قیمت بھی عہ رسالہ کی حیثیت دیکھتے ہوئے کچھ زائد نہیں ہے۔

شاعری کی ابتدا

اکبر حسین نے کس زمانہ سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اس کے متعلق کسی حتمی فیصلہ کی گنجائش نہیں ہے اس لئے خارجی اور داخلی شواہد موجود ہیں۔

اِن کے حقیقی بھانجے سید زاہد حسین صاحب کا بیان ہے کہ مرحوم نے خود ان سے فرمایا کہ "میں گیارہ برس کا تھا۔ جب سے شعر کہتا ہوں، میرے چچا وارث علی صاحب نے ایک بار مجھے بلا کر پوچھا "بیٹا شعر کہتے ہو" میں ادب کی وجہ سے [illegible] رہا۔ خود ہی فرمانے لگے اچھا ایک مصرعہ ہم کہتے ہیں ایک تم کہو۔ انھوں نے ایک مصرعہ کہا اور جیسے علی حزیں نے اپنے والد کے سامنے صائب کے ایک شعر کے جواب میں تین شعر کہے تھے اکبر نے بھی دوسرا مصرعہ فوراً کہہ دیا اور بڑے چچا خوش ہوئے افسوس ہے کہ باوجود کوشش زاہد صاحب کو وہ مصرعے یاد نہیں آئے علی حزیں کے اشعار کے لئے ان کے خود نوشتہ حیات کا دیباچہ ملاحظہ فرمائیے۔

کلیات اکبر حصہ اول طبع ہفتم صفحہ ۱۲۴ ملاحظہ فرمائیے وسط صفحہ میں دو شعر ہیں عمر ۱۵ سال لکھی ہوئی ہے خدا جانے اس کے بعد کی غزلیں کب کی ہیں بہر طور ۱۸۶۱ء سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔

چشم عاشق سے گریں لختِ دلِ بیتاب واشک
آپ یوں دیکھیں تماشا جان کر سیماب واشک

سالے کہ نکوز نو بہارش پیدا۔ ابتدائے کلام دیکھئے اور ایسی مشکل زمین میں اتنا صاف شعر نکالا ہے خود اسی زمین میں فکر کیجئے تو وقت کا اندازہ ہو سہ

اپنے دامن پر گرا کر کیوں اسے کرتے خراب
جانتے یکساں اگر ہم گوہر نایاب واشک

دوسرا شعر بھی نہایت صاف ہے۔

صفحہ ۱۱۵ پر ایک سہرا ہے۔ سر پر سہرا باہر سہرا جس میں ذوق اور غالب کے مشہور سہرے ہیں ۱۸۶۶ء یعنی ۲۰ برس کی عمر میں یہ سہرا کہا تھا

کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

کس قدر جوش مسرت میں ہے سر پر سہرا
خود ہے خوشبو کی طرح جامے سے باہر سہرا

یہ طراوت عرق رُخ کی نہیں ہے اس میں
آب آئینۂ خورشید میں ہے تر سہرا"

صفحہ ۱۱۶ "یہ پہلی غزل ہے جو مشاعرے میں پڑھی گئی اور پبلک نے اکبر کا نوٹس لیا۔ اس وقت اکیسواں سال تھا" یعنی ۱۸۶۷ء۔ فرماتے ہیں۔

سمجھے وہی اس کو جو ہے دیوانہ کسی کا ،، اکبر یہ غزل ہے مری افسانہ کسی کا

۲۳ شعر کی غزل ہے تصوف کی چھوٹ چاروں طرف پڑ رہی ہے۔ ابتدائے مشق اور ایسے صاف شعر نکال لینا معمولی بات نہیں ہے۔

صفحہ ۲۸ "یہ دوسری غزل ہے جو اکبر نے مشاعرے میں پڑھی۔

مبارک میکشو موسم پھر آیا بادہ خواری کا چمن میں شور ہے پھر آمد فصل بہاری کا

بہت کافی ترقی ہے۔

صفحہ ۱۳۴ عمر ۱۹ سال ۱۸۶۴ء

فصل گل آتے ہی اکبر ہو گئے بیہوش آپ کھولئے آنکھوں کو صاحب جام صہبا لیجئے

صفحہ ۱۲۱ ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء اٹھائیسواں برس تھا۔

کام آتا ہے جو وصف روے دلبر میں چراغ اوج پر رہتا ہے ہر محفل میں ہر گھر میں چراغ

۲۱ شعر کی نہایت پاکیزہ اور سیر غزل کہی ہے۔

صفحہ ۱۲۴ ۱۸۷۱ء ۲۵ سال کی عمر میں

وہ آئے بھی لب بالیں تو ایسے وقت میں آئے کہ فرط ضعف سے ہم کر نہیں سکتے اشارہ تک

اس کی ردیف کیسی ٹیڑھی ہے اور شعر کس قدر درد انگیز ہے۔

بہرطور یہ طے ہے کہ سترہ سال کی عمر سے ایسا کہنے لگے تھے جسے خود انھوں نے اپنے کلیات میں جگہ دی

ابتدائے کلام میں تو مشق ضرور تھی مگر صفائی بھی کافی تھی اور زور طبیعت روز بروز رنگ دکھاتا جاتا تھا۔ آتش کے سلسلہ میں تھے۔ وحید الدین وحید سے تلمذ تھا جو بشیر صاحب کے شاگرد تھے بشیر صاحب خواجہ آتش صاحب کے شاگرد تھے۔

مولوی وحید الدّین صاحب وحیؔد

ذیل کے حالات کے لئے ہم تمام وکمال جناب مولوی محمّد متین صاحب بی۔اے۔ایل ایل بی (عمر قریب ۵۵) کے مرہونِ منت ہیں جنھوں نے نہایت عمدگی اور خوش خلقی سے مرحوم کے ضروری حالات ہمیں زبانی سُنا دئے۔

تاریخ ادب اُردو کے فاضل مؤلّف رام بابو سکسینہ نے بعض جگہ حیات نویسی میں اسی غیر ذمہ دارانہ انداز سے کام لیا ہے جیسے کوئی نہایت معمولی درجہ کا خط کسی کو لکھے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۲۸ - "اکبر کی شاعرانہ زندگی" کی تحت میں قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔

He submitted his poems for correction to Ghulam Husain Waheed, a pupil of Atish.

"وہ اپنے اشعار غلام حسین وحید کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کرتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے" اِس مختصر سے جملہ میں دو غلط بیانیاں ہیں ایک تو ان کا نام وحید الدین صاحب وحیؔد تھا۔ ممکن ہے غلام حسین صاحب وحید کوئی اور صاحب ہوں دوسرے یہ کہ وہ بشیر صاحب کے شاگرد تھے جیسا خود ان کے شعر سے ظاہر ہے اور بشیر صاحب کو آتش سے تلمذ تھا۔

کاش لوگ تحقیق اور تدقیق سے کام لیں اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ ذہنی ایمانداری کی قدر کریں۔ ضمیر کو مدلل انداز سے ادب اندوز ہونے دیں اور امراض ساریہ کے جراثیم کی طرح مہلک بیانات کو فضائے ادب میں نہ پھیلائیں ورنہ ایک ہی غلط لفظ صدہا نسلوں کی بربادی کا باعث ہو سکتا ہے۔

مولوی وحید الدین صاحب سلیم قصبہ کڑا ضلع فتحپور میں ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے، اُن کا مکان محلہ متولیانہ میں (جواب کثرتِ استعمال سے غلط العام فصیح ہو کر مولیانہ کہلاتا ہے) تھا۔

اِن کی فارسی وعربی کی تعلیم کافی ہوئی تھی مگر بہت زیادہ دستگاہ نہ تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تراکیب عربیہ وفارسیہ کا استعمال بہت کم پایا جاتا ہے۔ صاف صاف شعر سیدھے سیدھے لفظوں میں کہتے ہیں۔

محمد بشیر صاحب سے تلمذ تھا جو خواجہ آتش کے شاگرد تھے وحید ؎

اب تم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو فیض بشیر سے یاں کوئے تو کیا نہیں ہے

بعض غزلیں خود خواجہ صاحب کی اصلاحی ہیں۔ مگر آتش تلامذہ کی غزلوں میں ناسخ کے برعکس فن اور زبان کی غلطیوں پر زیادہ نظر نہیں کرتے تھے۔ محض بندش اور خیال کی موٹی موٹی غلطیوں کو درست کر دیا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وحید صاحب کے کلام پر نکتہ سنج حضرات عروض و قواعد کے اعتبار سے لطیف لغزشیں پاتے ہیں۔ان کے کلام میں سلاست و روانی بہت ہے مگر دقت نظر اور بلند خیالی بہت کم ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب دہلی اور لکھنؤ انتشار و حوادث کا مرقع بن گیا تو اہل کمال پٹنہ اور عظیم آباد کی طرف کھنچے اس لئے کہ وہاں اب بھی علم و زبان کی قدر تھی۔ مفتی عباس صاحب قبلہ فقیہہ اور مرزا دبیر سے خوشگو بھی لکھنؤ چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے تھے۔

محمد وحید صاحب بھی پٹنہ گئے مگر ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۲ء کے بعد کسی وجہ سے الہ آباد آنے جانے لگے وحید صاحب یہاں آئے تو محمد جان خاں حیرت صاحب دیوان مطبوعہ منشی کشوری لال منصف صاحب دیوان (غیر مطبوعہ) اور لسان العصر ان کے شاگرد ہوئے مگر نہ تو یہاں وحید صاحب کے شاگردوں کا دائرہ وسیع ہوا اور نہ منشی منیر اور خود ناسخ کے شاگردوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ کامیابی ہی ہوئی۔

الہ آباد میں جب ناسخ آئے اور دائرہ شاہ اجمل و نیز دوسرے دائروں میں مقیم رہے تو صاحب استعداد تلامذہ کا مجمع گرد و پیش ہو گیا اور ناسخی رنگ نے بہت کچھ جلوہ دکھایا خود فرماتے ہیں

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم آئی کہاں سے گردش پرکار پانوں میں

اُس کے بعد جب منشی منیر صاحب دیوان (ہر سہ حصص مطبوعہ) تشریف لائے تو بھی شعر و سخن کا بہت کم چرچا تھا چنانچہ آپ کی معرکۃ الآرا مثنوی معراج المضامین کی ورق گردانی فرمایئے تو اکثر جگہ الہ آباد کی بے حسی اور بے شغلی کا چرچا ہے پھر بھی جب وحید صاحب تشریف لائے تو منشی صاحب کے شاگرد بھی ایک بڑی تعداد تک پہنچ چکے تھے۔

اکبر حسین صاحب کو منشی وحید صاحب کی شاگردی پر فخر تھا اور اپنے اُستاد کو خدا جانے

کیا سمجھتے تھے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

اُستادی وحید میں جس کو کلام ہو　　　تیار اس سے بحث کو اکبر ہے آج کل

اور عملاً بھی اکثر اوقات جو اعتراضات وحید صاحب سے نہ اُٹھتے تھے اُن کا جواب حتے الوسع خود دیا کرتے تھے وحید کے معزز شاگردوں میں کچھ دنوں بعد منشی امین الدین قیصر صاحب دیوان مطبوعہ کا نام بھی شامل ہو گیا۔ وحید صاحب کا رنگ کلام سلیس اور فصیح ہونے کی وجہ سے عام طور پر بہت مقبول تھا اور بعض غزلیں ذوق کی غزلوں کی طرح گلی کوچہ میں گائی جاتی تھیں اور کہیں کہیں اب بھی گائی جاتی ہیں مگر مشاعروں میں ان پر اکثر اعتراضات ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ دریاباد کے مشاعرے میں انھوں نے ایک مطلع پڑھا۔

بلبل شیدا کو دکھلا دو تماشا پانوں میں　　　تم زر گل کا پہن لو آج توڑا پانوں میں

اس پر دو اعتراضات ہوئے (۱) یہ کہ میں غلط ہے کا ہونا چاہئے (۲) دکھلانا متروک ہے۔

اسی طرح اس مطلع پر بھی اعتراضات کی بوچھار ہوئی ہے۔

وہ اگلی سی اب مے پرستی نہیں　　　گھٹا جھومتی ہے برستی نہیں

اس میں بعض نکتہ چیں حضرات صوری اور معنوی دونوں "کمی" بتاتے ہیں۔

۱۸۸۰ء کے بعد جب اکبر حسین صاحب منصف ہو کر علیگڈھ چلے گئے۔ الٰہ آباد میں ذوالقدر جنگ آ گئے۔ دریاباد کے روسا نے اپنی جائدادیں وقف کیں اور مشاعروں کی جگہ قصیدہ خوانی کی محفلیں اور مرثیوں کی مجلسیں ہونے لگیں تو وحید بھی گوشہ عافیت میں اپنے گھر پر بیٹھ گئے۔

اِن کی موت عجیب طور پر واقع ہوئی۔ ۱۱ رمضان المبارک ۱۸۹۲ء کو کڑے میں آگ لگی، پھوس کے چھپر مہجورین کے قلب سوزاں بن گئے، شعلہ بہت آسانی سے بڑھتے گئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ۵۰ - ۶۰ گھر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔

وحید صاحب کے آٹھ دیوان (پورا کلیات) ایک کوٹھری میں بند تھے اور وہیں کرنسی نوٹ بھی رکھے تھے۔ وحید صاحب گھبرا کر گئے مگر باہر نہ آئے تھے کہ سامنے کا سائبان جو پھوس کا تھا جل کر نیچے آ رہا اب کیا کریں جب باہر نکلے تو اچھی طرح گھٹ چکے تھے۔ داہنے ہاتھ میں کلیات اور بائیں میں

نوٹوں کا پلندا تھا جس کا بہت زیادہ حصہ جل چکا تھا جس کی قیمت مولوی متین صاحب نے
ٹامسن صاحب کے یہاں درخواست دے کر اور وکالتاً ضمانت کر کے ان کے ورثاء کو دلادی
وحید صاحب بھی جھلس گئے تھے آگ اور دھوئیں سے جل کر اور گھٹ کر انتقال کر گئے اُن کی
تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے۔ ع شاعر خوش مقال مرد۔

۴۰	م	۴۰	م	۶۰۰	خ	۳۰۰	ش
۲۰۰	ر	۱۰۰	ق	۶	و	۱	ا
۴	د	۱	ا	۳۰۰	ش	۷۰	ع
		۳۰	ل			۲۰۰	ر
۱۸۹۲ء = ۲۴۴	+	۱۷۱	+	۹۰۶	+	۵۷۱	

وحید صاحب کے آٹھ ضخیم دیوان ہیں مگر مطبوعہ کوئی نہیں ہے ان کے نواسوں کے پاس
محفوظ ہیں اور کچھ کلام پٹنہ کے بعض شاگردوں کے پاس ہیں۔

اگر غیر متعلق نہ ہوتا تو میں وحید صاحب میر صاحب اور فروغ صاحب (جو قلق (صاحب
مثنوی طلسم حیرت) کے بھانجے اور شاگرد تھے صاحب دیوان تھے) کی ہم طرح غزلیں پیش کرتا
تاکہ موازنہ ہو سکے بہر طور جن کو شوق ہے خود دیکھ لیں۔

وحید صاحب کے کلام کا نمونہ مختلف بحروں میں دکھاتا ہوں تاکہ ارباب نظر ان کے
مذاق طبیعت سے آشنا ہو جائیں اور دیکھ لیں کہ لسان العصر کے ابتدائی کلام پر اس کا کافی
اثر پڑا ہے اگرچہ ان کی جدت پسند طبیعت کی روش ہمیشہ جدا رہی مگر شروع کی غزلوں میں
وحید کا رنگ غالب تھا۔ ان غزلوں کے لئے میں سید اکبر حسین لسان العصر کے ہمنام کا رہین
منت ہوں جنھوں نے اپنی قلمی بیاض سے مجھے نقل کی اجازت دی۔

(۱)

کس وقت تیرے رُخ پر زلفِ دوتا نہیں ہے کب روشنی کی دشمن کالی گھٹا نہیں ہے
قاصد کی جان جائے پُرزے کریں وہ خط کے تقدیر میں ہماری کیا کچھ لکھا نہیں ہے

(۲)

میں نے مانا کہ تمھیں کام تھا فرصت بھی نہ تھی دور سے شکل دکھا جاتے یہ صورت بھی نہ تھی

جان دی ہجر میں تم نے تو بہت خوب کیا　　ان سے ملنے کی وحید اب کوئی صورت بھی نہ تھی

(۳)

اُٹھی ہیں ساقی کالی گھٹائیں دل کو ہمارے لہرا گئی ہیں
بھر دے شراب کہنہ ساغر اگلی ہوائیں پھر آ گئی ہیں
بجلی تڑپ کر ٹوٹی زمیں پر دکھلائی کیا کیا نیرنگ سازی
یاد آ گیا ان آنکھوں کا جادو نیچی نگاہیں تڑپا گئی ہیں
فصل بہاراں آئی ہے کیسی بھولا بھلا ہے گلزار عالم
نخل تمنا کی ہے خرابی شاخیں تک اس کی بل کھا گئی ہیں

(۴)

وہ ملے ہم کو فنا کا رنگ دکھلانے کے بعد　　راہ پر تقدیر بھی آئی تو مٹ جانے کے بعد
ان کو کچھ تسکین دل ہوتی جو تڑپانے کے بعد　　سرد ہو جاتے ہم ایسے ذبح ہو جانے کے بعد
قبر میں کیا کیا فرشتوں کو تھے ارمان سوال　　کچھ نہ پوچھا مجھ سے تیرا نام بتلانے کے بعد
وقت مجھ پر دو کٹھن گذرے ہیں ساری عمر میں　　اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

(۵)

جلوہ عارض نظر زیر نقاب آیا تو کیا　　منہ پہ رکھ کر چاند دامان سحاب آیا تو کیا
تیرے ہی آنکھوں کے آگے میکشی کا لطف تھا　　بعد تیرے بزم میں جام شراب آیا تو کیا
اب بھی آجاتا تو رہ جاتی ہماری زندگی　　بعد مرنے کے اگر خط کا جواب آیا تو کیا

(۶)

تم گھر سے اپنے اے جان نہ نکلے　　حسرت نہ نکلی ارماں نہ نکلے
ڈھونڈھو اگر اس حیرت کدہ میں　　مجھ سا بھی کوئی حیراں نہ نکلے
کچھ پا گیا ہے میری سی خوشبو　　گلشن سے کیوں گل خنداں نہ نکلے
ممکن نہیں ہے اس گھر سے اک دن　　دو چار دن کا مہماں نہ نکلے
دامن چھوڑا کر بولا وہ قاتل　　دیکھو ہمارا داماں نہ نکلے

مانند شمع سوزان محفل　　کس بزم سے ہم گریاں نہ نکلے

(۷)

رُخِ روشن کا جلوہ دکھا دے مجھے　　بت بے مہر حیراں بنا دے مجھے

(۸)

نہیں ہے بے یار لطف ساقی شراب ہم لے کے کیا کریں گے
جگر تلک بھن رہا ہے غم سے کباب ہم لے کے کیا کریں گے
وحید ہم کو ذلیل وابستہ کہیں نہ اہل سخن تو بہتر
ہمیں تو ہے ننگ نام سے بھی خطاب ہم لے کے کیا کریں گے

اکبر کے اشغال زندگی ۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۹ء تک

نوکریاں۔ وکالت۔ مشاعرے

اشغال زندگی میں سب سے پہلے میں نے نوکریوں کو لیا ہے۔ ان کے ذاتی حالات کا ذکر منظور نہیں۔ محض اخلاقی اور ذہنی کیفیات کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جمنا مشن میں انھوں نے انگریزی کی دو چار کتابیں پڑھ لی تھیں جی نہیں لگا۔ یا کچھ وجوہ ایسے ہوئے کہ ترک تعلیم کر دیا۔ جمنا مشن اسکول کے پاس دریائے جمنا پر پل بن رہا تھا یہ پل دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ کچھ پہلے کچھ بعد کو بنایا گیا اور بہت مضبوط بنایا گیا ہے، ای۔ آئی۔ آر نے بنوایا تھا۔ نیچے کے ایک حصّہ پر نینی کی طرف سے آمدورفت محض پا پیادہ حضرات کی ہوتی ہے دوسرے حصّہ سے بیل گاڑیاں۔ یکہ۔ بگھی سب آتے جاتے ہیں۔ لداوکے اوپر سے دونوں حصّوں پر ریل آتی جاتی رہتی ہے۔ پتھر مرزا پور سے آتے تھے جن کی پیمایش ان کے سپرد تھی۔

۲۔ جمنا برج سے گھبرا کر چلے تو الٰہ آباد کے اسٹیشن پر ریلوے مالگدام میں بیس ۲۰ روپیہ پر نوکر ہوئے اس زمانہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔

۳۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس نوکری سے بھی جی اُکتا گیا۔ آخر سال میں چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو گئے۔ اب فکر ہوئی کہ کچہری میں کوئی جگہ تلاش کرنی چاہئے۔

اکبر نے ایک عرضی لکھی اور سوال خوانی کے وقت پیشکار کو اور عرضیوں کے ساتھ دیدیا، تاریخ حاضری کے دن جب گئے تو کلکٹر صاحب نے صورت دیکھتے ہی پہچان لیا اس لئے کہ اس وقت ۱۳ برس کا سن تھا سب سے نوعمر تھے مسکرائے اور کہنے لگے اس بچہ نے ایک ذرا سا پرچہ لکھ کر دیدیا وہ ان پوری پوری عرضیوں میں کھو گیا ہے۔ ہم مجبور ہیں کیا کریں۔ لسان العصر چپکے وہاں سے واپس ہوئے۔ نجانے انھوں نے کچھ چھیڑا یا صاحب کے بلڈاگ نے آپ ہی آپ ان کو دوڑا لیا، پاس ہی ایک درخت تھا اکبر جھٹ سے اوپر چڑھ گئے مگر کتا ہے کہ تنے

کے پاس بھونکتا جار ہا ہے۔ صاحب کے بہرے نے آکر کُتّے کو چپ کیا مگر اکبر صاحب ہیں کہ نہیں اُترتے "تم جب تک اس بدتمیز کو باندھو گے نہیں اور سزا نہ دو گے میں نیچے نہ اُتروں گا۔ یہاں تک شور ہوا کہ صاحب خود نکل آئے میم صاحب بھی آئیں ہجوم ہو گیا۔ سب اکبر کی طفلی اور صاف گوئی پر ہنستے رہے آخر کُتّا باندھا گیا صاحب نے خود اطمینان دلایا تب درخت سے اُترے۔ اس لطیفے سے کم سنی، صاف گوئی، عزم اور استقلال کے سبق حاصل ہوتے ہیں۔

بہرطور آپ گھر تشریف لائے اور بجائے اس کے کہ شکستہ دل ہو کر بیٹھ جاتے۔ بانس کے کاغذ کا ایک بہت بڑا تاؤ بازار سے خریدا اتنا بڑا جتنا مدرسوں میں ہندوستان کے نقشہ کا کاغذ ہوتا ہے ایک مشک بید خریدا بہت موٹا سا قط لگا لیا اور اُنگلی اُنگلی بھر کے موٹے موٹے حروف سے عرضی لکھی اور کاغذ کا پلندا تیار کر لیا۔

دوسرے روز سوال خوانی کے وقت پہنچ کر بلا کسی کے توسط کے پوری عرضی صاحب کے میز پر پھیلا دی عرضی نے پوری میز ڈھانک لی بلکہ کچھ کاغذ اِدھر اُدھر بھی لٹکتا رہ گیا۔ ابھی بات تازہ تھی صاحب کو "ایک ذرا سا پرچہ" والا قصہ یاد تھا بہت ہنسے اور اسی وقت نقل نویس مقرر کر دیا۔ اپنی کمسنی اور لطائف متذکرہ کی وجہ سے صاحب کی نظر عنایت ان کی طرف رہتی تھی۔ جب انھوں نے بات چیت سے دیکھا کہ اکبر نہایت سنجیدہ اور قابل ہیں اور اطلاعنامے پروانے، حکم احکام سب بے تکلف، قلم برداشتہ لکھ سکتے ہیں تو صاحب نے کہا انگریزی کی قابلیت بڑھاؤ اور نائب تحصیلداری کے لئے تیاریاں کرو۔

وکالت

دو برس کے بعد صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور اکبر نے بھی نوکری چھوڑ دی سنہ ۱۸۶۶ء کے قریب خیال آیا کہ وکالت کا امتحان دیدو اُس زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ وکالت کا امتحان جو درجہ اوّل میں پاس کرتا تھا اُس کو ہائی کورٹ کی اجازت ملتی تھی جو درجہ دوئم پاس کرتا وہ سشن جج تک کے مقدمات لے سکتا تھا اور جو تیسرے درجہ میں کامیاب ہوتا تھا وہ صرف وکیل منصفی ہوتا تھا۔

اکبر کی انگریزی تعلیم بہت معمولی ہوئی تھی۔ چند ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں اور وکالت کے امتحان میں تعزیرات ہند اور قانون شہادت ایسی مشکل کتابیں داخل تھیں جن پر اس وقت تک صدہا شرحیں لکھی گئی ہیں اور ۔بی۔ اے تک پڑھنے کے بعد اُن کتابوں کے سبق وکالت کے درجوں میں دو برس تک ہوتے رہتے ہیں۔ بہرکیف ایک روز اکبر اپنے ایک معزز رشتہ دار سراج الدین حیدر صاحب ملے اور کہا' حضور آپ مجھے تعزیرات ہند اور قانون شہادت شام کو دیدیا کیجئے میں صبح کو واپس کر دیا کروں گا۔

سراج صاحب واقف تھے پوچھا بھائی کیا کرو گے۔ کہا کچھ نہیں دیکھوں گا۔ اس میں کیا لکھا ہے۔ اِس پر سراج صاحب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی کہنے لگے اِس خبط کو جانے دو اس کی عبارت مشکل ہے اور معانی بہت زیادہ پیچیدہ ہیں آخر اکبر کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے دونوں کتابیں دیدیں۔ صبح کو اکبر نے واپس کیں۔ سراج صاحب نے پوچھا کچھ پڑھا کچھ سمجھے، کہنے لگے ہاں پچاس پچاس صفحات پڑھے۔ سمجھ میں تو آتی ہے آپ کہیں سے کچھ پوچھئے تو معلوم ہو کہ واقعی میں سمجھا ہوں یا نہیں۔

سراج صاحب نے کتاب کھولی پہلی دفعہ جس دفعہ پر نظر پڑی پوچھ لیا۔ اکبر نے اس دفعہ کی پوری پوری عبارت معہ علامات کے بتادی اور اس کا ترجمہ بھی کر دیا۔ سراج صاحب دنگ رہ گئے اور واقعی ہزار دو ہزار میں اِس ذکاوت، یادداشت اور حافظہ کا آدمی ایک دو سے زیادہ نہیں نکلتا۔

وکالت کے امتحان میں ایک مجسٹریٹ بھی شامل تھے۔ انھوں نے اکبر کی قابل رشک ذہانت اور معلومات کثیرہ سے متاثر ہوکر ضلع کے کلکٹر سے گفتگو کی۔ کلکٹر نے اکبر حسین کو بلواکر خود بات چیت کی تو جو کچھ سنا تھا مخاطب کو اس سے کہیں زیادہ پایا۔ فوراً بارہ کی تحصیلداری میں بھیجدیا مگر دیہات میں یہ شعر و سخن کے چرچے تھے نہ دوست احباب کی مجلسیں تھیں سال ہی دو سال میں طبیعت اُکتا گئی۔ خود فرماتے ہیں :-

نہ پروانہ سے محفل اور نہ بلبل سے چمن چھوٹا ۔۔۔ مجھی سے جلسہ رنگیں یاران وطن چھوٹا

روز روز چھٹیاں لینے پر تحصیل والوں کے تیور بگڑے استعفا دے کر گھر چلے آئے۔

۱۸۷۰ء میں اپنے ایک عزیز کی تحریک سے جو ہائی کورٹ میں رجسٹرار تھے لسان العصر مثل خواں مقرر ہو گئے مگر اس دوران میں بھی کبھی مطالعہ سے وہ غافل نہیں رہے۔ ۱۸۷۳ء مثل مشہور ہے کہ کرتے کی بدیا' ہائیکورٹ کی مثل خوانی کے سلسلہ میں ذہن و ذکاوت کے فیض سے قانون دانی اور انگریزی ایسی بڑھ گئی کہ انھوں نے ہائیکورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ سات برس تک الہ آباد۔ گونڈہ اور گورکھپور اور آگرہ میں وکالت کرتے رہے۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں گورکھپور

شعر گوئی کی وکالت میں مجھے فرصت کہاں ۔۔۔ یہ بھی اکبر خاطر احباب گورکھپور ہے

آگرہ ۱۸۸۰ء کلیات اکبر حصہ اول دور اول صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴

تو ہے وہ برق تجلی کہ ترا نقش قدم ۔۔۔ روکش آئینہ مہر جہانتاب ہوا

چشم معنی سے جو کی سیر طلسمات جہاں ۔۔۔ پتا پتا مجھے اک گلشن ایجاد ہوا

قطرے قطرے میں ہوئی وسعت دریا پیدا ۔۔۔ ذرہ ذرہ صفت مہر جہانتاب ہوا

۱۸۸۳ء الہ آباد

کیسی کیسی وہ لگاوٹ کی نظر کرتے ہیں ۔۔۔ دھوکے کھاتا ہے ہمارا دل ناداں کیا کیا

گونڈہ

بڑھا ہے خرچ اس قدر ہمارا کہ ہیں ہمارے حواس غائب ۔۔۔ جو بیس آئے تو بیس غائب پچاس آئے پچاس غائب

آگرہ کے متعلق دو لطیفے صفحہ ۲۵۵ حصہ اوّل

شو میکری شروع جو کی اک عزیز نے ۔۔۔ جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے

پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی ۔۔۔ مورث تمہارے آئے تھے غزنین و غور سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات نوک کی ۔۔۔ روٹی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

دوسرا لطیفہ

صبا صاحب ایک درویش صفت مگر با مذاق شاعر تھے۔ اکبر کے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ ایک دن اکبر نے کہا بھائی صاحب نماز عشا محلہ کی مسجد میں پڑھ لیا کیجئے میں بھی آجایا کروں گا اُس کے بعد دونوں اُٹھ کر گھر چلے آئیں گے ذرا لطف صحبت رہے گا۔ صبح کو صبا صاحب آئے تو کہنے لگے بندہ نواز معاف کیجئے گا میں شب کو حاضر نہ ہو سکا بات یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوا تو لق ودق عمارت بھائیں بھائیں کر رہی ہے۔ وہ سناٹا وہ وحشت وہ ویرانی تھی کہ توبہ توبہ۔ اکبر صاحب ایک ذرا خاموش ہو گئے۔ مسکرائے اور اُسی وقت ایک شعر کہہ دیا:۔

شیخ جی رات کو مسجد میں نہیں جاتے ہیں ۔۔۔ یعنی ڈرتے ہیں کہ بیٹھا کہیں اللہ نہو

ایک تو شیخ جی کی پھبتی صبا صاحب پر بھی خوب دوسرے کہیں اللہ نہو کے پردہ میں صبا صاحب کو کیا معقول جواب دیا ہے۔ وکالت ہی کے دوران میں اِن کے منشی صاحب کو وکالت منصفی پاس کرنے کا خبط ہوا اور حالت یہ تھی کہ "گردگاں برگنبد" کا معاملہ تھا۔ تمام نصاب ختم کر چکے تو اکبر صاحب کے پاس ایک دن حاضر ہوئے اور کہنے لگے حضور جہاں سے چاہیں امتحان لے لیں۔ اکبر کی فطرت میں خوش دلی کا عنصر غالب ترین تھا ایک ذرا سے سکوت کے بعد پوچھا بھائی اگر کوئی کسی کے منہ میں زبردستی اپنا ہاتھ ٹھوس دے تو کون سی دفعہ کا مجرم ہوا۔ منشی جی نے فوراً جواب دیا "حضور یہ تو مداخلت بیجا بخانہ دیگر" ہے۔ مسکرا کر چپ ہو رہے۔

مشاعرے

دریاآباد (الآباد) میں مشاعرے کے اکھاڑے ہوتے تھے جن میں ایک طرف توناسخ کے شاگرد دوسری طرف قلق کے تلامذہ۔ ایک طرف منشی میر ورد کے شاگرد اور دوسری طرف وحید اور ان کے شاگردوں کا مجمع ہوتا تھا۔ آپس میں خوب چشمکیں ہوتی تھیں۔ حکیم فضل حسین صاحب فروغ قلق کے بھانجے اور شاگرد بھی رہتے تھے۔

لسان العصر بھی ان مشاعروں میں اس طور پر شریک ہوتے تھے کہ سر پر سپاہیانہ صافہ بندھا ہوا۔ بدن میں گہرے رنگ کا قمیص آب رواں یا اور کسی ہلکے کپڑے کی چکن سے جھلکتا ہوا ڈاب میں تلوار لگی ہوئی، خواجہ آتش کی پیروی تھی۔

امتحانی طرحیں تقسیم ہوتی تھیں۔

ایک مرتبہ مشاعرے سے صرف ایک دن پہلے شام کے وقت وحید صاحب گھبرائے ہوئے بیٹھے تھے اکبر پہنچ گئے پوچھا حضور مزاج کیسا ہے۔ وحید صاحب نے کہا بھئی کیا کہوں لوگوں نے میری آبرو لینے کے لئے کل جلسۂ مشاعرہ میں بلایا ہے اور ابھی ابھی مصرعہ طرح بھیجا ہے

مائل ہوں، قائل ہوں ؎ ازل سے کشتۂ تیغ نگاہ ناز قائل ہوں۔

عرض کیا حضور تردد کیسا پہاڑ ایسی رات باقی ہے فکر کیجئے میں تو ساری رات جاگوں گا کچھ شعر ہو ہی جائیں گے۔ غرض دوسرے روز خوب تیار ہو کر پہنچے۔ وحید صاحب نے بھی غزل پڑھی۔ اکبر نے بھی معرکۃ الآرا غزلیں پڑھیں۔ سہ غزلہ کہا تھا۔ ۲، ۷ شعر ایک سے ایک اچھے نکالے تھے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۲۸، ۱۲۹ و ۱۳۰ و ۱۳۱۔ کلیات حصہ اوّل

خودی بھی مجھ سے جب واقف نہ تھی میں تب سے بسمل ہوں
ازل سے کشتۂ تیغ نگاہ ناز قائل ہوں

نمونہ کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

زمین شعر جس سے آسماں بن جائے اے اکبر
علوئے طبع سے ایسی غزل پڑھنے پہ مائل ہوں

جو لذت آشنائے دردِ الفت ہے میں وہ دل ہوں
اجل جس کو قیامت تک آئے گی وہ بسمل ہوں

اجل سے پوچھتا ہے ہر نفس جو باہر آتا ہے
اجازت ہو اگر تیری تو پھر سینہ میں داخل ہوں

در گنجینۂ اسرار معنی کھول دو اکبر — بس اب پیرِ خرد اقرار کرتا ہے کہ جاہل ہوں
کہیں دل ہوں کہیں میں باعث بے تابی دل ہوں — کہیں انداز بسمل ہوں کہیں میں ناز قاتل ہوں
یہ دریائے معانی جوش پر ہے دل میں اے اکبر — مگر ساکت ہوں جبتک آپ میں آنے کے قابل ہوں

اُس دن مشاعرے میں طوطی بول گیا مگر حکیم فضل حسین صاحب فروغ ایک مرد بزرگ تھے قلق کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ وہ اکبر کی تعریف اس انداز سے کرتے رہے کہ ہر اچھے شعر پر وحید صاحب کی طرف مخاطب ہوکر داد دیتے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ آپ ہی نے یہ شعر کہکر دیدے ہیں۔ منشی منیر کے ایک شاگرد نیّر تخلص کرتے تھے وہ غالبًا جولاہے یا کنجڑے تھے اُنھوں نے بھی فروغ صاحب کی دیکھا دیکھی وہی رنگ اختیار کیا کہ وحید صاحب کو مخاطب کر کے شعر کی داد دینے لگے۔

آپس میں چشمکیں ہوئیں اور طے یہ ہوا کہ اسی وقت مشاعروں میں ایک نئی طرح دی جائے اور دو گھنٹہ میں لوگ شعر کہ کر پڑھیں۔ برہم نہیں ہوتا۔ کم نہیں ہوتا۔ طرح ہوئی۔

لسان العصر نے خوب خوب داد دی نہایت لاجواب غزل پڑھی۔ مطلع میں فروغ اور نیّر دونوں کو لے ڈالا۔

فروغ کم بضاعت رونق عالم نہیں ہوتا — مہ نَو بدر ہو کر نیّرِ اعظم نہیں ہوتا

ایک دوسرے مشاعرے کا ذکر ہے ایک بزرگ صورت شاعر نے ایک شعر پڑھا توسن میں، آہن میں طرح تھی۔

میں راضی قتل پر ہوں گر وہ مجھ کو اس طرح باندھیں — کہ رسّی ہاتھ میں اُن کے ہو پھندا میری گردن میں

لوگوں نے خوب خوب تعریفیں کیں کئی بار یہ شعر پڑھا۔

اکبر نے عرض کی سبحان اللہ کیا شعر فرمایا ہے مگر حضور یہ شعر تو قطعہ بند تھا وہ دوسرا شعر بھی پڑھ دیجئے تو مکمل لطف ہو جائے۔ شاعر نے گھور کر دیکھا کہ ایک بچہ شوخیاں کرتا ہے۔ منہ بنا کر کہنے لگے مجھے تو یاد نہیں۔

اکبر کہنے لگے حضور بھول گئے ہوں گے آپ کی اجازت سے میں پڑھے دیتا ہوں اور بلا انتظار پڑھنے لگے۔

میں راضی قتل پر ہوں گروہ مجھ کو اس طرح باندھیں کہ رسی ہاتھ میں ہو اور پھندا میری گردن میں
مکاں اغیار سے خالی ہو مجمع دوستوں کا ہو کمر سے باندھ کر دامن نچاویں اپنی آنگن میں

مشاعرہ کا مشاعرہ اس جدّت اور زود گوئی پر لوٹ گیا۔ شعر واقعی شاعر کے رنگ میں تھا معشوق پورا مداری بن گیا اور کمی جو رہ گئی تھی پوری ہو گئی۔ شاعر صاحب بہت کھسیانے ہو گئے اور بہت جھیپے

اپنی حیات و کلام کے متعلق خود اکبر کے خیالات

رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۲۳ء صفحہ ۵۵۱ (اکبر کا آخری دور شاعری (عبدالماجد صاحب دریابادی)۔

"حالی نے بھی ایک موقع پر رسمی شاعروں اور مدعیان زباندانی کو مخاطب کرکے جوان کی زبان پر اعتراضات کرتے رہتے تھے ایک قطعہ ارشاد کیا جس کا آخری شعر یہ ہے۔

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے — پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

"وہ خود (لسان العصر) اپنے کلام کو دوسروں کے کلام سے ممتاز پاتے تھے۔ایک جگہ اس فرق کو یوں ظاہر کرتے ہیں۔

میں اپنے آپ میں ان شاعروں میں فرق کرتا ہوں — سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں"

عجیب شعر فرمایا ہے اپنی طرز سخن کے لئے چند لفظوں میں ثابت کردیا ہے کہ:۔

۱۔سب سے جدا روش مرے باغ سخن کی ہے۔ وہ اپنے رنگ کے موجد و آخر ہوئے ہیں اُن کے حیات میں بھی اور بعد حیات بھی لوگوں نے اُن کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی جس میں ڈاکٹر اقبال صاحب بھی تھے مگر سب کے سب ناکام رہے کیوں؟

(۱) اکبر کو جب تمام اصناف سخن اور (زبان) پر قدرت ہو چکی تھی کہنہ مشقی آچکی تھی اس وقت انھوں نے یہ رنگ اختیار کیا۔

(۲) لوگوں نے بعض خصوصیات ظرافت کا خیال نہیں کیا۔

(۳) استقراء نہیں کیا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ:۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲۔آورد و آمد کا فرق دکھادیا ہے

۳۔ملٹن کے نظریہ شعر کو کس خوبی سے ثابت کردیا ہے کہ شاعر کو مجسم شعر ہونا چاہئے۔

۴۔شعر ان کے لئے محض تفریح کی چیز نہ تھی بلکہ ارسطو ایسے فلسفی کے نقطۂ نگاہ سے الفاظ سیرت انسان کا آئینہ ہیں سیرت کی تحریک سے الفاظ درست ہوتے ہیں اور الفاظ کے اثر

سے سیرت درست ہوتی ہے۔

اِس شعر کے لطف و کیفیت سے متاثر ہو کر میری سمجھ میں جو مطالب آئے میں نے لکھ دئے ذرا خود اکبر صاحب کی تشریح معانی ملاحظہ فرمائیے۔ مکاتیب اکبر بنام عزیز لکھنوی صفحہ ۱۸۲ نمبر ۱۸۳۔

آپ کا یہ فرمانا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں۔ مجھ کو جس سبب سے پسند آیا اس کی تفصیل ذرا مشکل ہے۔ میرا مصرعہ شاید آپ کو یاد ہو۔ ع سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں۔

دوسرا پہلو یہ ہے۔ بلبل اگر کہے کہ میں اپنے لئے گاتا ہوں + گراموفون اوروں کے لئے گاتا ہے۔ تقلید ہے تو اس کا کہنا بیجا نہ ہوگا۔

تیسرا پہلو۔ ایک شخص گنگنا رہا ہے، اپنا دل بہلا رہا ہے۔ وہ اپنے لئے گاتا ہے تان سین اکبر کے حضور رس گا رہے ہیں۔ یہ اور کے لئے گاتے ہیں سامع اہل دل کو روکتا نہیں لیکن ہر ایک کو اس کی طلب نہیں ہے

چوتھا پہلو۔ خاکسار ہوں۔ مبتدی ہوں۔ اپنے لئے کہتا ہوں۔ خود ہی کامل نہیں ہوں جب آپ کی طرح کامل ہو جاؤں گا اُس وقت کہدوں گا کہ پبلک کے لئے کہہ رہا ہوں۔ "اگر در خانہ کس است یک حرف بس است"۔

غرور اُنھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر   سوا خدا کے سب اُن کا ہے اور خدا میرا

خواہ سیاسی رنگ میں دیکھئے خواہ عرفان و تصوف کی طرف لے جائیے خواہ صرف عاشقانہ سمجھئے۔ جناب اکبر کا ایک روشن پہلو یعنی خدا پر اعتماد اس شعر سے روشن ہوتا ہے۔

ملا جو خانہ تن خاک میں تو ملنے دو   یہ رنج کیا ہے کہ زندان آب و گل نہ رہا

اِس شعر سے راضی بہ رضا ہونے اور فلسفہ حیات کے متعلق شاعر کے نظریہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے نزدیک موت ایک نعمت ہے جس کی بدولت لطیف روح کو مٹی پانی کے کثیف قید سے رہائی ہوتی ہے اور اسے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ موت پر افسوس کیوں کرتے ہیں اُن کو خوش ہونا چاہئے۔

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی   ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

واقعتاً حضرت اکبر اپنی ساری عمر بے نیاز اغراض رہے۔

جو محفل میں اکبر نے کھولی زباں　　گلستاں میں بلبل چہکنے لگا

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور بیان کرتے ہیں کہ پڑھنا بھی سحر تھا کلام بھی جادو تھا۔

جو شوق مستی ہو دل کے اندر تو آپ سُنئے کلام اکبر　　اگر ہو ذوقِ شراب و ساغر تو سیجئے بزم جم میں آکر

"بزم جم" کی تخصیص سے اپنے کلام کا مرتبہ ظاہر کر دیا ہے۔ طبیعت کا میلان "شوق مستی" سے ظاہر کیا ہے۔

ذی علم مصنّف ہو رہے حامی ملت　　ارماں نہیں ہے کوئی اس ارماں سے بہتر

اس شعر سے صحیح آئیڈیل اور اہم مقصد اصلی اور معیار حیات قائم کر دیا ہے۔

تحیر آپ کی غزلوں پہ آتا ہے مجھے اکبر　　بتوں پہ آپ مرتے ہیں کہ شیطانوں سے لڑتے ہیں

اکبر کی بُرائی اچھائی تو پوچھ محلہ والوں سے　　نظم ان کی سُنی ہے البتہ ہاں شعر تو اچھے کہتے ہیں

جن کو محض اکبر سے بلحاظ شاعر و مصنف کے عقیدت ہے وہ آخری ٹکڑے کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

یار کے دل میں اثر ہو یہ ہے مقصود کلام　　اس کی پرواہ نہیں محفل میں اگر واہ نہو

مصنف کے نزدیک اصلیت کی قدر ہے نمائش ہیچ ہے، اثر کے سامنے واہ کی کوئی قدر نہیں۔

بند کر اپنی زباں ترک سخن کر اکبر　　اب مری بات کی دُنیا کو ضرورت نہ رہی

ذکی الحسی اور زمانہ کی غیر منصفانہ رویہ کی تصویر ہے۔

بار خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد بُرا　　دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی

اس سے مطالعہ فطرت انسانی کا پتہ چلتا ہے۔

کر دیا کنج قناعت میں بسر اکبر نے　　عزت دل تو سلامت رہی دولت نہ سہی

کاش ناظرین بھی "عزت دل" اور دولت کی قیمت کا فرق سمجھ لیں۔

کام کی بات جو کہنی ہو وہ کہہ لو اکبر　　دم میں چھن جائے گی یہ طاقت گویائی بھی

صاف ظاہر ہے کہ حیات کا فرض یہی ہے کہ خلق خدا سے کام کی بات کہی جائے۔

بتخانہ میں کچھ فیض نہ ہوگا تمھیں اکبر   تم یاں بھی بجز ذکر خدا کچھ نہیں کرتے

شوق عبادت اور تغزل کی معنوی خوبیوں کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔

محل شکر ہیں اکبر یہ درفشاں نظمیں   ہر اک زبان کو یہ موتی عطا نہیں ہوتے

فضل خدا کا شامل ہونا نہایت ضروری ہے۔

قلعی بھی ریاکار کی کھلتی رہے اکبر   طعنوں سے مگر طرز مہذب بھی نہ چھوٹے

اپنی تعریضیہ شاعری کی حقیقت بیان کی ہے افسوس ہے کہ عبدالماجد صاحب نے جس وقت بعض مدنی اور سیاسی معاملات میں خموشی یا احتیاط کی بنا پر اکبر کے دامن روشن پر کمزوری اخلاق کا دھبہ لگایا ہے وہاں اس شعر کے لطیف کنایوں سے چشم پوشی کر گئے ہیں اگر طعنے مہذب نہ رہ جائیں تو کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو اُلٹا ہوتا ہے۔

کیا کام چلے ان کی توجہ نہیں اکبر   اب کہئے خوشامد کی تو وہ کی نہیں جاتی

مرحوم کو عمر بھر خوشامد سے نفرت رہی۔

نظم اکبر سے بلاغت سیکھ لیں ارباب عشق   اصطلاحات جنوں میں بے بہا فرہنگ ہے

جو لوگ محض سطحی معنوں پر جاتے ہیں اُن کو تنبیہ ہے۔

ہو دعوی توحید مبارک تمھیں اکبر   ثابت بھی کرو اس کو مگر طرز عمل سے

اپنی عملی زندگی کا پہلو دکھایا گیا ہے۔ مرحوم نماز روزہ اور تلاوت کے عمر بھر پابند رہے (خطوط و مکاتیب ملاحظہ ہوں)

پند اکبر کو دیں گے کیا ناصح   گُل کو کیا باغبان سنواریں گے

اکبر خود اپنی خوبیوں سے کافی باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ جو چیز حسین اور مکمل ہے اُس میں کسی طرح کی زیادتی ہو ہی نہیں سکتی اس لئے کہ زیادتی ہمیشہ کمی کا حال بتاتی ہے جو دلیل نقص ہے۔

وہ رنگ بزم اکبر اب کہاں بہتر ہے اُٹھ جاؤ   یہی بس ایک تدبیر سکون جان محزوں ہے

انقلاب آسماں دکھایا گیا ہے۔

فتنے مسجد میں اُٹھے ہیں اکبر   دیر میں بیٹھ ترک دیں کر کے

ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خانہ جنگیوں کی طرف اشارہ ہو یا ترکستان کے انقلاب کی طرف

ان بتان بیوفا کے حسن کا دلدادہ ہے   فکر ہے اکبر کی رنگین دل نہایت سادہ ہے

کلام وحیات کا مکمل تبصرہ ہے۔

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترک سخن   خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

شعر گوئی ترک کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے بے بنیاد شہادت پر حکم ہوا تھا۔ دوسرے مصرعہ سے اپنے حیات و کلام کی یکدلی دکھائی ہے۔

گذر چکا ہے مرا کام ضبط سے اکبر   میں راز عشق اب اپنا چھپا نہیں سکتا

عرفاں کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں جب خموشی ہو ہی نہیں سکتی۔ بے چینی کی کیفیت کو کیسے عمدہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

وہ چشم ہوں کہ جو ہے محو جلوہ توحید   وہ دل ہوں جس میں تجلی ہے نور عرفاں کی

اکبر کی پوری سرگذشت اسی ایک شعر میں مضمر ہے۔

وہ بات ہوں کہ جو لاتی ہے جوش میں دل کو   وہ حال ہوں جسے سُن سن کے وجد آتا ہے

کیونکر نہ شعر اکبر آئے پسند سب کو   یہ رنگ ہی نیا ہے کوچہ ہی دوسرا ہے

"سخن سے میں سنورتا ہوں" کی مزید تشریح ہے۔

جدت ہو فکر میں تو توارد کبھی نہ ہو   مضمون کیوں لڑیں جو طبیعت لڑی رہی

احتیاط، فکر، اختراع سب کچھ ایک ہی شعر سے ظاہر کر دیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اکبر کے یہاں توارد کالعدم ہیں۔

حشر تک اب ہاتھ آنے کے نہیں مضمون حشر   تم نے اے اکبر کوئی پہلو نہ چھوڑا حشر کا

نمونہ حشر کا اور وہ بھی حشر کا اس زمین میں اکبر نے ۱۸ شعر کی غزل کہی ہے جس کا مقطع یہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر کلام میں کس قدر محنت کرتے تھے۔

رہی ہر کام میں ہر وقت مسبب پہ نگاہ   اپنا منظر نہ کبھی عالم اسباب ہوا

خطوط مطبوعہ سے بھی اس عقیدہ کا پتہ چلتا ہے۔

وہ گل رنگیں ہوں میں پیدا ہے جس سے رنگ یار　　رنگ وہ ہوں جس میں پنہاں ہو گئی ہے بوے دوست
میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سراے دہر میں　　جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس روے دوست

معرا ہوں ہنر سے میں سراپا عیب ہوں اکبر　　عنایت ہے احبا کی اگر اچھا سمجھتے ہیں

انکساری کا کتنا لطیف اظہار ہے۔

نخل حسرت وہ ہوں میں جس کو ہیں یکساں چار فصل　　وہ شجر ہوں باغ عالم میں جو پھلتا ہی نہیں
وہ تمنا ہوں جو رہتی ہے ہمیشہ جی کے ساتھ　　حوصلہ وہ ہوں جو دنیا میں نکلتا ہی نہیں
رنگ وہ ہوں جو زمانے کے ہے باہر رنگ سے　　وہ زمانہ ہوں جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں
شوق وہ ہوں وسعت دل جس کے آگے تنگ ہے　　حرف مطلب وہ ہوں جو منہ سے نکلتا ہی نہیں
دل وہ ہوں جس میں چبھے ہیں خار حسرت سیکڑوں　　خار حسرت وہ ہوں جو دل سے نکلتا ہی نہیں
نقد سودا وہ ہوں جو رائج نہیں بازار میں　　سکہ داغ جنوں وہ ہوں جو چلتا ہی نہیں

اِن اشعار میں یاس و حسرت سے قطع نظر "زمانہ" ہیں اور "اپنے" میں جو فرق محسوس کرتے تھے اُس کو ظاہر کر دیا ہے۔

ہجوم آہ سوزاں سے خیال روے تاباں سے　　فروغ بزم ماتم ہوں چراغ خانۂ دل ہوں
حجاب روے قاتل سے غم ناکامی دل سے　　نگاہ چشم حسرت ہوں شہید ناز قاتل ہوں
ہواے باغ عالم سے جفاے خنجر غم سے　　بقاے رنگ عشرت ہوں وفاے روح بسمل ہوں
وفور شوق ماتم سے صداے نالۂ غم سے　　شریک حال حسرت ہوں شکست شیشۂ دل ہوں
بلاے یاد گیسو سے خیال تیغ ابرو سے　　ظہور جوش سودا ہوں گواہ حال بسمل ہوں
لب پیمانۂ دل سے وفور شوق کامل سے　　حریص لذت غم ہوں لب اظہار سائل ہوں
خیال حسن صورت سے ہجوم درد الفت سے　　ہماے اوج معنی ہوں نشان عشق کامل ہوں
علوے جوش مستی سے صفاے طبع عالی سے　　فداے فکر اکبر ہوں نثار شعر مشکل ہوں

کہیں دل ہوں کہیں میں باعث بیتابی دل ہوں　　کہیں انداز بسمل ہوں کہیں میں ناز قاتل ہوں
کہیں تمکین خوبی ہوں کہیں بیگانۂ الفت　　کہیں رنگ رخ گل ہوں کہیں شور عنادل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش ‏ کہیں مجبور مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں
کہیں ہوں گوہر مقصد کہیں دامن تمنّا کا ‏ کہیں ہمت کریموں کی کہیں امید سائل ہوں
کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا ‏ روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں
یہ دریائے معانی جوش پر ہے دل میں اے اکبر ‏ مگر ساکت ہوں جب تک آپ میں آنے کے قابل ہوں

اِن اشعار کے مطالب حیطۂ بیان میں نہیں آسکتے۔ ذوقِ سلیم بلا واسطہ لطف اندوز ہوتا ہے۔

کیا کرتا ہوں موزوں وصف انکے روئے روشن کا ‏ مرا ہر شعر اکبر نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

کیا اچھی دلیل پیدا کی ہے حسن کا حقیقی معیار ہمیشہ لفظوں کی سطح سے کہیں بلند ہوا کرتا ہے۔

فکرِ اکبر گل مضموں کا دکھا کر جلوہ ‏ محفلِ شعر میں رنگ اپنا دکھا دیتی ہے

اکبر کے لئے الفاظ محض لباس ہیں اصل شئے خیال و مضمون ہے۔

ڈال دے جان معانی میں وہ اُردو یہ ہے ‏ کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے

اپنی زبان کے متعلق ارشاد ہے۔

جناب اکبر سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے ‏ اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

اپنی فطری احتیاط کا اعلان ہے اور اِس بات کی ندامت بھی ہے کہ ہر بات کا ایک محل ہوا کرتا ہے۔ حکومت کے محکمۂ "خفیہ" کے ارکین کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر ‏ مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

واقعہ بھی یہی ہے کہ اکبر کا مفہوم صاحب نظر سے کبھی پوشیدہ نہیں رہتا۔

میں نے کہا اکبر میں کوئی رنگ نہیں ہے ‏ کہنے لگے شعر اس کے جو سُن لو تو پھڑک جاؤ

نکتہ چینیوں کا جواب ہے۔

بعد پنشن کے تصنع سے مجھے ساز نہیں ‏ ہوں جو بے شغل تو اکبر یہ کوئی راز نہیں

۱۹۰۳ء کے بعد کی زندگی کا مرقع ہے۔ تصنع اور نمائش سے ہمیشہ احتراز فرماتے تھے۔

سخن شناس سے میں چاہتا ہوں دادِ سخن ‏ خوشی کے واسطے کافی ہے مجھ کو واہ فقط

اگرچہ مضمون نیا نہیں مگر ایجاد سے دوسرا پہلو بھی نکل آتا ہے یعنی سخن شناس کی واہ کافی ہے۔

اور ناشناس کی داد خواہ جواہر کے ساتھ ہو یا نہایت جوش وخروش سے ہو کافی نہیں۔ صائب۔

صائب دو چیز می شکنند قدر شعر را تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

رقیبوں نے بہت نظمیں پڑھیں اور درفشانی کی میں اشک آنکھوں میں بھر لایا بلاغت اس کو کہتے ہیں

اگر زبانی دعوے جذبات سے خالی ہوں تو بیکار ہیں۔

مرے ساز سخن سے پست فطرت کو تنغص ہے پیا نو بے سرا سمجھا گیا بزم شغالاں میں

کیا اچھی تعریض ہے۔ وجہ کیسی معقول ہے۔

فتوائے کفر دینا واعظ کی بے حسی ہے یہ عشق بت نہیں ہے اکبر کی پالیسی ہے

اپنی احتیاط کے اصلی مقصد کو دکھایا ہے۔

تیغ سید سے تو خالی نہیں ذکر شاعر ذات سے ان کی مخاطب نہیں فکر شاعر

میں خود حیران تھا کہ آخر اکبر صاحب اپنے اشعار میں بدھو، وفاتی، جمن، سید وغیرہ کثرت سے کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اس شعر سے میری تشفی ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ مشاہدہ کے وقت انفرادی واقعات سے اثر ضرور لیتے ہیں مگر استقراء کر کے محض اصول کو نظم میں پیش کرتے ہیں چونکہ اصول بنفسہ بہت لطیف ہوتا ہے لہذا مجسم شکل کشی یا نقش نگاری کے لئے انھوں نے ہر قسم کے گروہ کے لئے ایک نمایندہ مقرر کر لیا ہے۔

باقی نہیں رہی اب دنیا سے گرم جوشی اب میں ہوں اور عزلت اور عالم خموشی

ہاشم مرحوم اور اکبری بیگم کی موت کے بعد یہی عالم ہو گیا تھا۔

خدا کے واسطے اکبر کوئی ذکر اور ہی چھیڑو سنی باتوں کا کیا سننا کہی باتوں کا کیا کہنا

جدت اور ندرت خیال کی طرف اشارہ ہے۔

صاحب کی سی محفل تو میسر نہیں لیکن صد شکر کہ اکبر کے بھی احباب بہت ہیں

اپنی ہر دلعزیزی اور کثیر الاحبابی کا ذکر ہے۔

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ ہیں یکساں لبوں پر مرے موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونوں

مجھی الفت ہے سنی سے بھی شیعہ سے بھی یاری ہے اکھاڑے میں دکھا سکتے ہیں دلکش بانکپن دونوں

مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی — تبرّک ہے مرے نزدیک پرشاد اور مٹن دونوں

اپنی مذہبی بے تعصبی اور معاشرتی رواداری کی تصویریں کھینچی ہیں۔

بزم اکبر دانش آموز و نشاط انگیز ہے — ہر سخن اس کا لطیف و خوب و معنی خیز ہے

بالارادہ اس سے جو کرتا ہے اعراض و گریز — ناتواں ہیں وہ ہے یا کودن ہے یا انگیز ہے

روشنی جن میں نئی ہے وہ مری سنتے نہیں — لاکھ سمجھاؤ کہ صاحب ہے یہ فانی روشنی

انجم و شمس و قمر لیکن ہیں مرے ہم طریق — وضع پر قائم ہیں ان میں ہے پرانی روشنی

اپنے رکھ رکھاو اور وضعداری کا ذکر ہے۔

نظم اکبر ہے دافع جادو و کفر — ماشاء اللہ شاعری ہے تو یہ ہے

اپنے کلام کا اثر اور اس میں اصلاح دل و دماغ کا جو جوہر موجود ہے اُس کا اظہار کیا ہے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

رقیب اور اس زمانہ نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ ذکر حق سے اکبر بہت کم غافل رہتے تھے۔

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں — اور تیرے بیان کی دلاویزی میں

شیطان عربی سے ہند میں ہے بے خوف — لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

بیان کی دلکشی اور موہنی ظاہر ہے۔ مغربی تمدن کا اثر ہندوستان پر دکھایا گیا ہے۔

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے — دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

قوم پرستی کو اکبر نے فرائض زندگی اور حاصل شاعری قرار دیا تھا۔

واہ اکبر بس مقیم کول ہو کر رہ گئے — خود فروشی کی نہیں انمول ہو کر رہ گئے

اکبر کی طرز زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔

راحت جان ہے میری نظم دلاویز اکبر — تندرستی رہے ایمان رہے جان رہے

واقعی کلام کی سیر سے روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ سکون ملتا ہے۔ دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھلتی ہے۔ یاس امید سے اور حسرت ولولہ سے بدل جاتی ہے۔

کلیات حصۂ دوئم

غم دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا

مئے تصوف اور میخانہ عرفاں کی بے خودی کس مزے سے بیان کی ہے۔ غالب کے شعر کے ساتھ پڑھئے تو پورا لطف آجائے۔

غالب ؎ یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

عشق کے فن میں ہے اکبر کا بھی درجہ عالی عیب کچھ اس میں نہیں ضبط نہ کرنے کے سوا

عرفاں کی بلند منزلوں پر پہنچ چکے ہیں۔ بعض جگہ نکات تصوف جو بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں اُن کو اپنی لغزش سمجھتے ہیں۔

سانس لینے میں بھی اے اکبر کرو اب احتیاط موقع فریاد و آہ بے تامل ہو چکا

حافظ شیرازی کے اشعار کی طرح سیاسی، مدنی، ملکی، عرفانی، مجازی، حقیقی جس رنگ میں چاہئے اس شعر کو سمجھئے ہر طرح مطلب حاصل ہے یعنی فطری احتیاط اکبر میں بہت تھی جس کو خود مرحوم نے حسن نظامی کے پاس جو خطوط بھیجے ہیں ان میں اپنی حد اعتدال سے بڑھی ہوئی احتیاط کو 'وہم' کے نام سے یاد کیا ہے۔

اُن کے پرچے کے لئے اکبر نے کہدی یہ غزل شکر ہے اترا تقاضا حضرت آزاد کا

آزاد سے غالباً ابوالکلام ازاد کی ذات مراد ہے۔ اس تقاضہ اُترنے کی تائید مرحوم کے خطوط سے بھی ہوتی ہے اکثر مدیران اخبار و رسائل کے تقاضوں سے پریشان ہو جاتے تھے۔

شعر غیروں کے اسے مطلق نہیں آئے پسند حضرت اکبر کو بالاخر طلب کرنا پڑا

اِس جگہ اپنے اور دوسرے میں فرق دکھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کردی ہے کہ

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

٭٭٭٭٭

اکبر تری باتیں کبھی ہوتی ہیں نہیں ختم   کیا حال ہے تیرا کہ بیاں ہو نہیں سکتا
اپنی پر گوئی کے لئے کیسا اچھا پہلو تلاش کیا ہے۔

اس میں بُرائی کیا تھی جو میں نے   احیاے رسم دیرینہ چاہا
وہ رسوم قدیم کو از سر نو زندہ کرنا چاہتے تھے

وہاں الفاظ حضر رہیں یاں معنی ہے منزل پر   زباں کا ان کو دعویٰ ہے تو مجھ کو ناز ہے دل پر
بعض حضرات جو زبان کو اس لئے اہم نہیں سمجھتے کہ وہ اداے خیال کا ذریعہ ہے بلکہ الفاظ کو معانی پر قربان کر دیا کرتے ہیں اور زباندانی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے لئے یہ شعر تازیانہ عبرت ہے۔

کیا کام چلے کیا بات بنے کیا رنگ جمے کون اس کی سُنے   ہے اکبر بیکس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف
گوشہاے "ناشنو" کی شکایت ہے۔

کہتے ہیں دوست اکبر کو دیکھ کر بحسرت   ہے اس کا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک
لوگوں کو مرحوم سے جو الفت و ارادت تھی اور اُن کی نگاہوں میں جو عزت و مرتبت تھی یہ شعر اس کا ترجمان ہے۔

قابل قدر طبیعت ہے ہماری اکبر   ہیں مصیبت میں اور اللہ سے خوش رہتے ہیں
جو لوگ مجبوری کا نام صبر رکھتے ہیں اُن کو ہدایت ہے کہ صبر ہنسی خوشی راضی برضا ہونے کا نام ہے۔

اگر ڈھونڈھو تو اکبر میں بھی پاؤ گے ہنر کوئی   اگر چاہوں نکالو عیب تم اچھے سے اچھے میں
فطرت انسانی کا قاعدہ ہے کہ خود حضرت انسان جب کبھی بُرائیاں نکالنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو اُن کی نگاہ میں کسی میں کوئی اچھائی نظر ہی نہیں آتی۔

اس وقت نظم اکبر فطرت سے ہے قریں تر   الفاظ ہیں محل پر معنی مکان پر ہیں
محل پر کے معنی "موقع، محل کے ہیں۔ مکان پر کے معنی بلند درجات پر کے ہیں۔ اکبر نے کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری غیر فطری نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم گیر اثر ہوتا ہے۔

اُمید ہے دعا کی اہل سخن سے اکبر　　میرے حقوق بھی کچھ اُردو زبان پر ہیں

کس مزے سے کہا ہے حقوق کیا احسانات ہیں۔ دیکھیئے اب اہل سخن کیا قدر کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ تمھیں ہو جو کچھ ہو اے اکبر　　ہم اپنے دل میں ہیں کہتے ہمیں تو کچھ بھی نہیں

سعدی کے اس شعر کے ساتھ پڑھئے ؎

آنکس کہ بداند و نداند کہ بداند　　اسپ طرب خویش بافلاک رساند

مرے الفاظ کا رنگ آج مشتاق سخن دیکھیں　　یہ شیشے بادہ مضموں کے کتنے تیز اُترے ہیں

صرف آج ہی نہیں ہمیشہ ایسے ہی تیز اُترتے ہیں۔

جنگ جوئی فصحا رکھ نہیں سکتے جائز　　ان کی خواہش ہے کہ لفظوں کی بھی تکرار نہو

آپ اکبر کے یہاں کبھی تکرار لفظی نہ پائیں گے۔

قیمت دل تو گھٹانے کا نہیں میں اکبر　　بے بصیرت نہیں جوان کا خریدار نہو

بعض لوگ طلب دولت میں اپنا ادبی معیار گھٹا دیتے ہیں۔ اکبر کو یہ طریقہ ناپسند ہے

ہنگامہ جہاں سے آزردہ ہو گئے اکبر　　گوشہ میں جا کے بیٹھو اور جام لو سبو لو

آخر عمر میں عزلت نشینی ہو گئی تھی۔

دوست کہتے ہیں تغزل نہیں تجھ میں اکبر　　دل لگانا ہی پڑا اب بت گمراہ کے ساتھ

اکثر حضرات کا اور خصوصاً الہ آباد والوں کا اعتراض ہے کہ اکبر کی غزلیں بہت پھیکی ہیں یعنی اُن میں حسن و عشق، دیر و حرم کی وہ چاشنی اور گرما گرمی نہیں جو اوروں کے کلام میں ہے کیا اچھا جواب دیا ہے ایک گمراہ کے لفظ سے خاموش کر دیا ہے

مست ہے نغمۂ بلبل سے چمن میں اکبر　　آپ محفل میں سُنیں راگ مزامیر کے ساتھ

فطری اور مصنوعی موسیقی کا فرق دکھایا ہے اور فطرت پرستی کی نقاب کا ایک گوشہ الٹ دیا ہے

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر　　ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

کیا ہوا کوئی جو اکبر کا ہم آہنگ نہیں　　باغ میں نغمہ بلبل بھی نہیں ساز کے ساتھ

گلستان سخن ہے بزم ساقی فیض معنی سے　　زبان خامہ اکبر ہے یا منقار بلبل ہے

ترے بعد اکبر کہاں ایسی نظمیں — وہ دل ہی نہ ہوں گے کہ یہ آہ نکلے

کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں۔

ہر عمل تیرا ہے اکبر تابع عزم حریف — جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہئے

اپنی احتیاط کی وجہ بتاتے ہیں۔ "دیوار ہم گوش دارد"

جامہ زیبوں کی نظر بھی دلق اکبر پر پڑی — شان ہی کچھ اور تھی اس خرقہ پارینہ کی

ملک کے صاحب نظروں نے جب اکبر کو لسان العصر کا خطاب دیا اس وقت کا شعر ہے صلاحیت اور قابلیت کلام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سکّہ ہے کھرا میرے سخن کا — سب نے اس کو پرکھ لیا ہے

بھلا دو میرے مُنہ سے بات اگر کوئی بری نکلی — یہ بے دردی ہے کہنا آہ بسمل بے سری نکلی

تنگ نظر نکتہ چینیوں کو بتایا ہے "نالہ پابندِ نے نہیں ہے"۔

کیا ضرورت رہ الفت میں سخن سازی کی — صدق کافی ہے بس اکبر اثر دل کے لئے

شوق "صداقت" کا اظہار ہے۔

حضرت اکبر کے استقلال کا ہوں معترف — تا بمرگ اِس پر رہے قائم جو دل میں ٹھان لی

شعر ترا اکبر کے سن اے سامع عالی دماغ — قدر کر اے آسماں اس ابر گوہر بار کی

خموشی سے طریق راست پر قائم رہ اے اکبر — نہ جا گفت و شنود دہر پر دنیا ہے بکّی ہے

استقلال کی دوسری تصویر ہے۔

شاعری میرے لئے آساں نہیں — جھوٹ سے واللہ نفرت ہے مجھے

زور رندی ہے نصیب دیگراں — شاعری کی صرف قوت ہے مجھے

دونوں شعر انتہا کے بلیغ ہیں بار بار پڑھئے اور محفوظ ہو جئے۔

نغمہ یورپ سے میں واقف نہیں — دیس ہی کی یاد ہے بس گت مجھے

بت زہرہ جبیں نے بھیرویں چھیڑی ہے اے اکبر — نماز صبح کو اس وقت تو محفل سے اٹھتا ہے

شان استجاب دیکھئے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صبح کو فلک پر رقاصہ آسمان، خاموش نغمہ

میں مصروف ہے۔

کچھ ایسی دل فریبی ہوتی ہے اشعار اکبر میں
کہ شور مرحبا ہر گوشۂ محفل سے اٹھتا ہے

اپنے کلام کی عالمگیری کا بیان ہے۔

ناواقف وزن شعر مجھ کو جو کہے
اس کے آگے ضرور ہے چپ رہنا

بلبل کو بھی بے ثمرادہ کہدے گا کبھی
ایسے سنجیدہ شخص کا کیا کہنا

ایک طرف تو اپنی معلومات عروض و بدیع کا اظہار ہے دوسری طرف ایک کلیہ بیان کیا ہے کہ اوزان عالم صاحب طبع سلیم کا نتیجہ ہیں جو شخص فطرتاً موزول طبع ہے وہ ناواقف وزن نہیں ہو سکتا۔

مستی اکبر کی رقص مس سے نہ رکی
بھونرے پہ نہو سکی بھنبھیری غالب

مغربی تمدن اور نئی روشنی سے اکبر کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے۔

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں
گو اس نے بہت کہا کہا کچھ بھی نہیں

زلف و کمر بتاں کا مقصود ہے ذکر
شیطان پر طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

نہ دل پستا ہے لسکٹ پر نہ میں پوری سے لچتا ہوں
مذاقی حاشیہ کو چھوڑ کر دونوں سے بچتا ہوں

اعتدال پسندی کا ذکر ہے۔

ابر فکر آپ کا برسا تو بہت اے اکبر
اعتراضات کی احباب میں بوچھار نہو

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے
نوجواں کے لئے ولولہ انگیز تو ہے

نہ سہی معنی قومی فقط الفاظ سہی
چند احباب کا اک شغل دلاویز تو ہے

پہلے تیسرے مصرعہ کو میں نے یوں سُنا تھا " ہم نے مانا کہ نہیں کچھ بھی کلام اکبر۔ نوجوانوں کی تخصیص نہایت صحیح ہے۔ طبقہ طلباء میں اکبر کا کلام خصوصیت سے مقبول ہے۔

آزاد ہوں نہیں ہے کوئی مدعائے خاص
جس رخ پہ قافیہ مرا مطلب بھی ہے وہی

مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھو جناب شیخ
جس وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی

پیری و افسردگی سب کچھ سہی اکبر مگر
ظلم ہے تیری خموشی شوخی گفتار پر

بجز خطائے نظر اور سہو کاتب کے — کچھ اعتراض اگر ہیں تو سود مند نہیں

بے جا تنقیدوں کی طرف اشارہ ہے۔

مری طرزِ فغاں کی بوالہوس تقلید کرتے ہیں — خجل ہوں گے اثر کی بھی اگر امید کرتے ہیں

اکبر کی ہر دلعزیزی کے رشک سے اور طلبِ شہرت کے تقاضہ سے بعض حضرات نے اکبر ہی کے مخصوص رنگ میں شعر کہنا شروع کئے تھے مگر دل سے نکلے ہوئے نالوں میں اور بنائے ہوئے رونے کے اثر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نظمِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب — یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

ٹھیک پڑھ سکتا نہیں کہتا ہے ناموزوں مجھے — خود زباں معترض ہی خارج از تقطیع ہے

اسی طرح کے اکثر اتفاق مرحوم کو پیش آتے تھے۔

اشعارِ غیر سے تو مجھے کم سند ملی — من گفتم و محاورہ شد سے مدد ملی

اک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے — اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے

دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحق داد — منزل سے اس کو کام ہے اس کو کلیل ہے

کیا ملے دادِ سخن ہنگلہ نشینوں سے مجھے — وہ سمجھتے ہی نہیں قدر شناسی کیا ہے

اکثر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں۔

گو اپنے ساتھ آپ کا ہرّانہ لے گیا — اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

ذکر خدا یا داجل کافی ہیں اس کے واسطے — میدان آنزاک طرف اکبر کی ہمت اک طرف

کلیات سوئم

اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے — عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

حال دل میں سنا نہیں سکتا — لفظ معنی کو پا نہیں سکتا

کرو سکوت نہیں وقت اعتراض اکبر — فضول بحث سے اپنوں کو تم نے غیر کیا

اعترافِ تقصیری ہے۔

کھلا دیواں مرا تو شورِ تحسیں بزم میں اُٹھا | مگر سب ہوگئے خاموش جب مطلع کا بل آیا
نہ پائی دل نے راحت اس قدر بزمِ احبا میں | انھوں نے جب درِ تحسیں مرے اشعار پر کھولا
ہوئی جس درجہ کلفت کمپ میں ایسے سوالوں سے | یہ تم کس واسطے لکھا یہ تم کس واسطے بولا
ہمیشہ کہتا تھا ہر بات پر نمیسلانم | کچھ اس میں شک نہیں اکبر بڑا ہی عالم تھا

یہ شعر ایک عالم کے جذبات دلی کا ترجماں ہے۔

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں | وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا
زبان بند ہے اس عہد پر نگاہ کے بعد | سکوت ہی مجھے رہتا ہے اب تو آہ کے بعد
ہوائے گلشن طبع تو دلکش است اکبر | کہ از گل سخنت بوے یار می آید
جو ہیں اہل بصیرت کہتے ہیں اکثر یہ اکبر سے | غنیمت ہے ترا دم ہند میں لیکن یہ دم کب تک
گو مجھ میں ہے بلاغت گو شعر با اثر ہیں | لیکن مرے مصائب مجھ سے بلیغ تر ہیں

میر و اکبر کے کلام میں جو درد موجود ہے اس کا غالب حصّہ دونوں کے مصائب حیات کا نتیجہ ہے۔

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ اکبر منتخب سمجھیں | بیاں ایسا کہ سب مانیں زباں ایسی کہ سب سمجھیں

کلام اکبر فصاحت سے مالا مال ہے سلاست سے بھرا ہوا ہے۔ سلاست کے متعلق ایک اور رباعی فرمائی ہے۔

ترکیب سلیس میں جو ہم لاتے ہیں | مضموں دقیق لطف دکھلاتے ہیں
اُٹھتا ہے صدائے شورِ تحسیں اکبر | آورد میں آمد کا مزا پاتے ہیں

چوتھے مصرعہ کی تصریح کے لئے آمد اور آورد کی بحث مقدمہ ادب اُردو از طالب الٰہ آبادی میں ملاحظہ فرمائیے۔

میرے سکوت سے مجھے بے حس نہ جانئے | الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں

"الفاظ کی کمی میں" اُردو کی کم مائیگی بھی ایک حد تک شریک ہے ابھی تک اس میں لطیف جذبات ادا کرنے کی صلاحیت نسبتاً کم ہے۔

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں — دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

جناب حضرت اکبر کی کوئی نبض تو دیکھئے — یہ کہنے کو تو ہر حالت میں کہہ دیتے ہیں اچھا ہوں

خوش اخلاقی اور بشاشت کی طرف اشارہ ہے۔

حواس کچھ نیک کام کرلیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھرلیں — مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلبگار نہیں ہوں — بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ہو نہیں سکتا بیان حال دل الفاظ میں — جوش بھی ہے طبع میں اور شعر میں فایق بھی ہوں

زیادہ گوئی سے اب ہم اسی سے رکتے ہیں — جو خوب کہتے ہیں اکبر وہ کہہ بھی چکتے ہیں

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا — ہنس کے بولا وہ آدمی ہی نہیں

پھر کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کیجئے۔

مجھ کو کچھ پوچھنا ہے اکبر سے — یہ کبھی ہوش میں بھی آتے ہیں

اللہ اللہ بیخودی کا کیا عالم ہے۔

میرے اشعار رنگیں آپ کے سُننے کے قابل ہیں — اسی گلزار کے ہیں پھول جو چُننے کے قابل ہیں

'اسی' سے تخصیص بھی ہوگئی اور گلزار محدود بھی ہوگیا۔

قاعدوں میں حسن معنی گم کرو — شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

بے جا اعتراض کا جواب ہے۔

کہو یہ اکبر سے بیٹھ چپکا حرم کے اندر خدا خدا کر — ہر ایک کا یہ مشن نہیں ہے کہ دیر دنیا میں غزنوی ہو

"دیر دنیا" کی ترکیب سے کس قدر اچھوتا اور لطیف پہلو نکال لیا ہے۔

ہوا ہے خوں آرزو کا اکثر یہ ہے بہار کلام اکبر — سخن کو رنگیں کر دیا ہے دل و جگر نے تڑپ تڑپ کر

تم سے اُستادوں میں میری شاعری بے کار ہے — ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے

وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر — کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

سخن سنجی کا کیا کہنا مگر یہ یاد رکھ اکبر — جو سچی بات ہوتی ہے وہی دل میں اترتی ہے

نہ سہی حسن عمل خوبی گفتار سہی — ہے تو اکبر میں بھی اک بات گنہگار سہی

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے — ہوا ہی بدلی ہوئی ہے فلک سے کون لڑے
خدا ہی ہم کو اُٹھائے گا جب تو اُٹھیں گے — ابھی تو چپ ہیں کوئی لاکھ اعتراض جڑے
اگر اُٹھے تو علم اپنا گاڑ لیں گے کہیں — جو اُٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم خود ہی گڑے
شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیے میں اس کے خوب — کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

اوپر کے شعر میں "مجلس رائے اور وائسرائے کے قافیہ ہیں"

افواہ ہے کہ اکبر بیہوش ہو گیا ہے — یہ تو غلط ہے لیکن خاموش ہو گیا ہے
خلق مجھ سے طالب پابندی اخلاق ہے — یہ میری حالت کہ مجھ پر تھینک یو بھی شاق ہے

آخر حصّہ عمر کا آئینہ ہے۔

بہت پسند ہے مجھ کو خموشی و عزلت — دل اپنا ہوتا ہے اپنا خیال ہوتا ہے
ہمیں تو خامشی میں دل سے اپنے کام لیتا ہے — زبان وہ بزم میں کھولیں جنھیں انعام لیتا ہے
حضرت اکبر کا ان روزوں بڑا ہی نام ہے — پولو پونی پر حدی خوانی انھیں کا کام ہے

اپنا مشن اور زمانہ کی ناموزونیت کی داستان ہے۔

مذاق بزم احبا جو کچھ بھی ہوا اکبر — میری زباں بھی وہی ہے میرا بیان بھی وہی

تغیرات زمانہ کا اثر اکبر کی زبان و بیان پر نہیں پڑا۔

ہے منع ملاقات میری ہم نفسوں سے — فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے
تعداد وہی اُنگلیوں کی گو ہے بدستور — بیگانگی ساعد و بازو ہے دسوں سے
ہے حکم کہ حس پالسیوں کے ہو مطابق — اب کام بدن کو نہ رگوں سے نہ نسوں سے
چوری نہ کبھی کی ہے نہ کرنے کا ارادہ — پھر بھی یہ ضرورت ہے کہ بھاگوں عسسوں سے

حکومت کی طرف سے کچھ زمانہ کے لئے خموش رہنے کا حکم ہوا تھا

خموش شمع صفت کیوں نہو زباں میری — کہ خود ہی بزم میں روشن ہے داستاں میری
بہت نہ رونے سے یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوش سرشک دیدہ — یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایت طرف آستیں ہے
جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے نہ عقل میری نہ جان میری — ارادہ ان کا دماغ میرا خیال ان کا زبان میری

اظہار غلامی ہے۔

زبان و لفظ کا جلوہ فقط حد بیاں تک ہے
تسلسل موج معنی کا خدا جانے کہاں تک ہے

تھی عقل زباں برائے اکبر اور عشق پہ رکھی ہم نے نظر
ممتاز رہے ہشیاروں میں سرخیل رہے دیوانوں کے

نہ پوچھو بیٹھا ہوں کیوں ہاتھ پر میں ہاتھ دھرے
اٹھوں گا نبض ذرا دیکھ لوں زمانے کی

اکبر کی خرافات سے ناخوش ہوئے ایسے
نامہ ہے نہ پیغام نہ حصہ ہے نہ مجرا

مانا کہ حسینوں کے لئے ناز ہے لازم
لیکن کوئی پوچھے تو کہ پاگل سے بھی نخرا

میری طرف سے سارا جہاں بدگماں ہے اب
آزادی کلام وہ مجھ میں کہاں ہے اب

رکھتی ہیں پھونک پھونک کے باتیں مری قدم
تیغ زباں نہیں ہے عصائے زباں ہے اب

دست اندازی پولس کی ہو جس میں رو ا
ہرگز نہ اسے کلام اکبر سمجھو

حضرت عزیز لکھنوی کے نام ایک خط میں حضرت اکبر شکایت لکھتے ہیں کہ کسی صاحب نے "برطانیہ نظام کو واپس برار دے"، کو خواہ مخواہ اکبر کی طرف منسوب کر کے اس پر طبع آزمائی کی تھی (مکاتیب اکبر)۔

بس اتنی بات ہے سامع میں ہو مذاق سخن
مجال کیا جو مرے شعر پر اُچھل نہ پڑے

عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا
اس قہر کو ملاحظہ للّٰہ کیجئے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

اگرچہ ہے ذوق تمکنت کا لحاظ رکھتا ہوں سلطنت کا
خدا نے قائم کئے ہیں درجے خیال ہے حد منزلت کا

زبان کھولوں تو پوچھ لوں گا کہ دل کہاں تک ہے اس کا ساتھی
قدم بڑھاؤں تو دیکھ لوں گا جو منتہا ہے میری سکت کا

میں کب ہوں نغمات دل سے غافل نہیں ہوں سازوں پہ پھر بھی مائل
بُرا جو کھچ جائے گا کوئی سُر تو لطف جاتا رہے گا گت کا

ان میں موج مغربی مجھ میں ہوائے شرق ہے
وہ گزٹ میں غرق ہیں بندہ غزل میں برق ہے

اک غزل میں اتفاقاً مرا اک مصرعہ یہ تھا
دیدۂ عبرت سے رنگ دہر فانی دیکھی

کوئی بول اُٹھا زوال حسن بت مقصود ہے
اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھی

عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے
بزم دنیا میں یہ زور بدگمانی دیکھی

بڑی مجبوریوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبر

واہ واپر عجب مصیبت ہے وہ خرافات پر ہیں داد طلب

زمانہ کے رنگ کی تصویر ہے

سوا خدا کے ہمارا کوئی گواہ نہیں اگرچہ دعوی اسلام ہے مگر بالفعل

ایسے زمانہ میں جب ہر چیز کے لئے دلائل و براہین کی ضرورت ہوتی ہے کس قدر جامع شہادت دی گئی ہے۔

ترک حق گوئی ہے مشکل محرم اسرار کو چھوڑنا ممکن ہے اکبر شوخی گفتار کو

محرم اسرار کو سیاسی، مدنی، یا جس رنگ میں چاہئے سمجھ لیجئے۔

اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں مدخولہ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا

وہ مہاتما کے اصول کی دل سے قدر کرتے تھے مگر گورنمنٹ سے پنشن ملتی تھی نگرانی ہوتی تھی۔ مجبور تھے۔

مجھ کو دل والوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا ہوشیاروں میں تو اک سے سوا ہیں اکبر

اکبر اور اودھ پنچ

سلسلہ "صبح" میں کلام اکبر کے دوش بدوش ظریفانہ مضامین کا سلسلہ "اودھ پنچ" لکھنؤ کے دور اوّل میں جاری رہا یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پنچ کے ایڈیٹر سید سجاد حسین صاحب تھے مصنف حاجی بغلول وغیرہ۔ رتن ناتھ سرشار چکبست شرر۔ ڈپٹی امامت حسین (الہ آبادی) اور اکبر اس وقیع پرچہ کے لئے برابر مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ میری تحقیق بتاتی ہے کہ اکبر نے ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء تک ۔ا۔ح۔ الہ آبادی کے نام سے مضامین لکھے ہیں۔ اقتباسات سے نوعیت اور اور خصوصیات ظاہر ہو جائیں گی۔

اس وقت میرے پیش نگاہ ایک نامہ ہے جو مرحوم نے ۱۸۷۸ء میں اودھ پنچ کو بھیجا تھا نامہ گلزار نسیم کی بحر میں ہے۔ شروع کے اشعار میں فارسیت غالب ہے۔ چہرہ کے رنگ میں مذاق متقدمین کی جھلک ہے۔

اے گوہر مخزن ظرافت — وے جوہر معدن لطافت
سرمایۂ انبساط خاطر — تسکین دل و نشاط خاطر
ہادی واد یب و دانش اموز — کشاف رموز عشرت اندوز
کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ — محبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ

صنعت تجنیس ملاحظہ ہو۔

دن رات یہی ہیں اب تو چرچے — پرچاتے ہیں دل کو اس کے پرچے

اب ذرا زبان کی سادگی اور شیرینی کا لطف اُٹھائیے۔

ہر چند کہ زجر بیشتر ہے — گو فقرہ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گھلا ہے — یہ آب حیاب میں دھلا ہے
بگڑے ہوے بن گئے ہنسی میں — حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں

دور اوّل کے اودھ پنچ کا مشن یہی تھا کہ ظریفانہ انداز سے آدمیوں سیاست والوں، اور

شاعروں کی لغزشیں ظاہر کر دیتا تھا جس سے منصف مزاج فائدہ اُٹھاتے تھے۔

لندن پنچ اور اودھ پنچ کا موازنہ ملاحظہ ہو۔ ترجیح بھی دی ہے تو کس خوبصورتی سے۔

ہر چند کہ طرز پنچ لندن — بے شبہ ہے دلپسند و پر فن
لیکن وہ نقش اولیں ہے — نسبت اس سے اسے نہیں ہے
ماشاء اللہ یہ نقش ثانی — بہتر ہے بصورت و معانی
بحث مضموں میں وہ اگر پنچ — یہ حل نکات میں ہے سرپنچ
وہ اک گل صد بہار دیدہ — یہ غنچہ تازہ نو دمیدہ

اسی سلسلہ میں مشک بید کے قلم کی تعریف ہے جو آب زر سے لکھی جائے تو بھی کم ہے۔ شاعری اور مبالغہ نہیں ہے اصلیت اور واقعہ ہے۔

واں بازوے تار سست بنیاد — یہاں خامہ نیزۂ چمن زاد

پر کا قلم

کیسا خامہ زبان معنی — کیا ذکر زبان کہ جان معنی
اُٹھنے میں نگاہ چشم جادو — چلنے میں حریف تیغ بازو
مفتاح خزینۂ تصور — نقاش نگینۂ تصور

شمع اور قلم کا موازنہ، شمع کی تشبیہ درست نہیں ہے

کہنا اسے شمع کب روا ہے — اوصاف میں شمع سے سوا ہے
وہ چہرہ نمائے بزم صورت — یہ پردہ برافگن حقیقت
ہر چند کہ سرمہ در گلو ہے — تاہم سرگرم گفتگو ہے

پریس ایکٹ کی سختیاں لندن پنچ کے آزادانہ مباحث اور اودھ پنچ کی محدود و مفید رائے زنی کا موازنہ کرتے ہیں۔

واں طبع کو زور لاتخف ہے — دقت تو جو ہے وہ اس طرف ہے
زنجیر خرد کی پابندی — باقاعدہ شرح دردمندی

کیونکر نہ ہو ادعائے اعجاز   کھولے ہیں قفس میں بال پرواز
دریا قطرے میں موج زن ہے   غنچے میں بہار صد چمن ہے
ہے نوک سناں پہ نقش پرواز   رقصاں دم تیغ پر بصد ناز
شعلوں کے ہجوم میں سمندر   امواج میں ماہی قوی پر

سمندر ایک چڑیا ہے جو چالیس برس آگ برابر جلتی رہے تو اس سے پیدا ہوتی ہے اور چکور کی طرح آگ ہی کھاتی ہے۔

پا بند جو یوسف سخن ہے   پھیلی ہوئی بوے پیرہن ہے

جناب یوسف نے جب مصر سے اپنا پیرہن اپنے باپ کو بھیجا تھا تو اس کی خوشبو سے جناب یعقوب کی آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئی تھیں دیکھئے سورۂ یوسف قرآن مجید۔
حدود گفتگو کے متعلق تلازمہ و تعلیل کے لطف کے ساتھ عجیب و غریب نکتہ بیان کرتے ہیں۔

منہ کے اندر زباں جڑی ہے   دانتوں کے حصار میں پڑی ہے
بتیس[۳۲] جوان سخت طینت   استادہ ہیں مائل اذیت

منہ میں بتیس دانت ہوتے ہیں۔

ہیں مثل سفید دیو بیباک   طامع جابر حریص سفاک

دانت کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ چار صفتیں دیو اور دانت دونوں میں مشترک ہیں۔

حد سے جو بڑھے جو زبان گفتار   دوڑیں اسے کاٹنے یہ خونخوار

بے خیالی میں زبان دانتوں کے نیچے دب کر لہولہان ہو جاتی ہے۔

پہلو میں جوان کے ہمنشیں ہو   وہ نوک خلال سے حزیں ہو

مسوڑے۔

کتنا ہی ہو وہ ملائم و تر   دانہ لیتا ہے اس میں آکر
اس قید میں جب کہ یہ زباں ہے   آزادی گفتگو کہاں ہے
باریک ہے گو یہ نکتہ اے دل   لازم ہے سمجھ لیں اس سے عاقل

مرضی ہے خدائے جسم و جاں کی — محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ — ہشیار چلو بہک نہ جاؤ

آخر میں ایک لانبی چوڑی دعا ہے جس کے کچھ شعر نمونتاً حاضر ہیں اس لئے کہ دعا میں بھی جدت کا پہلو ہے۔

جب تک ہے رباعی عناصر — رنگینئ نقش لوح خاطر
جب تک یہ نظم بیت ہستی — موزوں ہے برائے خود پرستی
جب تک کہ ہے روح کا لطیفہ — انفاس کا ہر نفس وظیفہ
یہ پرچہ دلفریب و زیبا — ہو مونس جان ناشکیبا
احباب جو اس کے ہیں معاون — عالی منشاں نیک باطن
رنگیں طبعی سے گل کھلائیں — چشم بد بیں کو خوں رلائیں
پیدا ہوں وہ گوہر مضامیں — دریا کے ہو لب پہ شور تحسیں
بے ساختہ بول اٹھیں سخنور — اللہ رے طبع و فکر اکبر

ان اقتباسات سے جہاں زور بیان، حسن خیال اور قوت ادا کا پتہ چلتا ہے - وہاں نکتہ رسی، سنجیدگی، رعایت لفظی - صنائع لف و نشر، تطبیق و مراعاۃ النظیر بھی جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ نثر کے مضامین میں بے ساختگی حسن بیان اور ظرافت سے قطع نظر، فطرت شناسی اور نازک خیالی کے جواہر رولے گئے ہیں۔ خوب خوب مقامات ادا ہوئے ہیں اور جدت و قدرت لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ ظرافت سبق آموز نتیجہ خیز ہے۔ عشرت صاحب کوشش کر رہے ہیں کہ تمام مضامین نثر ایک ساتھ جمع کر کے ضروری خواشی سے مزین کر کے شایع کر دیں اللہ کامیاب کرے

جنگ نامۂ روم و روس

غیر مطبوعہ

اس غیر مطبوعہ جنگنامہ کو "صبح" میں اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ ۱۸۷۷ء کے واقعات کے متعلق ہے جس کا واسطہ اکبر کے حیات و کلام کے دور اوّل سے ہے۔

زبان و محاورات سے بھی اس زمانہ کا پتہ چلتا ہے گو اب بہت کچھ فرق ہو گیا ہے جنگ نامہ میں۔ رزم۔ بزم۔ دعا۔ موازنہ۔ جنگ شکست۔ بھاگڑ۔ سب اپنی جگہ بے نظیر ہیں خصوصیت سے موازنہ قابل دید ہے اور وہ ٹکڑا جہاں بروج اور ستاروں سے معرکہ رزم فضائے آسمان میں دکھایا گیا ہے اور اسد و ثور کا مقابلہ ہے۔

اگر یہ اشعار اُردو کی جگہ فارسی میں ہوتے تو فردوسی کے فنا نہ ہوئے شاہنامہ کا اک جزو ضرور ہوتے۔ طرز بیان۔ زمین۔ انتخاب الفاظ۔ سیاست نغمہ۔ زور اور روانی کے اعتبار سے اکبر کے شعر ایسے نہیں ہیں کہ ہر شعر کے عوض میں کوئی سچا محمود ان کو ایک اشرفی نہ دے۔

میں اس موقع پر بھی ڈاکٹر سید زاہد حسین صاحب اسسٹنٹ سرجن کا اعتراف احسان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنھوں نے اپنی "پرائیوٹ بیاض" سے مجھے ان اشعار کے نقل کی اجازت دیدی غالباً یہ جنگنامہ ان کے علاوہ اور کسی کے پاس اب باقی نہیں ہے۔

اسی واسطے میں نے انتخاب بھی نہیں کیا کہ جو کچھ باقی رہ جائے وہی غنیمت ہے دوسری خاص وجہ یہ تھی کہ جنگ نامہ ایک مکمل اور مسلسل چیز ہوا کرتی ہے۔ تراش خراش سے سارا لطف جاتا رہتا جو باتیں میری نگاہ میں اوسط درجہ کے ناظر کے لئے ضروری تھیں ان کا اظہار میں نے حاشیہ پر کر دیا ہے۔

وقائع ۳۱ اگست ۱۸۷۷ء

یہ مژدہ ہے آج اہل اسلام کو ... سنیں تار[1] برقی کے پیغام کو
جو ہیں احمد ایوب پاشائے ترک ... سپہدار رشچک[2] صف آرائے ترک
شکست و ہزیمت ہے ان کی دروغ ... خبر کلّیہ[3] کی تھی سر بسر بے فروغ
سنو جنگ دوشنبہ کی اب خبر ... مقام پلونا[4] یہ رکھو نظر
وہ عثمان[5] بادشا جوان دلیر ... جو ہے اس نیستاں میں مانند شیر
عدو اس پہ جب حملہ آور ہوئے ... تباہ و پریشاں سراسر ہوئے
سپہ ان کی بس ہو گئی منتشر ... کہ باضابطہ[6] روس بھی ہے مقر
اجل ان کی طالب جو تھی بیدرنگ ... تو سہ شنبہ کو پھر کیا عزم جنگ
مرتب کیا لشکر بے شمار ... ہزاروں پیادے ہزاروں سوار
ہوئے حملہ آور بہ توپ و رفل[7] ... پلونا میں پھر آ کے ڈالا خلل
بہادر یل صف شکن قلعہ گیر ... بہ ہمت[8] جواں بہ تدبیر پیر
وہ عثماں پاشائے جنگ آزما ... بہ اقبال و ہمت مقابل ہوا
پکارا کہ اے جنرل[9] روسیاہ ... نہ کر اپنے لشکر کو ناحق تباہ

---

[1] غیر ملک کی خبریں تار کے ذریعہ آتی ہیں اور مقامی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں [2] ایک مقام کا نام ہے۔
[3] مقامی اخبار کی طرف اشارہ ہے [4] ترکستان و روس کے بیچ کا ایک سرحدی نزاعی مقام
[5] جو تاریخ میں غازی عثمان پاشا کے نام سے مشہور ہیں [6] مستند طور پر [7] Rifle گولی کی بندق۔
[8] یہ مصرعہ فردوسی کا ہے [9] General ایک فوجی عہدہ روس کے سردار فوج کی طرف اشارہ ہے۔

جو دریا سے تو نے کیا ہے عبور — اسی کا ہے شاید یہ ناز و غرور
فریب و دغا پر تجھے ناز ہے — یہاں زور بازو میں اعجاز ہے
تجھے حیلہ سازی میں بس ہے کمال — یہاں حق پرستی کا ہر دم خیال
اگر تجھ کو ہے دعوی جبر[۱] لی — تو ہے اپنے قبضہ میں تیغ علی
اگر روز محشر[۲] نہیں ہے قریب — فتح تجھ کو ہرگز نہ ہو گی نصیب
زبس اس کے دل میں تھا نخوت کا جوش — لگا کہنے اے ترک ناداں خموش
عبث اس قدر ہے یہ لاف و گزاف — ابھی تیرے لشکر کو کرتا ہوں صاف
کیا الغرض اس نے سامان جنگ — پیاپے لگی چلنے توپ و تفنگ
عجب جوشش فضل یزداں ہوئی — کہ ترکوں کو فتح نمایاں ہوئی
ہوئی فوج اعدا بہت بے حواس — سپاہی پریشاں جنرل اوداس
ادھر کشتی ترپیڈو[۳] بہ گئی — اُدھر توپ منہ کھول کر رہ گئی
ہوئی روسیوں کو یہ ایسی شکست — کہ سب حوصلے ہو گئے ان کے پست
سپہدار ترکاں ہوا چیرہ دست[۴] — کیا لشکر روس کو خوار و پست
ہوئی فوج ترک الغرض فتح مند — صف فوج اعدا کو پہنچا گزند
پیام اجل تھی جو ترکوں کی زد — ہوئے اس میں مقتول ہشتاد صد[۵]
جو پوچھا کہ مجروح ہیں کے ہزار — دہن زخم کے بول اٹھے بست[۶] و چار
جو ہے اسگڑو منزل روسیاں — وہ ہے رشچک و شملہ کے درمیاں
محمد[۷] ہیں مصروف کوشش ادھر — عجب کیا جو ہو اسگڑو میں ظفر

---

۱ ترکیباً غلط ہے مگر اکبر کے یہاں بہت ہے اور جائز ہے ۲ روز محشر جب قریب ہو گا تو اہل اسلام کی پیشین گوئی کے مطابق مسیح موعود کے آنے اور امام مہدی کے ظہور سے پہلے دجال کا تمام قبضہ ہو جائے گا اس اشارہ کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ ناظرین کا دماغ فوراً دجال کے حلیہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو کانا ہو گا اور گدھے پر سوار ہو گا۔ غالباً محرر صاحب کی جدت نے ظفر کو فتح کر دیا ہے
۳ Tarpedo وہ کشتی جو پانی کے اندر اندر رواں رہتی ہے اور غنیم کے جہازوں کے پیندے توڑ کر ان کو تباہ کرتی ہے ۴ زبردست فتح یاب ۵ اسی سو یعنی ۸۰۰۰ آٹھ ہزار ۶ چوبیس ہزار ۷ محمد پاشا سپہ سالار غازی عثماں پاشا۔

سنو حالت جنگ آرمینیا[1] جو ہے داخل کشور ایشیا
ملیکاف[2] وہ جنرل نامدار کہ جو سارے یورپ کا تھا افتخار
وہ جس پر بہت روسیوں کا تھا ناز جو مشہور تھا حیلہ جو فتنہ ساز
جو مختار پاشا سے کھا کر شکست پریشاں تھا صورت فاقہ مست[3]
معین اس کی پھر آئی تھیں پلٹنیں کہ چودہ جو ہوتی تھیں تعداد میں
ملے توپخانے بھی سن[4] اس کو تین کسی پھر بھی ظالم نے گھوڑے پہ زین
جو ہے دل میں بے عزتی کی امنگ پھر آیا ہے وہ سوئے میدان جنگ
ہوئی ہے لڑائی بھی دو بار واں ولیکن نتیجہ ہے اب تک نہاں
خدا جانے کیا موقعۂ جنگ تھا لڑائی کا کیا رنگ کیا ڈھنگ تھا

ابھی تک نہیں آئی اس کی خبر
کہ کس کو عطا کی خدا نے ظفر

وقائع چہارم اگست ۱۸۷۷ء

رواں ہو تو اے کلک معنی پرست کہ لکھوں میں اخبار چارم اگست
زہے شوکت و عظمت و اوج ترک زہے نیت[5] و جرأت فوج ترک
سلیمان پاشائے گردوں وقار دلیر و جوانمرد و ذی اقتدار
جنھوں نے کیا سونگرو[6] کو بھی زیر رہے کوہ پر مثل غرندہ شیر
پس از فتح و نصرت جو واں سے پھرے رومیلیا[7] کے سردار لشکر ہوئے

---

[1] آرمینیا ایک مقام کا نام ہے [2] ایک روسی سردار کا نام ہے [3] کتنی اچھی تشبیہ دی ہے، حواس غائب چہرہ پر ہوائیاں اڑتی ہیں [4] تخاطب کا یہ طریقہ ۱۸۷۷ء میں عام طور پر رائج تھا [5] نیت کا لفظ یہاں بہت بلیغ ہے۔ بہادری وہی ہے جو خودغرضی سے پاک ہو اور بہادر وہی ہے جو بیکسوں پر زبردستی نہ کرے جیسا روسیوں کا قاعدہ تھا کہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی انتقام کی آگ میں جلا کر خاک کر دیتے تھے۔ ایک لفظ نیت سے اکبر نے ترک و روس کا پورا موازنہ کر دیا ہے اور بالکل وہی اثر پیدا کر دیا ہے جو ایک باکمال مصور موقلم کے ایک ہلکی سی جنبش میں پیدا کر لیتا ہے۔
[6] ایک مقام کا نام ہے [7] ایک مقام کا نام ہے۔

جدھر آمد لشکر روس تھی — طبیعت خلایق کی مایوس تھی
بڑھ آئی تھی افواج اعدا تمام — جنوبی بلکن[1] تھا اس کا مقام
عدو اس کے صغرا[2] میں تھے خیمہ زن — رعایا تھی سلطان کی پر محن
رؤف[3] دلاور و پاشاے ترک — جو بلکن میں تھے ہمت افزاے ترک
سپاہی تھے ان کے نہایت قلیل — سوا اس میں تھے اکثر ضعیف و علیل
ہوئے حملہ آور جواں پر عدو — ہٹے کارنویہ[4] کو وہ نیک خو
کئے روسیوں نے جو ظلم و ستم — اسے کیا کہے اب زبانِ قلم
مقابل کوئی فوج جنگی نہ تھی — رعایا کی بس جان پر آبنی
ہوئے دست دشمن میں صدہا اسیر — زن و طفل و معصوم و برنا و پیر
جو نامرد تھا دشمن کینہ خواہ — ہوئے قتل وہ سب کے سب بے گناہ
مچانے[5] لگے اس پہ اعداے شوم — شکست سلیمان پاشا کی دھوم
اسی دن سلیماں کو پہنچی خبر — کہ مغرور ہے دشمن خیرہ سر
جوانمرد غصہ سے بس کانپ اٹھا — کہ اب میں ہوں اور دشمن بے حیا

وقائع ہفتم اگست ۱۸۷۷ء

مددگار ترکاں ہو پروردگار — کہ دو چار ہیں دوست دشمن ہزار
ادھر سرویہ[6] مائل سرکشی — ادھر منٹونگرو[7] میں یہ برہمی
بغاوت میں مصروف رومینیا[8] — شرارت پہ آمادہ بلگیریا[9]
غرض صوبہ ہاے مسیحی تمام — ہیں اعداے ترکان عالی مقام
اِدھر خانگی مفسدوں کا یہ رنگ — اُدھر حضرت روس سرگرم جنگ

---

[1] ایک مقام کا نام ہے [2] ایک مقام کا نام ہے [3] رؤف پاشا بہت زبردست بہادر اور مجاہد گزرے ہیں۔
[4] کارنو یہ بلکن کے قریب ہی ہے [5] تعقید ہے 'دھوم' مچانے لگے سے بہت دور جا پڑا ہے مگر لفظوں کی روانی کی وجہ سے یہ تعقید سقیم و ثقیل نہیں ہے [6] ایک مقام کا نام ہے [7] ایک مقام کا نام ہے [8] ایک مقام کا نام ہے [9] ایک مقام کا نام ہے

محض ہے یہ تائید فضل الٰہ — کہ خوش حال اب تک ہے ترکی سپاہ
مگر مجھ کو حیرت ہے یہ روز و شب — کہ اس پر بھی پیہم ہیں فوجیں طلب
وہ جو گارڈ[1] شاہی روس ہے — اسے حکم اعدائے منحوس ہے
کہ ترتیب فوجی سے تیار ہوں — مرتب پئے جنگ و پیکار ہوں
ڈویزن[2] جو ہیں روسیہ فوج کے — انھیں ہیں یہ احکام بھیجے گئے
کہ سب جمع ہو کر بنیں پلٹنیں[3] — پئے جنگ ترکاں مرتب رہیں
سوا اس کے اک لاکھ نوے ہزار — جوانان جنگی پئے کارزار
ہوے ہیں طلب از مقام لندور[4] — بہ حکم شہنشاہ بانی جور
یہ لکھتے ہیں اب کاتبان خبر — ہویدا ہے جس سے یہی سربسر
کہ فوجیں پئے قوت دشمناں — ہیں کثرت سے بلگیریا کو رواں
بقیہ جو ہے فوج بہر مصاف — رواں ہو گی وہ جانب کوہ قاف
یہ اعدا کی کثرت یہ فوجوں کی دھوم — زہے ہمت حضرت شاہ روم
خدایا تو سلطاں کو دے ظفر — کہ اعدا ہیں ناحق سوے کین و شر
یہ حالات یوناں سے ہے عیاں — کہ کرتے ہیں وہ بھی سلح[5] بندیاں
مقرر ہوئے سارے حکام جنگ — خدا جانے یونان کو کیا ہے امنگ
گورنمنٹ[6] انگلینڈ سے ہے عیاں — کہ مڈیٹرنین[7] کو ہیں فوجیں رواں
یہ دو ترپ[8] کو حکم پہنچا ہے اب — کہ بحری سفر کو ہوں تیار سب

سپاہی ہیں تعداد میں دس ہزار
سوے بحر ہوں گے رواں بہر کار

---

[1] Guard دستہ محافظت [2] Division [3] تمن [4] فوجیں [5] ایک مقام کا نام ہے۔ [6] ہتھیار سجنا۔ لڑائی کے لئے تیار ہونا [7] سلطنت انگریزی [8] میڈیٹرینین (اصل لفظ) یہ ایک سمندر ہے ضرورت شاعری سے تلفظ میں جو تبدیلی ہوئی ہے شاعر اس کا مجاز ہے۔ دوسرے کو اختیار نہیں ہے [9] Troops فوجیں

وقائع ہشتم اگست ۱۸۷۷ء

وہ عثمان جو صاحب اوج ہے — پلونا میں فرماں دہ فوج ہے
ملی اس سے اور آکے ترکی سپاہ — نہایت قوی اب وہ ہے بارگاہ
پڑا ہے جہاں لشکر روسیہ — وہ ہے پندرہ میل کا فاصلہ
ہراول[1] سپاہ عدو کا مگر — پلونا سے ہے صرف چھ میل پر
ادھر ترک میداں مارے ہوئے — ادھر روس ہمت کو ہارے ہوئے
ادھر فتح و نصرت کے جھنڈے بلند — ادھر نیتیں پست دل دردمند
مظفر سپہ اس طرف نغمہ سنج — ادھر کشتگان پلونا کا رنج
مقام پلونا میں وقت مصاف — ہزیمت کا ہے روس کو اعتراف
جو آئی تھی ہشتاد صد کی خبر — کہ مقتول روسی ہوئے اس قدر
گھٹا کر وہ کرتے ہیں اس کا بیاں — کہ تھے صرف پنجاہ صد[2] کشتگاں
خدا کو ہے معلوم اصلی شمار — مگر یہ تو عالم پہ ہے آشکار
کہ کذاب ہے روسی خودستا — نہیں صدق[3] سے ان کے لب آشنا
کریں قتل سو کو تو کہدیں ہزار — جو مقتول سو ہوں تو بتلائیں چار
ہزیمت اٹھائیں تو ہو اس کی فکر — کہ اخبار میں آنے پائے نہ ذکر
بلا میں پھنسے جان مضموں نگار — نکالیں اسے فوج سے کر کے خوار
جو ہوں اتفاقاً کہیں فتحیاب — تو پھر لاف بیجا کریں بے حساب

یہاں سے نظم کا سلسلہ بگڑ گیا ہے غالباً محرر صاحب نے کچھ شعر چھوڑ دیئے ہیں۔

سپاہی ہر اک ہیں ز روئے شمار — پئے جنگ و پیکار ہیں یک ہزار
چلے آتے ہیں ہوکے تیار جنگ — نمایاں ہوئے ہیں پھر آثار جنگ

---

[1] جو سردار فوج پیش خیمہ لے کر آگے آگے چلتا ہے وہ ہراول کہا جاتا ہے [2] پچاس سو یعنی پانچ ہزار۔
[3] اس کے ہونٹھ سچائی سے آشنا نہیں ہیں یعنی وہ ہر وقت جھوٹھ بولتا ہے۔

جو ترکوں کی ہے فوج قلب و یسار ۔۔۔ اسی سمت عازم ہیں یہ نابکار
ہزیمت پران کو ہزیمت ہوئی ۔۔۔ دم جنگ سو بار ذلت ہوئی
ملے خاک و خوں میں یہ پیش بطوم[۱] ۔۔۔ ندامت اُٹھائی سوے ارض روم[۲]
زدن[۳] کی لڑائی میں کھائی شکست ۔۔۔ خبر جس کی آئی تھی قبل از اگست
ہٹے قرص[۴] کے ہو کے خار و خراب ۔۔۔ پھرے اُلٹیئے[۵] سے بصد اضطراب
مگر پھر بھی ہیں مائل شور و شر ۔۔۔ پھر آئے ہیں لشکر کشی کو ادھر
نہیں ہے زبس[۶] ان کو شرم و قرار ۔۔۔ یہ باعث ہے لڑتے جو ہیں بار بار
جو یہ کہتے ہیں روسیان لعیں ۔۔۔ کہ ترکوں کو بھی تو شکستیں ہوئیں
ہوا کیوں نہ فسخ ان کا عزم جدال[۷] ۔۔۔ رہے کیوں وہ مصروف جنگ و جدال
جواب اس کا دیتے ہیں انصاف دوست ۔۔۔ کہ اے روس بیہودہ بے مغز و پوست
شب تار میں کر کے دریا عبور ۔۔۔ لیا سسٹوا[۸] تو نے اے بے شعور
جو سامان سازش کا بہم کیا ۔۔۔ مطیعان سلطاں کو برہم کیا
وئے ملٹونگرو[۹] کو تو نے وہ دم ۔۔۔ کہ باغی ہوئے سب کے سب یک قلم
ادھر اور صوبوں میں ڈالا فساد ۔۔۔ ہوے کینہ جو مردم بد نہاد
مچا ہر طرف روم میں شور و شر ۔۔۔ ہوئی فوج ترکوں کی مصروف ادھر
کوئی فوج تجھ سے مقابل نہ تھی ۔۔۔ جو کچھ تھی بھی ساماں[۱۰] میں کافی نہ تھی
بطور حفاظت جو تھے جا بجا ۔۔۔ تن چند ترکان جنگ آزما
بہ حکم ضرورت[۱۱] رہے وہ خموش ۔۔۔ تکبر نے بس کھو دئے تیرے ہوش
نکوپولس[۱۲] و اسکندڈرٹوا[۱۳] ۔۔۔ یہ سب کچھ ترے قبضہ میں آگیا

---

۱ مقام کا نام ہے ۲ مقام کا نام ہے ۳ ایک مقام کا نام ہے ۴ ایک مقام ہے ۵ دیکھئے اُلٹیئے اور پھرے میں کسی اچھی مناسبت ہے ۶ بالکل۔ ذرا بھی ۷ دونوں مصرعوں میں جدال جدال غلط ہے۔ غالباً "خطاے نظر" ہے یا سہو کاتب ہے۔ میرے خیال میں دوسرے مصرعہ میں قتال کا لفظ اصل مسودہ میں رہا ہوگا ۸ ایک مقام ہے ۹ ایک مقام ہے ۱۰ سامان جنگ سے مطلب ہے ۱۱ مصلحتاً وقت کے لحاظ سے ۱۲ مقام کا نام ہے ۱۳ مقام کا نام ہے۔

بڑھا کوہ بلکن تلک بے حواس — ہوا بے خطر قابض شہر کا[۱] پاس
کیا اس کی صغرا میں تو نے مقام — کیا اس کی صغرا میں بھی ازدحام
کیا قتل باشندگاں بے گناہ — جو تھے اہل لشکر نہ اہل سپاہ
دغا سے یہ سب کر لیا بندوبست — اسی کو تو سمجھا ہے دینا شکست
یہ نزد سپہدار عالی خیال — پسندیدہ کب ہے یہ طرز جدال
ذرا غور کر شرم کا ہے مقام — کہ باوصف ایں شوکت و اہتمام
جھپٹ کر جو آ پہنچے ترک دلیر — کیا حملۂ سخت مانند شیر
تو گھبرا کے بھاگی تری سب سپاہ — روانہ ہوئی بس جدھر پائی راہ
ترا حال جب یہ ہے اے بدخصال — شکستیں تو ترکوں کو دے کیا مجال
کجا خرس[۲] کو ہی کجا شیر دشت — دبکنا ہے تجھ کو انھیں سیر و گشت
شکستیں وہ ہیں جو سلیماں نے دیں — کہ جی چھوڑ کر بھاگے اعدائے دیں
مقام پلونا پہ کر لے خیال — ہزیمت اسے کہتے ہیں اے شغال
اگر اس سے کر لے تو قطع نظر — تو حق پر ہیں ترکان سینہ سپر
یہ حملے ہیں تیرے زراہ حسد — تو رکھتا ہے سلطان ترکی سے کد
تجھے خواہش وسعت روس ہے — انھیں کوشش حفظ ناموس[۳] ہے
تو لایا پئے ملک گیری سپاہ — ادھر حفظ ترکی فقط ارزم[۴] خواہ
تو رہزن ہے ترکی کا وہ پاسباں — عسس[۵] وہ ہیں تو دزد تیرہ رواں
بڑھایا ہے تو نے طمع سے قدم — وہ ہیں مالک ملک روم و عجم
بفضل خداوند گیتی پناہ — فروزندۂ شمع خورشید و ماہ
بروح رسول[۶] بشیر و نذیر — بتائید تیغ جناب[۷] امیر

---

[۱] مقام کا نام ہے [۲] اس جگہ سے روس اور ترک کا موازنہ ہے اور نہایت دلچسپ اور جامع ہے [۳] اپنی عزت اور آبرو کا بچاؤ مجاہدین مسلمین کبھی سبقت نہیں کرتے [۴] لڑائی پر آمادہ کرنے والی [۵] نگہبان۔ چوکیدار۔ اندھیری راتوں میں چھپ چھپ کر چلنے والا۔
[۶] جناب رسول خدا بشارت دینے والے اور ہدایت کرنے والے محمد مصطفیٰ [۷] جناب علی مرتضیٰ فاتح بدر وحنین جن کی ذوالفقار اور جن کی عدیم المثال شجاعت تاریخ اسلام کے زریں کارنامے ہیں۔

بہ سعی دلیران رستم خصال　　بہ تدبیر ترکان عالی خیال
بہ آہ اسیران مظلوم جنگ　　بہ تیغ و بہ خنجر بہ توپ و خدنگ
کرے گا فلک تجھ کو زیر زمیں　　تبہ ہووے گی بر سر فوج کیں
وہ ٹرکی وزیر اقالیم غیر　　خرد جن کی کرتی ہے عالم کی سیر
یہ باضابطہ[۱] ان کا ارشاد ہے　　وہ ارشاد صحت کا بنیاد ہے
کہ ان روزوں مدحت[۲] کے نسبت خبر　　جو شائع ہے وہ ہے غلط سربسر
وہ ہرگز نہیں قاصد شاہ روم　　یہ اخبار والوں کی بیجا ہے دھوم
جو ہے حفظ دار الخلافت ضرور　　یہ دیتے ہیں حکم افسر ذی شعور
کہ از لشکر زائد رومیاں　　بنے شاہی گارد کی اک فوج یاں
یہ فرماتے ہیں لارڈ سالسبری　　کہ انگلینڈ اس جنگ سے ہے بری
نہیں سر اُٹھانے کا ان کو محل
وہ کیوں عیش میں اپنے ڈالیں خلل

وقائع دہم اگست ۱۸۷۷ء

اُٹھا ہے یہ ترکی میں طوفان جنگ　　کہ ہر سمت ہوتا ہے سامان جنگ
مقولہ ہے یہ اہل تاریخ کا　　کہ عالم میں ہے دور مریخ[۳] کا
شرر ریز ہے مہر گیتی فروز　　بھڑک اُٹھے سن شعلۂ امن سوز
عطارد[۴] ہے مصروف تدبیر رزم　　کیا رقص بسمل کا زہرہ نے عزم
زحل[۵] کے نظر ان کے انجم پہ ہے　　دماغ عدو چرخ ہفتم پہ ہے
خریدار جان جہاں مشتری[۶]　　جسے چرخ سادس پہ ہے افسری

---

۱ اصلی۔ سچی۔ باقاعدہ۔ مستند ۲ مدحت پاشا ایک فرضی شخص ۳ مریخ ایک سیارہ کا نام ہے جس کا اثر قتل اور خونریزی ہے یہاں سے نجوم و فلکیات کے تلازمے نہایت شاعرانہ انداز سے برتے گئے ہیں ۴ ایک دوسرا ستارہ ۵ ایک دوسرا ستارہ ہے جو ساتویں آسمان پر ہے۔
۶ مشتری ایک ستارہ ہے۔ عربی میں خریدار کو بھی کہتے ہیں۔

نہ باقی رہا جسم سے ساز روح ۔۔۔ سوئے نسر طائر[1] ہے پرواز روح

نگاہیں کواکب کی ہیں فتنہ زا ۔۔۔ مہیا ہیں اسباب رزم و وغا

ملا بحر اسود میں اس کا ثبوت ۔۔۔ بنے تار پیڈو باشکال حوت[2]

قمر اس سے کرتا ہے چندے دریغ ۔۔۔ مگر وہ بھی بنتا ہے مانند تیغ

رہا اب نہ ہرگز لڑائی میں شک ۔۔۔ مسلح ہے قوس[3] و قزح سے فلک

جو منظور ہے قطع نخل حیات ۔۔۔ ہیں آرہ کے اب کہکشاں[4] میں صفات

زبس سوئے مغرب ہے جنگ و جدل ۔۔۔ سنانیں تہیں ہیں دو شاخ حمل[5]

کئے ہیں جو عقرب[6] نے نیش اپنے تیز ۔۔۔ ہوئی ہے ہوائے وغا در و خیز

دلوں میں حرارت کا سامان ہے ۔۔۔ مگر پشت دشمن پہ سرطان[7] ہے

ولیکن یہ ہے رائے اہل رصد[8] ۔۔۔ کہ ہے طالع ترک برج اسد[9]

نظر آیا یہ دیدۂ غور سے ۔۔۔ کہ ہے واسطہ روس کو ثور[10] سے

نتیجہ یہ ہے نزد اہل شعور ۔۔۔ اسد کو ظفر ثور پر ہے ضرور

مگر بندھ گیا ہے کچھ ایسا سماں ۔۔۔ کہ مدت تلک ہوں گی خونریزیاں

خبر دیتے ہیں یہ وقائع نگار ۔۔۔ کہ یونان بھی ہے مائل کارزار

---

[1] نسر طائر و نسر واقع دو سیارے ہیں ایک بلندی کی طرف جاتا ہے دوسرا پستی کی طرف آتا ہے نسر گدھ کو کہتے ہیں ان ستاروں کی شکل گدھ سے ملتی ہے [2] حوت ایک برج ہے اس کی شکل مچھلی کی ہے اور بربادکن کشتی کی شکل بھی مچھلی کی سی ہوتی ہے [3] دھنک [4] کہکشاں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا ایک سلسلہ یا مجمع النجوم ہے جس کو شاعر اکثر زلف معشوق یا مانگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اکبر کی تشبیہ نہایت عمدہ ہے واقعی دیکھنے میں ستارے آرے کے دندانے معلوم ہوتے ہیں اور جیسے آرہ لکڑی کو بیچ سے دو کر دیتا ہے ویسا ہی کہکشاں فضائے فلکی کے دو حصے کر دیتی ہے [5] ایک برج کا نام ہے جس کی شکل مینڈھے کی سی ہوتی ہے نکیلی سینگیں ہوتی ہیں [6] بچھو کی شکل کا ایک برج ہے۔ [7] سرطان۔ کیکڑے کی صورت کا ایک برج ہے [8] نجوم کے ماہر جو پیشین گوئیاں کرتے ہیں [9] شیر کی شکل کا ایک برج ہے اگر کسی کا ستارہ اس میں پڑ جائے تو اسے ہر مہم میں کامیابی ہوتی ہے [10] ثور ایک دوسرا برج ہے اس کو الٹ دیجئے تو روث ہو جائے گا تلفظ اور آواز میں کوئی فرق نہیں س اور ث کی صدا ایک ہی ہے۔

فریب عدو کھا کے پھر غش ہوا — جو ہے سرویہ[1] وہ بھی سرکش ہوا
ہوا آمد روس سے پر غرور — شریک دغا ہوں گے دونوں ضرور
زہے شان نیرنگی باغ دہر — کہ چشمہ کو آئے سمندر کی لہر
تموّج کا قطرہ کو ہو ادعا — بنے ذرہ خورشید ساں خودنما
سر شعلہ اُٹھے باوج قمر — ہوا بر رواں برق کا ہم سفر
کھلیں پر مگس کے بہ طیر عقاب[2] — بنے ہمصفیر عنادل غراب[3]
سنانوں سے لیں نوک کی سوزنیں — سروں سے بلندی کریں گردنیں
کریں دف[4] ہم آوازی طبل[5] جنگ — بڑھے کوس[6] و قرنا[7] سے بھی جل[8] ترنگ
غلاموں کو آقا سے ہو ہمسری — کرے سرویا دعوی سروری
یہ ہیں سرویہ کے خیالات خام — وہ سرونٹ[9] ہے اس کا سروس[10] ہے کام
وہی ہے یہ سرویہ خود پرست — کہ سال گذشتہ میں کھاکر شکست
ہوا تھا بہ عجز و ادب صلح خواہ — بدرگاہ سلطان عالم پناہ
دکھایا ہے پھر روس نے سبز باغ — کہ بدلا ہے پھر اس کا رنگ دماغ
مری عقل ہے اس پہ حیرت سے دنگ — کہ میلن[11] کو پھر کیوں ہے میلان جنگ
یہ آیا ہے کیا اس کے دل میں خیال — کہ ترکوں سے کرتا ہے عزم جدال
وہ یورپ میں سکہ بٹھائے ہوئے — یہ ہیں نقد جاں تک گنوائے ہوئے
ادھر ان سے لرزاں شہنشاہ روس — ادھر تاج اس کا ہے تاج خروس[12]
وہ روم و عجم کا شہ باجلال — یہ اک صوبۂ خُرد آشفتہ حال
وہی حضرت زار میں شیخ نجد — کہ دیدے کے لکچر دلاتے ہیں وجد

---

[1] ایک مقام کا نام ہے [2] عقاب کی طرح اُڑنے کے لئے جو ناممکن ہے [3] کوّا کبھی بلبل کی طرح گا نہیں سکتا۔
[4] [5] [6] [7] [8] مختلف باجوں کے نام ہیں [9] Servant نوکر [10] Service نوکری۔ غلامی۔ سرویہ کا ایک حصہ سرو Serve کے معنی غلامی کرنے کے ہیں۔ [11] سرویہ کا بادشاہ۔
[12] مرغ کے سر پر جو گچھا ہوتا ہے وہ تاج خروس کہلاتا ہے۔

یہ تہدید[۱] و تحریص و ترغیب زر　　بڑھاتے ہیں امید کو تہ مگر
وہ خود پھر رہے ہیں بصد اضطراب　　کریں اپنے ساتھ اب اسے بھی خراب
مگر شاہ یوناں بایں عقل و ہوش　　رہے کیوں نہ خاموش و پنبہ[۲] بگوش
وہ کیوں چھوڑ کر آتے ہیں کارگاہ[۳]　　بہ شوق تماشائے جنگ و سپاہ
اُٹھائیں گے ناحق یہاں آ کے چوٹ　　پڑیں گے عبث خون دل کھا کے چوٹ
بگرداب جنگ آ کے پھنستے ہیں شاہ　　کہیں ہو نہ یونان کا تختہ تباہ
ہے روشن کہ ترک سلیم المزاج　　نہ ایذا رساں ہیں نہ خواہان باج
نہ ہمسایہ کے ملک لینے کا شوق　　نہ تیغ آزمائی ہیجا[۴] کا ذوق
بہ آئین دلچسپ و طرز نکو　　شب و روز رہتے ہیں یہ نیک خو
بہ صولت بہ ہیبت بہ عز و وقار　　حکومت پہ ترکی کے ہیں استوار
محبت سے ملئے جو ان سے بہم　　برس پڑتے ہیں مثل ابر کرم
ولیکن عدو ہو جو ہیجا[۵] طلب　　تو ہوں اس کے خرمن کو برق غضب

× × × × ×

تری حد فرماں ہے ایسی وسیع　　کہ انگلینڈ ہے ایک ادنیٰ مطیع
سفیروں کو ہے تیرے غصہ کا خوف　　تری بارگہ کا وہ کرتے ہیں خوف[۶]
یہ سب کچھ ہے حاصل تجھے میں گواہ　　مگر جنگ ترکاں خدا کی پناہ
۷ یہ زیر فلک ہے وہ قوم دلیر　　کہ غصہ سے دیکھیں تو ڈر جائے شیر
اگر کوہ سے ہوں یہ سرگرم جنگ　　اُڑیں ہوش کی طرح ذرات سنگ
جو دریا پہ یہ تیرباری کریں　　رگ موج[۸] سے خون جاری کریں

---

۱ سب قانونی الفاظ ہیں ۲ کان میں روئی دینا جس میں کچھ سن نہ سکے اور خاموش رہے۔ اُردو میں کان میں تیل ڈالنا استعمال ہوتا ہے ۳ محل ۴ یہ نہیں کہا کہ تیغ آزمائی کا شوق نہیں ہے صرف نامناسب طور پر تلوار نہیں چلاتے۔ ۵ لڑائی۔ × ×× یہاں پھر سلسلہ نہیں ملتا ۶ محرر کی غلطی ہے غالباً طوف صحیح ہے۔ ۷ یہاں سے دوسرا موازنہ شروع ہوتا ہے ۸ کیسی شاعرانہ تصویر کھینچی ہے۔ فردوسی والے "خوں بہ جیحوں رسید" سے موازنہ کیجئے۔

مقابل جو ہوان سے دیو سفید　　سر اس کا شکستہ ہو مثل امید[۱]
بہادر ہیں منصف ہیں دیندار ہیں　　دلاور ہیں مرنے پہ تیار ہیں
جفاکیش[۲] خوش خلق یزداں پرست　　بہرحال یاد الٰہی میں مست
نہیں کرتے اوروں پہ یہ ظلم و جبر　　ترائی میں آسودہ ہیں چوں ہزبر[۳]
یہ دیگر ممالک کے طالب نہیں　　تجھے ان سے لڑنا مناسب نہیں
تری فوج اگر ان سے لڑ جائے گی　　بنی تیری عزت بگڑ جائے گی
یہ ساماں ترا ہے سراسر سراب[۴]　　ترے سارے خیمے ہیں مثل حباب
ہوا بھر گئی ہے ابھر آئے ہیں　　یہ دم بھر کو پیش نظر آئے ہیں
ہٹا دے لب بحر سے اپنی فوج　　کہ ساحل سے ٹکرا کے پھرتی ہے موج
ترا خوں لٹائے گی یہ آب جو　　گنواتا ہے دریا پہ کیوں آبرو
ذرا اپنی حالت پہ تو غور کر　　کہاں تو کہاں ترکی نامور
تو یاں فوج میں خود بحال تباہ　　تباہ و پریشاں بصد پیچ و تاب
چھٹا تجھ سے ہے سینٹ پیٹرس برگ[۵]　　لئے پھرتی ہے تجھ کو پیری میں مرگ
ادھر ہے وہ سلطان عالم پناہ　　ثریا[۶] جناب و فلک بارگاہ
بصد طرب تخت پر جلوہ گر　　نثار اس پہ ہوتے ہیں شمس و قمر
وہ ہے زیب ایوان فرماندہی　　اسی کو ہے دور قمر میں مہی[۷]
وہ ہے زینت مسند داد و دیں　　ہے سایہ فگن اس پہ عرش بریں
وزیران ترکی ارسطو خیال　　صفیران دانا و شیریں مقال
جوانان ثابت قدم مثل کوہ　　یلان زبردست رستم شکوہ
شب و روز خدمت میں حاضر ہیں سب　　بحفظ قواعد بہ طرز ادب

---

۱ جیسے امید ٹوٹ جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ امید کو امید مجسم مان لیجئے تو مزہ اور بڑھ جائے ۲ میری رائے میں صحیح لفظ دغا رہا ہوگا۔ محرر کی غلطی ہے ۳ شیر ببر ۴ بالو۔ ناپائدار۔ غیر مستقل ۵ روس کا دارالسلطنت ۶ ایک بلند ستارہ ۷ بزرگی اور مہی اور مہ میں مناسبت ہے۔

حوادث پہ ہر سمت در بستہ ہے　　صف جاں نثاراں کمر بستہ ہے
ادھر تجھ پہ سایہ فگن ہے صلیب　　اُدھر رحمت حق ہے اُن سے قریب
تو مخدوم ارباب کبر و جفا　　وہ ہیں خادم کعبہ حق نما
تجھے ملک گیری کا ہر بار شوق　　انھیں ہے قناعت میں طاعت کا ذوق
تو اے بحر اسود[۱] کے کہنہ نہنگ　　ترائی میں شیروں سے کرتا ہے جنگ
اجل سے ادھر ہر طرح حفظ جاں　　شہادت کا مشتاق ادھر ہر جواں
برانڈی[۲] ادھر رہزن عقل و ہوش　　دلوں میں ادھر رنگ ایماں کا جوش
ہزار ایڈرس[۳] جی بڑھانے کو یاں　　شہادت کا کلمہ ادھر بر زباں
ادھر بحر ڈینوب[۴] کے پل پہ ناز　　ادھر ان کو ہے بس توکل پہ ناز
ادھر توپ خانوں کا جنجال ہے　　جلو میں ادھر فتح و اقبال ہے
خمر ریز ہے یاں جو توپ کرب　　تو واں ان کی چتوں ہے برق غضب
ادھر پائے رفتار تک مضمحل　　ادھر زور بازو سے رستم خجل
ادھر مثل روباہ سو بندوبست　　ادھر شیر کی طرح سے ایک جست
دلوں میں ادھر وقت ہیجا دہل[۵]　　ادھر کیا مجال آئے چتوں پہ بل
جواب اس کا دیتا ہے یہ زار زار[۶]　　کہ اس کا تو خود ہے مجھے انتشار
نہیں ہے ترود کا کچھ بھی مقام　　با فضال عیسےٰ علیہ السلام
اگر ہوئے گی یونہی پیہم شکست　　تو ہے[۷] بھاگنے کا بھی سو بندوبست
سلامت رہے اپنی راہ فرار　　کہ جس نے بچایا ہمیں بار بار
کہاں ہیں وہ اب جنرلاں سخیف　　جو کہتے تھے ٹرکی ہے بالکل ضعیف
کہاں ہیں وہ کمبخت مضمون نگار　　جو کہتے تھے ٹرکی ہے بیمار و زار

---

۱ Black Sea ۲ گھڑیال ۳ شراب ولایتی ۴ Address ۵ موعظے ۶ ایک دریا کا نام ۷ دہل۔خوف۔ دہل اور دہل (طبل جنگ) میں مناسبت ہے ۸ پہلا زار نام ہے روس کے بادشاہ کا دوسرے زار سے مطلب ہے کمزور نحیف پریشان حال ۹ یہ فقرے کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے غالباً 'د' کی جگہ 'ڈ' ہے ۱۰ واہ کیا بہادری ہے۔

بلا میں پھنسایا مجھے بے سبب — نصیبوں میں خفت ہی خفت ہے اب
مگر دل میں آتا ہے اکثر خیال — کہ ہیں کم بہت ترک آشفتہ حال
مرے پاس افواج ہیں بے شمار — کہاں تک لڑیں گے یہ ترکی سوار
سناؤں تمہیں اب رومیلاؔ[۱] کا حال — جہاں ہیں سلیمان نیکو خصال
جو بلکن میں ہے فوج اعدا مقیم — سلیماں کو ہے ان کی فکر عظیم
عدو پر ہیں وہ حملہ آور مدام — بافواج ترکی سحرگاہ و شام
زبس حملہ ہر وقت و ہر آن ہے — بہت فوج اعدا پریشان ہے
یہ بلگیریا کی سنو اب خبر — شمالی بلکن پہ رکھو نظر

اس کے بعد جتنے شعر رہے ہوں کچھ پتہ نہیں شاید کافی تلاش کے بعد عشرت صاحب کے گھر کے کتب خانے سے مل جائیں تو مل جائیں ورنہ اور کہیں سے تو اُمید نہیں ہے۔

۱؎ ایک مقام کا نام ہے ۲؎ بلکن دو حصوں میں تقسیم ہے جسے اب بلقان کہتے ہیں جنوبی اور شمالی۔ شمالی بلقان میں اضافت زاید ہے مگر مستند شاعر کے لیے جائز ہے۔

دوم

دوپہر

زمانہ زیر تبصرہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۳ء تک ہے اس زمانہ کے حالات حیات کوشش بلیغ کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے۔ بہر طور جیسا عنوان سے ظاہر ہے آفتاب سخن اپنی انتہائی معراج تک پہنچ چکا تھا اور اکبر نہ صرف غزل گو شاعر بلکہ نقاش فطرت لسان العصر اور مصلح ہوتے جاتے تھے۔

غدر کے بعد طبیعتوں کا رنگ بالکل بدل گیا تھا۔ تعلیم، معاشرت، اعتقادات، اخلاق وضع سب کے سب مغرب کی کورانہ تقلید میں ملفوف ہو گئے تھے۔ زبان پر انگریزی کے غیر ضروری الفاظ جن کے لطیف مترادف اُردو میں موجود تھے۔ چڑھے ہوئے تھے۔ بابو شاہی اُردو کے متعلق اکبر کے چند شعر (جو غیر مطبوعہ ہیں اور اکبر حسین صاحب سے ملے ہیں) حاضر ہیں

لنڈن سے ہو کے ہنڈ میں جب آتے مانگتا گاڑی میں جورو لوگ کو بٹھلانے مانگتا

ہم مانگتا سیگار ولایت کا سیگریٹ اور یہ لوگ دیسی چرٹ لانے مانگتا

مٹ بولو ایسا بات کہ ہم دیسی لوگ ہے "صاحب" کا نام ڈل کو بہٹ بھانے مانگتا

ہم باپ دادا لوگ کو پاگل بنا دیا یورپ کا ڈھنگ ہند میں پھیلانے مانگتا

اکبر نے صاف کہدیا کیا خوب یہ غزل

جو لیڈی لوگ باجے پہ ہے گانے مانگتا

فیشن کا زور شور تھا۔ قدیم رسوم و خیالات نہ صرف ترک کئے جاتے تھے بلکہ ان کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ نئی اور پرانی روشنیوں میں سخت تصادم تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مفقود ہو رہی تھی۔ پردہ دری اور پردہ داری کے مباحث بڑھتے جاتے تھے۔ سرسید احمد چندہ اور کالج کی تحریکات میں سرگرم تھے۔ اکبر فطرتاً اعتدال پسند تھے وہ نہ تو

سرسید کی عظمت اوران کے کام کی وقعت سے چشم پوشی کرتے تھے نہ بے جاحملوں کی عادت تھی وہ روشن ضمیر تھے اور چاہتے تھے کہ انقلابات بتدریج ہوں۔

انہیں۔علمی، معاشرتی، مدنی۔سیاسی، اخلاقی اور مذہبی میدان اصلاح و دانش کے لئے ملے اور ان کی زندگی کا حقیقی مشن پورا ہونے لگا۔ظرافت، شوخی اور زندہ دلی جو پہلے ذرا دبی زبان اور ملائم لہجہ میں پوشیدہ تھی اب اپنے شباب پر پہنچ گئی۔وطن پرستی کے جذبات بھی اُبھرآئے۔اکبر Conservative متعصب وقدامت پسند نہ تھے۔وہ روحانیات کے سامنے مادہ پرستی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔اُن کی تعلیم یہی تھی کہ نئی اور پرانی روشنی کے ہرشعبہ میں خوبیاں بھی ہیں بُرائیاں بھی۔دونوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھاؤ یہ نہیں کہ مغرب کی تقلید اندھا دھند کرو اور مشرق کی تمام باتوں کو حرف غلط کی طرح لکیر کے فقیر بن کر مٹادو۔پردہ، یا علیگڈھ کی تحریکات یا فیشن کے متعلق لوگوں کو بہت غلط فہمیاں ہیں کہ اکبر نے ان مسئلوں پر منصفانہ انداز سے بحث نہیں کی ہے لیکن کلام اکبر کے ہر موضوع پر مجموعی حیثیت سے غائر مطالعہ کیا جائے اور ماحول وفضا کا خیال رکھا جائے تو ان کی اعتدال پسندی اور انصاف پرستی ظاہر ہو جائے گی۔

۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف ہوئے۔

۱۸۸۱ء میں دوئم درجہ کے منصف ہوکر خورجہ گئے

وہاں سے سید احمد اور سمیع اللہ صاحب نے کوشش کر کے ان کو علیگڈھ بلایا۔

"لوڈورو" والی نظم وہیں لکھی گئی ہے۔نثر کی کتابیں بھی وہیں ترجمہ ہوئیں۔

۱۸۸۲ء میں درجہ اوّل کے منصف ہوگئے اور ۱۸۸۶ء تک رہے۔

۱۸۸۸ء سب جج مقرر ہوئے۔بہت جلد درجہ اوّل پر ترقی ہوئی۔

۱۸۹۴ء میں مستقل جج عدالت خفیفہ الہ آباد مقرر ہوئے۔اُسی سنہ میں ڈسٹرکٹ سشن ججی کے لئے مقرر ہوئے۔

الہ آباد۔جھانسی۔مین پوری۔بنارس اور سہارنپور میں ججی کی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے۔

۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا اس موقعہ پر ایک شعر فرمایا تھا۔

عاشقانہ دادیہ اچھی تو ملی مجھ کو چرخ نے — تیغ ابرو کا تھا عاشق خان بہادر کر دیا

۱۸۹۹ء میں ہائی کورٹ کی ججی پیش کی گئی اور قرار پایا کہ ایکمین صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد وہ مقرر ہوں ؎

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل — کس قدر ہیں خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

آنکھوں کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ ریٹائر ہو گئے۔

بحرین

سودی اور اکبر

شانِ نزول

علیگڑھ میں ایک Penny Club قائم تھا اسی کے لئے دوپہر کے چار گھنٹوں میں یہ نظم عشرت صاحب کے پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی

سدے انگلستان کے قرونِ وسطیٰ کا ایک باکمال شاعر تھا۔ حضرت اکبر نے ضرورتِ شعری کے لحاظ سے سہی اس کے نام کے تلفظ میں "و" کا اضافہ فرما کر، لفظ مذکور کو ادبِ اُردو سے بہت زیادہ مانوس فرما دیا۔ اس کی مشہور نظم لوڈور کا آبشار اپنے رنگ میں سرتاج مانی گئی ہے میں نے اس نظم کو ۱۹۱۸ء میں دیکھا تھا نظم نہیں ہے ایک قادر مصور کی بہترین تصویر ہے کہاں لوڈور کہاں الٰہ آباد! لیکن باور فرمائیے نظم مذکور کے چند اشعار پڑھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں عین منظر پر موجود ہوں اور آبشار منظوم مادی حیثیت سے میرے سامنے جلوہ ریز ہے۔ الفاظ کا سحر اور طرزِ بیان کا جادو پڑھنے والے کے چشم و گوش پر ایسی حالت سکون و سکوت طاری کر دیتا ہے کہ گرد و پیش کی کوئی دوسری صدا مسموع نہیں ہوتی اور صفحۂ قرطاس، مرقعِ کوہستانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مگر یہ نظم ابنائے وطن کے صرف اُسی طبقہ تک سامعہ نواز تھی جو زبان انگریزی سے واقفیت رکھتا ہے۔ اکبر نے اس نظم کا جواب لکھ کر نہ صرف ادبِ اُردو پر احسان کیا بلکہ تمام حضرات پر بھی جو انگریزی سے نابلد ہیں۔ حضرت اکبر کی نظم اپنے تمام محاسن کے ساتھ پیش کی جاتی ہے میں خود جس قدر متاثر ہوا ہوں اس کا اظہار اجمالی طور پر نثر میں حاضر ہے۔ میری یہ تحریر نہ تبصرہ ہے نہ مقدمہ، نہ تنقید ہے نہ تعریف، صرف اپنے جذبات کا ایک خاکہ ہے بہر طور اب نظم شروع ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

وہ سودی سخن گوے شیریں مقال ۱ جو انگریزی شاعر تھا اک بے مثال

اس شعر کے بارے میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غیر ضروری متعلقات سے پرہیز کرنا اور ہر واقعہ کو پوری قدرت کے ساتھ بلاواسطہ ظاہر کر دینا اکبر کی خصوصیات میں داخل تھا، دیکھ لیجئے چند ہی لفظوں میں موصوف نے سودی کو زبان اُردو سے متعارف کر دیا ہے اور لطف یہ کہ کوئی ضروری بات نظر انداز ہونے نہیں پائی۔

بہ فرمائش دختر با تمیز ۲ کہ رکھتا تھا جس کو وہ دل سے عزیز

لکھی اس نے ہے نظم اک لاجواب ۳ دکھائی ہے شکل روانی آب

جو بہتا ہے پانی میان لوڈور ۴ اُسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور

دوسرے شعر میں نظم کی شان نزول دکھائی گئی ہے اور باوجود کمال اختصار کے نفس مفہوم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سودی کے کئی چھوٹی بڑی لڑکیاں تھیں۔ ایک روز یہ سب لڑکیاں اپنے باپ کے پاس باری باری آئیں اور مچل گئیں کہ ہم کو اجازت دیجئے ہم تو آج لوڈور کے آبشار کی سیر ضرور دیکھیں گے شاعر نے اپنے حالات کے لحاظ سے نادان لڑکیوں کو بہلایا اور وعدہ کیا کہ میں تم سب کو لوڈور کے آبشار کی سیر یہیں سے بیٹھے بیٹھے کرادوں گا۔ معاملہ طے ہو گیا اور یہ معرکۃ الآرا نظم زیب قرطاس کی گئی۔ سودی! میں تجھ کو تیرے وعدہ کی عالمگیر کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں کاش تو آج زندہ ہوتا اور دیکھتا کہ اس معمورۂ عالم کے ہر گوشہ خاموش سے فطرت پرست آنکھیں تیری رشک آئینہ نظم کی مدد سے لوڈور کے آبشار کی سیر کر سکتی ہیں۔ 'دکھائی ہے شکل روانی آب' اس مصرعہ سے سارے مضمون کا لب لباب بتا دیا گیا ہے یعنی روانی آب چوتھے شعر میں تعین مقام کر دیا گیا ہے۔

مناسب جو انگلش مصادر ملے ۵ مقفیٰ گئے اُن سے سب سلسلے

یہ جمعیت افعال کی خوب کی ۶ کہ درسی بھی ہے اور دلچسپ بھی

پانچویں شعر میں بات کی بات کہہ دی اور مصادر کی مناسبت سے مقفیٰ کرنے کی سہولت بھی واضح ہو گئی۔ یہ ہے اعجاز کلام کہ نکتہ شناس نگاہوں کے لئے الفاظ کے سادہ پردے سے

ہزاروں انوار ساطع ہوئے جاتے ہیں۔ جمعیت الفاظ کی ترکیب حسن بیان کی شاہد ہے واقعی سودی نے انگریزی کے قریب الصوت افعال اس طور پر جمع کئے ہیں کہ اُن کا مطالعہ علم طلب حضرات کے لئے گنجینۂ درسیات ہے اور برابر کی آوازوں کا لطیف زیر و بم فطرت پرستوں کے واسطے دلربا ہے

یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن ۷ کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن
دکھاؤں روانی دریائے فکر ۸ کہ گوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر

بھائی حسن سے چھوٹے بھائی اکبر حسن مراد ہیں طرز بیان کی شستگی اور نشست الفاظ کی سادگی جس قدر اثر رکھتی ہے اُس کا اندازہ شعر پڑھ کر فرمالیجئے۔ بول چال اور روزمرہ اس قدر عام ہے کہ اگر آپ اس شعر کو جامۂ نثر پہنانا چاہیں تو بھی حالت موجودہ سے زیادہ صفائی نہیں پیدا ہو سکتی۔ لوازم منظر کے لئے رعایت کے تمام الفاظ بحر۔ غوطہ زن۔ روانی۔ دریا۔ گوہر شناس۔ سب موجود ہیں لیکن زور کلام اور صفائے بیان کی یہ حالت ہے کہ آورد کہیں سے معلوم ہی نہیں ہوتی۔

عجب ہے نہیں اُن کی اس پر نظر ۹ کجا میں کجا سودی نامور

اظہار خاکساری کا پہلو کس قدر لطیف ہے کہ خود اور سودی میں امتیاز کرتے وقت اُن کو بھائی حسن پر تعجب ہوتا ہے ان دو لفظوں (عجب ہے) میں خدا جانے کتنے نکات پوشیدہ ہیں۔ بھائی حسن کا جذبہ خلوص مضمر ہے اور شان فیصلہ بھی مستتر ہے۔

سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں ۱۰ نہیں سہل اس راہ کی منزلیں

اکبر نے محسوسات و جذبات انسانی کا وہ مکمل مطالعہ کیا تھا کہ خدا کی پناہ وہ جانتا تھا کہ ظاہر پرست نگاہیں اس خفیف سے فرق کو جو مجھ میں اور سودی میں ہے نہ جانے کہاں تک سمجھیں اور میرے اظہار خاکساری کو عجز و قصور سے تعبیر کریں اسی لئے دوسرے شعر میں اور مشکلات کا ذکر کر دیا اکبر کو معلوم تھا کہ فطرت انسانیہ درک مفہوم میں کس قدر مختلف ہے دوسرے مصرعہ میں ہندوستان کے مغرب پرست طبقہ کو متنبہ کیا ہے کہ یک من نقل را ده من عقل باید، انگریزی نظموں کی تاسی میں غیر مانوس تراکیب کا استعمال سہل، غیر مروج

بحور کا اختیار آسان، لیکن فطری شاعری کے منازل کو ذمہ دار شاعر کی حیثیت سے طے کرنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ منازل کی چند مشکلات بالترتیب ملاحظہ فرمائیے۔

مرے پاس سرمایہ کافی نہیں ۱۱ وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں
زباں میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق ۱۲ ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق

گیارہویں شعر کے پہلے مصرعہ میں اُردو کی کم مایگی پر اظہار حسرت ہے دوسرے مصرعہ میں مصدر کا لفظ صحیح مطالعہ زبان انگریزی کی تصویر ہے۔ انگریزی مصادر اُردو کی نسبتاً اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کے یکجا کرنے میں شاعر کو نہایت سہولت ہوتی ہے علاوہ اس کے مصادر کو قوافی بنانے میں کسی نئے لفظ کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہوتی صرف چند حروف کے وصل سے قافیہ بھی چست ہو جاتا ہے اور مفہوم بھی۔ سودی کی ساری نظم میں خاص بات یہی ہے کہ قریب الصوت مصادر کی جمعیت نے لطف قافیہ اور لذت ترنم پیدا کر دیا ہے بارہویں شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی کمی وسعت اور اختلاف مذاق دو چیزوں کا ذکر ہے۔ کمی وسعت کی شکایت کس قدر عبرت خیز ہے کاش ادب اُردو کے حامی اس طرف توجہ فرمائیں۔ زبان انگریزی کو جو وسعت آج نصیب ہے اُس کا معتد بہ حصّہ صرف اُن تراجم کا شرمندۂ احسان ہے۔ جو غیر زبانوں سے کئے گئے ہیں۔ ترجمہ کے خاص فوائد یہ ہیں کہ اپنے وطن میں مختلف علوم و فنون کا اجرا ہوتا ہے اور جدید محاورہ جات والفاظ، مصطلحات و تراکیب کا دلکش اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کمی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ اختلاف مذاق کا ذکر بھی کم سبق آموز نہیں ہے۔ مترجم حضرات کو یہ بات کبھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ غیر زبان کو اس عمدگی و خوبصورتی سے متعارف کریں کہ اپنی زبان سمجھنے والوں کو درک مفہوم میں دقت نہ ہونے پائے اس لئے کہ ترجمہ کی خاص مگر عام کمزوری ارتقاء زبان کے لئے نہایت مہلک ہے۔ دوسرے مصرعہ میں طمطراق کا لفظ اس عمدگی سے نظم ہوا ہے کہ اکبر کی فطری ظرافت برسی پڑتی ہے۔

اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط ۱۳ روانی میں پیدا نہ ہو ربط ضبط

اس شعر میں ترجمہ کی سب سے بڑی مشکل ظاہر کی گئی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ صحیح ترجمہ کسی ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں محال عقلی ہے میں نے مرحوم سے بھی یہ بات

ظاہر کی تھی اور اُن کو بھی میری اس رائے سے اتفاق تھا بات یہ ہے کہ ہر زبان کے لفظ و محاورے ظاہری معنوں کے علاوہ کچھ ایسے خاص معانی و مفاہیم کے حامل ہوتے ہیں جن کا انتقال کسی دوسری زبان کے ایک ہی لفظ یا محاورے میں نہیں ہو سکتا اب اگر اس دقت کو رفع کرنے کے لئے ہر لفظ یا ہر محاورہ کی تشریح میں ایک ایک جملہ لکھا جائے تو ترجمہ کا نفس غلط ہوتا ہے۔ معانی میں ربط ضبط پیدا کرنا معمولی کام نہیں ہے مترجم کا دماغ خود لذت ترجمہ سے اس قدر متاثر رہتا ہے کہ بہ نفس خود محک معانی نہیں بن سکتا۔ مترجم دونوں زبانوں سے واقف ہوتا ہے لہذا معانی کی خفیف دقیتیں اُس کی نگاہوں میں بہت سبک رہتی ہیں مگر جب صرف ایک ہی زبان کا جاننے والا پڑھتا ہے تو یہی خفیف سی دقیتیں سارا مطلب خبط کر دیتی ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ مترجم جو اس نکتہ کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس قسم کی کمی سے پرہیز فرماتے ہیں۔

موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں ۱۴ مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں

موانع کا لفظ کس قدر جامع ہے۔ اکبر کو انتخاب الفاظ پر وہ قابو تھا جس کی نظیر کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ موانع میں ذکر اشکال تو ضرور ہے لیکن ہمت نصیب حضرات کے لئے دعوت عمل کا سرمایہ بھی موجود ہے۔ دوسرا مصرعہ حسن آمد کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اور ایسا مکمل محاورہ ہے جو اگر آج نہیں تو کسی دن عام طور پر زبان زد ہو جائے گا۔

جو تھیں دقیتیں کہہ چکا بر ملا ۱۵ غرض دیکھئے اب وہ پانی چلا

دوسرا مصرعہ کس قدر سجا ہوا ہے۔ غرض کی لفظ سے اختصار صحیح کا کام لیا گیا ہے "دیکھئے" شوق افزا بھی ہے اور ایسا اشارہ موثر ہے کہ ناظر کا دماغ واقعی محسوس کرنے لگتا ہے کہ مشارٌ الیہ مستتر یعنی آبشار سامنے ہے اور پانی کی رفتار شروع ہو گئی ہے۔ ایشیائی شاعری میں "گریز" نہایت اہم چیز ہے۔ تشبیب اور تمہید کے بعد اس طرح گریز کرنا چاہئے کہ تسلسل قائم رہے اور دماغ مخاطب اس جدید عرصۂ مفہوم کی طرف بآسانی منتقل ہو جائے۔ گریز کی ایسی شاندار مثال میری نگاہوں میں نہیں ہے۔

اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا ۱۶ اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

وہ خوش نصیب حضرات جنھوں نے آبشاروں کی سیر اس کے مخزن سے فرمائی ہے اس شعر کا لطف اُن کے لذت اندوز دل سے پوچھئے۔ روانی کی سب سے پہلی کیفیت کے لئے یہ چاروں جامع مصادر چار دفاتر ہیں جن کی لذت و فرحت ہر شخص بقدر وسعت ادراک حاصل کرسکتا ہے۔

یہ بنتا ہوا اور وہ تنتا ہوا ۱۷ ٹپکتا ہوا اور چھینٹا ہوا

"یہ" اور "وہ" سے میرے خیال میں 'یہاں' اور 'وہاں' مراد ہے 'یہ شعر پہلی منزل کا دوسرا قدم ہے واقعی شان تسلسل اِس عنوان سے قائم رکھنا اگر فضل خداوندی نہیں تو کیا ہے؟ اتنے الفاظ جمع ہیں لیکن ہر لفظ ایک نئے مفہوم کا حامل ہے اور ہر ترکیب ترتیب فطری کا بہترین نمونہ۔

روانی میں اک شور کرتا ہوا ۱۸ رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا

پہلے مصرعہ کو شاعر کے نقطۂ نگاہ سے دیکھئے۔ ہاں ایک بات یاد آگئی میں نے مرحوم سے پوچھا تھا کہ اکثر حضرات آپ کی اس نظم کو سودی کی نظم کا ترجمہ یا اقتباس سمجھتے ہیں جس پر اُنھوں نے برہم ہوکر فرمایا تھا کہ "میری نظم میں لوڈور کے آبشار کی چھاؤں تک موجود نہیں"۔ 'روانی کا شور' پہاڑ کی سنسان گھاٹیوں میں گم کردہ راہ مسافروں کے لئے صدائے ہدایت اور فطرت پرست حضرات کے واسطے رباب دلکش ہے۔ دوسرے مصرعہ میں سائنس کا ایک خاص نکتہ ملفوف ہے۔ بہتے ہوئے پانی کی رُکاوٹ اُس کے پھیل کر بڑھنے کی وجہ ہوتی ہے اسی لئے ہر بار کی رُکاوٹ زور روانی میں اضافہ کرتی رہتی ہے اور اپنی لہروں میں قوت برقیہ کو تدریجی ترقی دیتی رہتی ہے جو حاصل کرلئے جانے کے بعد صدہا انسانی ضروریات کو رفع کرتی ہے۔

پہاڑوں کے روزن زمیں کے مسام یہ ہے کر رہا ہر طرف اپنا کام

پہلی منزل کا تیسرا قدم ہے۔ زمیں سے مراد غالباً چٹانوں کا فرش ہے اس لئے کہ ابھی تک منزل کوہی ختم نہیں ہوئی ہے۔

ادھر پھولتا اور بچکتا ادھر رخ اس سمت کرتا کھسکتا ادھر

اس پھولنے اور بچکنے کے لطف سے بھی چشم ناظر ہی خوب لذت اندوز ہو سکتی ہے۔ اتنی لطیف کیفیتیں ایسی روانی کے ساتھ بہت کم شاعر نظم کر سکتے ہیں۔

پہاڑوں پہ سر کو ٹپکتا ہوا ۲۰ چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا

بیتاب موجوں کا سر ٹپکنا کس قدر صحیح کیفیت ہے۔ دامن جھٹکنے کا محاورہ دوسری منزل کی آغاز کا مقدمہ ہے اللہ اللہ تفصیل و تشریح کی یہ قدرت کہ شاعر نے خفیف سی صراحت کو بھی حوالۂ قلم کر دیا۔ یہ وہ وقت ہے جو بہتا ہوا پانی بلند چٹانوں سے پست چٹانوں تک پہنچنے میں صرف کرتا ہے اور پانی کا جھٹکا ہوا دامن ایسی عروس کی آنچل سے مشابہ ہوتا ہے جو اپنا موتیوں بھرا دوپٹہ جھٹک کر سنبھال لے۔

وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا ۲۲ وہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا

اکبر کو جہاں غیر ضروری تفصیل سے اجتناب تھا وہاں تکرار سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی لیجئے! تیسری منزل شروع ہو گئی گرتے ہوئے پانی نے نہر کی شکل اختیار کر لی اور ساحل کا پہلو دبانا شروع کر دیا ہے محاورہ جس حسن کے ساتھ نظم ہوا ہے وہ ظاہر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں سبزہ پر چادر بچھانا سطح سبزہ و بسط آب دونوں کی صحیح تشبیہیں موجود ہیں اب ذرا اس کیفیت پنہاں کا لطف بھی اٹھائیے جو اتصال آب رواں و فرش سبزہ سے پیدا ہو جاتی ہے اس ملی جلی ہوئی دیوی کو عمداً پردہ ہائے الفاظ میں اس طور پر چھپا دیا جیسے کوئی فتنہ محشر جو تھی کی ردائے سیمیں کی گھونگھٹ میں جلوہ فروش ہو صاف صاف اس لئے نہیں بتایا کہ راز کی بات تھی اور خود سے محسوس کرنے میں جو لذت ہے وہ صاف بتا دینے میں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ مصرعہ کیا ہے ہلکے رنگوں کی ایک بیش بہا تصویر ہے۔ جس قدر غور سے دیکھئے اتنے ہی نکات ظاہر ہوتے جاتے ہیں یہی وہ خاص باتیں ہیں جو ایک کامل شاعر فرض ناظر سمجھ کر بالقصد چھپا دیتا ہے اور جو درک ہونے کے بعد ناظر کے لئے سرمایۂ روح و نازش لذت بن جایا کرتی ہیں۔

بھٹکتا ہوا غل مچاتا ہوا ۲۳ وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا

اس شعر میں گم کردہ راہ مسافر کے جذبات فطری کا صحیح مرقع کھینچا گیا ہے تشبیہ اتنی لاجواب ہے کہ دوسرے لفظوں میں کہئے تو دانتوں پسینہ آ جائے۔ بھٹکنے کا عالم صاف ظاہر ہے کسی ایسی

نہر کو جو ابھی پہاڑیوں کی پیچ در پیچ منزلیں طے کرکے آئی ہو کیا معلوم کہ اس کی منزل مقصود کہاں ہے اور کیا پتہ کہ زمین کا غیر معین نشیب یا فراز اس کو کن کن راستوں پر بھٹکاتا پھرے گا۔ بھٹکنے کے بعد غل مچانا ایک فطری بات ہے اور اثر شور سے آنسوؤں کا جاری ہو جانا بھی اسی قدر فطری ہے نہر کا غل مچانا حسن شاعری یا لطیف تخئیل نہیں ہے بلکہ واقعۃً زور رفتار سے ایک خاص دردانگیز صدا پیدا ہو جاتی ہے کاش سرمستان پیمانۂ تخئیل اس نکتہ کو سمجھ لیں کہ ایسے مست خرام دریاؤں میں جو زرخیز میدانوں میں بہتے ہیں لہروں کا باہم مگر خفیف تموج کوئی ترنم نہیں پیدا کر سکتا۔

وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا ۲۴ وہ لہروں کو باہم نچاتا ہوا

اکبر اگر شاعر نہ ہوتا تو یہ شعر کبھی نہ لکھ سکتا۔ اثنائے سخن میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میں نے جہاں حضرت اکبر کی ذات کو مخاطب کیا ہے وہاں جمع کا صیغہ لایا ہوں جہاں بہ حیثیت شاعر کے تخاطب ہے وہاں صیغہ واحد ہے۔ مگر تکریمی و تعظیمی۔ گانا بجانا کا اجتماع کس قدر مسرت افزا ہے اکبر نے پانی کی تمام ممکن کیفیتیں دکھائی ہیں لہذا ایک کیفیت کو دوسرے کا متضاد سمجھنا خلاف دانش ہے۔ ان میں جو اختلاف ہے وہ ضد کا نہیں ہے بلکہ اختلاف تمیزی و اختیاری ہے جس کا شعور و ادراک مختلف جذبات ناظرین کا ترجمان صحیح ہے۔

اُدھر جھومتا اور مٹکتا ہوا ۲۵ اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا

اس سے پہلے شعر میں موسیقی پرست کی کیفیت دکھائی گئی تھی اس شعر میں بدمستی رندانہ کا مرقع کھینچا گیا ہے مٹکنا کیسا کریہہ لفظ تھا مگر نشست مخصوص نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا ۲۶ بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا

بیتاب مسافر کو نہ حالت بادیہ پیمائی میں سکون حاصل ہوتا ہے نہ بزم موسیقی میں جی بہلتا ہے نہ شغل رندانہ سے جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے تو ان مشاغل کے بعد غصہ کا آنا یقینی ہے اس شعر میں غضبناک کی تشبیہ بدرجہ کمال موجود ہے اور ایک کا کیا ذکر تین تین وجہ شبہ موجود ہیں پھر لطف یہ کہ جھاگ کی کیفیت کا اس عمدگی سے اظہار کرنا سحر ہے سحر۔ سائنس والے بھی اس شعر سے کافی محظوظ ہو سکتے ہیں اس لئے کہ جو گہری اجزا کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے وہی کف لانے کا باعث ہے۔

وہ اونچے سروں میں تموج کا راگ ۲۷ وہ خود جوش میں آکے لانا یہ جھاگ

کف آجانے کے بعد حالت غضب میں ایک طبعی سکون پیدا ہو جاتا ہے جو نادان پانی کو بار دیگر مسرور و مخمور بنا دیتا ہے۔ دیکھئے جھاگ لانے کی وہی کیفیت کتنی خوبصورتی کے ساتھ دو مختلف مگر برابر کے حسین پہلوؤں سے ظاہر کی گئی ہے۔

سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا ۲۸ تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا

سدھرنے کے لفظ سے سنبھالے کی خاص کیفیت نمایاں ہے۔ کھنچنے کی حالت سنور نے سے ظاہر ہے۔ اب زور دار پانی مسرت و خمار کے درجہ سے ہوتا ہوا محویت و بے خودی کے جذبات سے ہمدوش و ہم کنار ہے یہی کیفیت بعینہ اُس شخص کی ہوتی ہے جس کو عملی مسرت تدریجی حیثیت سے بدمستی تک پہنچاوے۔

ادھر گونجتا گنگناتا ہوا ۲۹ ادھر خود بخود بھنبھناتا ہوا

یہ شعر ترنم آبی کی تین ممیز کیفیتوں کا گلدستہ ہے۔ تقسیم اصوات اس خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ شاہد مکمل کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔ انگریزی میں اس ترنم آرائی کے لئے جو عموماً مدّھم سروں میں ہوا کرتی ہے ایک خاص لفظ مرمر نگ ہے جس کا صحیح مفہوم اس خاص مقام پر بھنبھنانے کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے خود بخود کی ترکیب نے اور چار چاند لگا دئے ہیں۔

لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا ۳۰ یہ پھٹتا ہوا اور سمٹتا ہوا

سماتا ہوا اور پلٹتا ہوا ۳۱ سرکتا ہوا اور ملتا ہوا

یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا ۳۲ اُترتا ہوا اور چڑھتا ہوا

یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا ۳۳ دباتا ہوا اور اچٹتا ہوا

زور رفتار کے لئے یہ چار شعر خاص ہیں جن میں بلا تکلف آٹھ مختلف کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہر مصرعہ بہ نفس خود اس قدر مکمل ہے کہ جب دوسرے مصرعہ سے وصل فرما دیجئے تو قند مکرر کا لطف آجائے مگر شان تسلسل کے لحاظ سے کیفیات مختلفہ کی اچھوتی ترتیب خاص حیثیت رکھتی ہے اور ہر شعر کا مفہوم اس قدر دست و گریبان ہے کہ جدا کرنے میں ایک لطیف کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

پھسلتا ہوا ڈگمگاتا ہوا ۳۴ لچکتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا

اب پانی ایسی زمین سے گذر رہا ہے جہاں کی سطح ناہموار ہے اور کنکریوں کا منتشر خزانہ روانی میں رُکاوٹیں پیدا کر رہا ہے بیخود اور بدمست مسافر کے خمار کا وقت ہے اور بالکل وہی کیفیت ہے جو ایک مخمور شرابی کی ہوتی ہے۔ پانی کی سبک مگر پیچیدہ حرکتوں کے لئے لچکتا ہوا کہنا بے مثل رعایت ہے۔

وہ روئے زمین کو چھپاتا ہوا ۳۵ وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا

حقیقت نگاری کے ساتھ اور لطف سخن کے ساتھ زور بیان ملاحظہ فرمائیے کہ سطح خاکی پر پانی کی رو پہلی چادر اس طرح پڑتی جارہی ہے گو یا روئے زمین کو ستاروں سے چھپایا جا رہا ہے کیا یہ شعر جان مشاہدہ اور حاصل نظارہ نہیں ہے۔

گل و خار یکساں سمجھتا ہوا ۳۶ ہر ایک سے برابر اُلجھتا ہوا

اب خمار کی حالت بھی گذر چکی ہے دھن ہے تو سفر کی آرزو ہے تو منزل نامعلوم تک پہنچ جانے کی اُلجھتا ہوا سے وہ خاص مگر نازک حالت مراد ہے جو بہتے ہوئے پانی میں گل و خار کی رُکاوٹ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اُلجھتا ہوا صرف خمار رعایت سے نہیں لایا گیا بلکہ خاص اثر کا حامل ہے۔ سائنس اور فلسفہ والے خوب جانتے ہیں کہ دو چیزیں ایک وقت میں ایک ہی فاصلہ نہیں گھیر سکتیں لہذا گل و خار کی موجودگی سے پانی کے اجزاے سیال کو بقدر کمی ہٹ کر جانا پڑتا ہے اس نکتہ کے علاوہ محاورہ کی چستی بھی قابل داد ہے۔

بہاتا ہوا اور بہتا ہوا ۳۷ ہوا کے تپاچوں کو سہتا ہوا

لرزتا ہوا تلملاتا ہوا ۳۸ بلکتا ہوا بلبلاتا ہوا

پہلے شعر کے مصرعہ اوّل کا لفظ اولیں زور رفتار کو ظاہر کر رہا ہے کہ جو کچھ سدراہ ہوا سیل آب اس کو اپنے ساتھ لے چلا۔ دوسرے مصرعہ میں اُس انتشار کی کیفیت ہے جو مختلف السمت ہواؤں کی کشمکش سے پانی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا شعر جوش ناراضگی کی تصویر ہے اور مسافر کا وہ عجیب وقت بتا رہا ہے جبکہ تمازت آفتاب کا عین شباب ہے آفتاب نصف النہار میں آتش فروش ہے اور سیدھی پڑنے والی گرم کرنیں غریب الوطن راہرو کو کھولائے دے رہی ہیں

بلندی سے گرتا گراتا ہوا ۳۹ نشیبوں میں بھرتا پھراتا ہوا
اُچکتا ہوا اور اُڑتا ہوا ۴۰ اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا

پہلے شعر میں ذوقافیتین کا لطف بھی ہے اور زبان کی سلاست بھی ہے اس کے علاوہ ان مختلف بیش بہا مادیات کا ذکر بھی ہے جو زوردار پانی پہاڑیوں کی ناقابل رسائی فطری خزانوں سے اپنے ساتھ لے کر میدانوں میں آتا ہے اور اثنائے رفتار میں نہر کی تہ پر جمع کرتا جاتا ہے جن میں وہ نظر فریب جواہرات بھی ہوتے ہیں جو حاصل تلاش ہو کر حسینوں کا زیور اور سوداگروں کی روزی بن جاتے ہیں۔ دوسرے شعر میں بیتابی کی حسین کیفیات ہیں شاید کسی کو اس جگہ پہنچ کر تسلسل مفہوم میں کلام ہو۔ خدا کے لئے حالت مشاہدہ کو ملاحظہ فرمائیے نگاہیں مخزن سے چلتی ہیں اور پانی کے ساتھ ساتھ دور تک چلی جاتی ہیں مگر آبشار کی ریشہ دوانیاں مسلسل وپیہم اندازسے جاری وساری ہیں شاعر کی نگاہ بہتے ہوئے پانی کے دامن سے اچانک اُٹھتی ہے اور ایک بار بلند منبع پر پہنچ جاتی ہے۔ پانی کا تازہ جھالا نظر آتا ہے اور لبوں سے دو شعر بے اختیار نکل جاتے ہیں۔

وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا ۴۱ زمینوں کو شاداب کرتا ہوا

کھیتوں میں راہیں کترنا کیا نفیس منظر ہے ایسے مقامات جو دامن نہر کے قریب واقع رہتے ہیں اُن میں پانی کا کچھ حصہ جو ان کے قریب سے گذرتا ہے داخل ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ پانی اپنے اصلی دھارے سے بالکل جدا ہوتا ہے لہذا یکبارگی اور پورے زور سے داخل نہیں ہوتا بلکہ مختلف لہروں میں تقسیم ہو کر بقدر وسعت بڑھتا ہے۔ کترنے کا لفظ خاموشی کا عالم بھی ظاہر کرتا ہے اور سناٹے کا وقت بھی کیا عجب ہے کہ اندھیرا ہو چکا ہو زمینیں اس لئے شاداب ہوتی ہیں کہ جب پانی بہ جاتا ہے نہر سمٹ جاتی ہے اور چادر خاکی نمودار ہوتی ہے تو اس طرح کہ اصلی سطح پر اُن زرخیز مادیات کی دبیز تہ جمی ہوئی ہوتی ہے جو پانی کی گود میں پہاڑیوں کے دامن سے کھینچ کر آئی تھیں اور جو کشش ارضی کے زیر اثر تدریجی طور پر امانتًا جمع ہوتی گئیں تھیں۔

یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا ۴۲ وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا

اب ہمارا مسافر ہرے بھرے باغوں سے ہو کر گذر رہا ہے تھالے اور گود کی تشبیہ کس قدر

دلکش ہے دھرتی اور دھرتا ہوا کی لفظی رعایت مستحق ستائش ہے۔

یہ پھولوں کے گجرے لٹاتا ہوا ۴۳ وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا

یہ لیجئے صبح بنارس کا پورا خاکہ ملاحظہ فرمائیے حسن وشباب کے رازدار، رات بھر کے غمگسار پھولوں کے باسی ہار نہر میں سرائے جارہے ہیں گھاٹ پر ہلالی کشتیوں میں چاند کے ٹکڑے ہی ٹکڑے نظر آتے ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں سیر کرنے والوں کے بجرے بھنور میں پھنس کر لطف فرحت کو دو بالا کئے دیتے ہیں۔

لپکتا ہوا وندناتا ہوا ۴۴ اُمنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا ۴۵ سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا ۴۶ حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا ۴۷ شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا
یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں ۴۸ بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

وہ سودی کا سیلان آب لوڈر
یہ بحر خیالات اکبر کا زور

پینتالیسویں شعر سے مسافر کی پہلی صبح شروع ہوتی ہے وہ غریب رات بھر کھیتوں میں اور باغوں میں :۔آوارہ گردی کرتا ہوا سحر صادق کے وقت گھاٹ تک پہنچ چکا تھا جہاں محبوب اور حبیب کا رازدار بنتا ہوا اور صبح خیز فطرت پرستوں کا لطف تفریح بجروں کی کشاکش سے بڑھاتا ہوا سرگرم سفر تھا کہ اتنے میں آفتاب عالمتاب نے دریچہ مشرق سے جھانک کر سارے جہان کو سنہرا کر دیا اور فیض عکس نے سطح آبی کو تڑپتا ہوا آئینہ بنا دیا چمکنے کے بعد چھلکنے کی کیفیت کس قدر پیاری ہے سنبھل سنبھل کر چھلکنا تعریف سے بالاتر ہے۔

چھیالیسواں شعر ایشیائی بلکہ زمانۂ قدیم کی ساری دُنیا کا مرقع معرکہ کارزار ہے۔ سینتالیسواں شعر رشک اسکندر اور نازش جم ہے۔ اڑتالیسویں شعر کے مصرع اوّل کی حقیقت نگاری اور اختصار ارے توبہ! اکبر جیسا فطرت پرست بھی خانہ بدوش مسافر کا ساتھ نہ دے سکا اور واقعی اس کا ساتھ فطرت کے سوا کون دے سکتا ہے۔ شاعروں کے تخاطب میں

نکتہ داں کی تخصیص کس قدر پیاری ہے۔
آخری شعر میں سودی کی انگریزی نظم سے اپنی اس نظم کا مقابلہ مطلوب ہے اور انصاف
نکتہ وان شاعروں کے حوالہ کیا گیا ہے میں بھی مرحوم کی تقلید کرتا ہون اور فیصلہ ترجیح نکتہ سنج
ناظرین کے حوالہ کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

نثر کی کتابیں

میں نے دیباچہ میں عرض کیا تھا کہ اکبر نثار بھی تھے۔ رقعات اکبر جسے محمد نصیر ہمایوں نے مرتب کیا ہے اور جو سر عبدالقادر کے اہتمام میں چھپا ہے اس میں اکبر کی نثر نگاری کا کوئی ذکر نہیں۔ حسن نظامی صاحب نے بھی اس کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ کلام اکبر الہ آبادی منتخبۂ حضرت شفق رضوی عماد پوری "معہ سوانح حضرت اکبر مرحوم" سوانح کیا ہیں چھ صفحات نثر میں ایک مرثیہ ہے مگر اس میں بھی نثر کا کہیں پتہ نہیں۔ اکبر کی وفات کے بعد جو نوٹ ان کے متعلق مختلف رسائل واخبار میں چھپے ان میں بھی کوئی ذکر نہیں۔

خیر یہ تو سب درکنار۔ مصنّف تاریخ ادب اردو کا بیان ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۲۴۰

Akbar was *not a prose writer* and has left *no work in prose* except his letters and his contribution for the Oudh Punch and other magazines of the time.

اکبر نثار نہ تھے۔ خطوط، اودھ پنچ اور دیگر رسائل کے مضامین کے سوا ان کی یادگار نثر میں کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس جملہ میں سب سے پہلے حصّۂ اوّل غور طلب ہے یعنی اکبر نثار نہ تھے۔ حالانکہ خود مؤلف صاحب کو اعتراف ہے کہ وہ اودھ پنچ میں اور دیگر رسائل میں مضامین لکھتے تھے۔ ایک ہی سانس میں دونوں باتیں کہنا اگر ذہنی خودکشی نہیں ہے تو کیا ہے۔

اور دوسرے یہ کہ تحقیق اور تدقیق کی جانفزا محنتوں سے جان چرا کر معمولی مضامیں کی طرح تاریخ ادب لکھ کر نا واقف حضرات سے زبردستی کا خراج تحسین وصول کرنا آج کل کے نام نہاد مصنّفین اور مؤلفین کا شیوہ ہو گیا ہے۔

اگر مؤلف صاحب کو یقین نہ تھا کہ نثر میں اکبر کی کوئی کتاب ہے یا نہیں تو خاموش رہتے، اپنی لاعلمی ظاہر کر کے ذہنی ایمانداری کا ثبوت دیتے۔ برعکس اس کے اپنے جمود و بے خبری کا اعلان ان زبردست الفاظ میں فرماتے ہیں۔

مصنّف تاریخ ادب اُردو کے لئے یہ عذر کہ مجھے علم نہ تھا بیکار ہے ان کے ادبی اور اخلاقی

فرائض میں تھا کہ تحقیق کا کوئی پہلو فراموش نہ کرتے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم ذرا کریمانہ نظر سے اس فاش غلطی کو دیکھیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آیا مختلف رسائل اور پنچ کے مضامین اُن کے "معیار نثر" میں پورے نہیں اُترتے تھے۔ اگر ایسا تھا تو ان کو صاف صاف اظہار کر دینا چاہیئے تھا۔

خطوط کے مجموعہ کے متعلق ان کی جو رائے ہے وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

They reveal the real man and his life's history could be constructed from the materials supplied by the letters.

مطلب یہ ہے کہ خطوط مصنّف کی اصل ہستی کو ظاہر کرتے ہیں اور مصنّف کی تاریخ حیات انھیں خطوط کے اخذ کردہ مواد سے لکھی جا سکتی ہے" اس کے بعد بھی اکبر نثار نہ تھے !!

مجھے سکسینہ صاحب سے پرخاش نہیں۔ نہ سردست میں تاریخ ادب کی تنقید کر رہا ہوں۔ ان حوالہ جات سے صرف یہی مقصود ہے کہ ایسے ذمہ دار پُر مغز اور بادور قم حضرات بھی ذرا سی لغزش میں کہاں سے کہاں جا پڑتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ موصوف نے بعض حصص بیش بہا طور پر تحریر کئے ہیں۔ جتنا کچھ اکبر کے متعلق لکھا ہے اس میں ½ ایسا ضرور ہے جس کی قدر نہ کرنا سچے موتی کو بے آب بتانا ہے لیکن ۹۰ فیصدی بیانات میں غیر ذمہ دارانہ جھلک اور جمود، بے خبری اور جلد بازی کی کیفیت موجود ہے۔ میں نے اکثر مقامات پر تاریخ ادب اُردو کی تعریف کی ہے مگر ہر جگہ مجموعی حیثیت مراد ہے۔ سکسینہ صاحب پر کیا موقوف ہے اس وقت ہندوستان کی ادبی فضاء میں بے جا نمود و نمائش کے جراثیم کثرت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں لوگ شہرت بھی چاہتے ہیں عزت کے بھی شائق ہیں مگر محنت سے دم گھبراتا ہے تحقیق کی کوئی عظمت نہیں ہے۔

اکبر صاحب کی نثر میں پانچ کتابیں موجود ہیں۔

(۱) فیوچر آف اسلام یعنی اسلام کی حالت آئندہ مصنفہ ولفرڈ اسکاون بلنٹ صاحب جس کو منشی سید اکبر حسین منصف علیگڈھ نے مسلمانان ہند کی اطلاع کے لئے اُردو میں ترجمہ کیا مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ کی چھپی ہوئی ہے۔ صفحات ۱۷۵ کاغذ گندہ سفید قیمت پانچ روپیہ

تمہید اور دیباچہ کا خلاصہ اقتباسات کی شکل میں نذر ناظرین ہے تاکہ کتاب کا مقصد، عبارت کی روانی، ترجمہ کی شان اور تصنیف کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

مگر اقتباسات کے پہلے اکبر صاحب نے اس عربی شعر کا ترجمہ کیا ہے جس کو مصنف نے اپنی انگریزی کتاب کا زیب عنوان قرار دیا ہے۔

لا تقنطوا اذ ینتثر عقدکم	نہ ہو تو مایوس دل شکستہ بکھر گئے ہیں اگر یہ موتی
للعود حسن فی النظام و اجمل	زیادہ تر حسن عمدگی سے گوندھیں گے بار دگر یہ موتی

ترجمہ کی دقتیں جاننے والے سمجھتے ہیں کہ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا اور دونوں زبانوں کی لطافت قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

تمہید کا خلاصہ خود مترجم کے الفاظ میں۔

مصنف نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں عام اس سے کہ وہ ہمارے حسب مراد ہوں یا نہوں ان کی صحت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہو ایسے نہ تھے کہ مجھ کو مسلمانوں کی اطلاع کے لئے اس کا ترجمہ کا شوق نہ پیدا ہوتا۔ مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اگر سوچنے والی طبیعتوں کے دائرہ خیال کو وسیع کرنے کے لئے کچھ محنت اُٹھائی اور اسلام کی مجموعی پالیٹکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی رتبہ اور ذی علم شخص کی راے سے اُن مطلع کیا۔ ... تو برا نہیں کیا۔

ابھی اکبر صاحب نے اس ترجمہ کو ختم نہ کیا تھا کہ خود مصنف مسٹر بلنٹ ہندوستان آئے اور مترجم نے کلکتہ میں ان سے ملاقات کی انہوں نے یعنی مصنف نے دیباچہ اوّل کا ضمیمہ ایک دوسرا دیباچہ لکھا۔

میں اس کتاب پر مفصل تنقید نہ کروں گا نہ اس کے بعد والی کتابوں پر سر دست بسوط تبصرہ کروں گا اس لئے کہ یہ سب تراجم ہیں۔ میں اکبر کو بہ حیثیت شاعر و نثار کے پیش کر رہا ہوں۔ ان کتابوں کے خیالات پر بحث کرنا گویا خود اصل مصنف و تصنیف کی تنقید ہے جس سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں۔

ان کتابوں کا مبحث تاریخی اور سیاسی ہے۔ براہ راست ادب سے متعلق نہیں میرے اور آپ کے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ ان کی ترجمہ کی حیثیت ہے۔ جس کے لئے اس سے

بہتر اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ ترجمہ کے اقتباسات جابجا سے پیش کر دیے جائیں۔

ترجمہ کی زبان الفاظ کی نشست عبارت کی روانی، محاورات کی بندش کا جہانتک تعلق ہے سیر اقتباسات میں دو امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

(۱) یہ کتابیں ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۹ء تک کی ہیں ۴۰ و ۴۶ برس گذر چکے ہیں اس وقت اُردو کی یہ حالت جو اب ہے نہ تھی۔ اُردو نے تیس برس کے اندر حیرت انگیز اور لائق رشک ترقی کی ہے۔ لہذا آج کی زبان سے اُس کا موازنہ نہ کیجئے گا۔

(۲) ترجمہ کا کام نہایت مشکل ہے بالخصوص لفظی ترجمہ میں زور تصنیف اور دونوں زبانوں کا حسن قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ اقتباسات پیش کرنے کے پہلے میں ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں خود مترجم کا خیال اپنے ترجمہ کے متعلق کیا تھا۔

صفحہ ۴ "جہانتک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنّف کے سلسلۂ خیالات کو ذرا بھی برہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کے ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے۔ معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لئے ایک لفظ کے ترجمے میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ (مترادفات) لکھ دئے ہیں۔ لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل کرنا میرا کام نہ تھا" سب سے بڑی خوبی ترجمہ کی تسلسل ہے کہ بنفسہ تصنیف معلوم ہو۔

بعض اقتباسات جو شان ترجمہ اور مبحث کتاب پر روشنی ڈالتے ہیں۔

صفحہ ۷ "اہل فرانس نے ٹیونس پر حملہ کرکے شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی حرکت و شورش پیدا کر دینے میں جلدی کر دی"۔

صفحہ ۸ "معاصر کے بڑے بڑے واقعات سے یہ سمجھ کر آنکھ بند کر لینا کہ اس تاریخ کو ہماری روزانہ زندگی کے مشاغل سے کوئی صریحی تعلّق نہیں ہے یہ ایک ایسی بات ہے جو ایک بڑی قوم کے شایان حال نہیں ہے"۔

صفحہ ۹ "نزاع اور اختلافات سے بہرحال مذہب ہی کا ضعف متصور ہے جس کی ملک میں اور بھی ہزاروں دشمن لگے ہوئے ہیں۔

صفحہ ۱۱ "کتاب فیوچر آف اسلام کو زبان اُردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی

میں اپنی بے انتہا مسرت ظاہر کرتا ہوں کہ میری ناچیز تصنیف کو ایک لائق اور تعلیم یافتہ مسلمان نے دُنیا میں سب سے بڑی مسلمانوں کی جماعت کے پڑھنے کے لائق سمجھ کر پسند اور منتخب کیا۔"

صفحہ ۱۲ "اب بھی مجھ کو اسلام کی حالت آیندہ پر ویسا ہی اعلیٰ درجہ کا یقین اور بھروسہ ہے جیسا کہ ۱۸۸۲ء کی فصل بہار میں تھا اور اگرچہ لوگوں کو نخل امید سے پھل پانے میں کچھ تاخیر ہو گئی لیکن میں بیدل نہیں ہوں گو سر دست ناکامی ہوئی ہے لیکن ہم کو خدا پر بھروسہ اور یقین رکھنا چاہیئے"۔

مصنّف نے نہایت تحقیق اور محنت کے ساتھ اپنے مشاہدات اور شواہد کی بنا پر مضامین لکھّے ہیں پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ شایقین تاریخ و تحقیق کے لئے عموماً اور مسلمین کے لئے خصوصاً نہایت مفید ہے جو لوگ مذاہب اور تمدن سے بہ حیثیت مذہب و تمدن کے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے بھی نہایت دلچسپ ہے۔

مترجم نے نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا ہے اور علم ادب میں یہ ترجمہ ایک گرانقدر حیثیت رکھتا ہے۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے اسے اس قدر جلد بھلا دیا۔

اسی طرح مضامین متعلقہ ہند کے چار حصّہ ہیں۔ تین حصص یعنی اوّل۔ دوئم اور چہارم میرے قبضہ میں ہیں۔ تیسرا حصّہ سخت جستجو کے باوجود ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔

یہ سب رسائل چالیس چالیس پچاس پچاس صفحات کے ہیں اور ولفرڈ اسکاون بلنٹ اور لیڈی بلنٹ کے ایڈریس جو اُن کو مختلف مقامات پر دئے گئے۔ مضامین اور تقاریر جو انہوں نے ہندوستان کے مختلف موقعوں پر کیں، جوابات اعتراضات اور ردّ اعتراضات کا مجموعہ ہیں جسے اکبر صاحب نے تراجم اور تالیف کی مدد سے کافی محنت کے بعد منطقی ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔

حصّۂ اوّل و چہارم خصوصیت سے دیکھنے قابل ہے۔ علیگڈھ اور حیدرآباد کے تعلیم و ترتیب کی تنقید اور مشورے شایقین تاریخ کے لئے گرانبہا ہیں۔

ترجمہ کی شان کا اندازہ آپ اسلام کی حالت آیندہ کے اقتباسات سے کر سکتے ہیں۔ انتخابات اور خلاصے بھی اکبر صاحب کی احتیاط اور نکتہ رسی کا پتہ دیتے ہیں۔

خصوصاً ضروری اور محققانہ حواشی دلچسپ و معنی خیز ہیں۔

اکبر کے نظریئے۔ کلام کے شواہد معہ ضروری حواشی و تنقید

"دوپہر" میں اس عنوان کو کس لئے جگہ ملی؟

اس لئے کہ یہ نظریئے ہر دور میں مشترک اور سب پر حاوی ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ سنہ ۱۸۸۰ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک کے بہت سے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

خود مصنّف سے زیادہ اُس کے مطمح نظر، نقطہ نگاہ، معیار پسند اور نظریہ کو کون جان سکتا ہے؟

کوشش بلیغ کی گئی ہے کہ جس شعر میں جو پہلو غالب ہو اسی سرخی کی تحت میں وہ شعر لکھا جائے مگر بہت ممکن ہے کہ لوگوں کو تقسیم اشعار میں کچھ اختلاف ہو ان سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تقسیم منطقی نہیں نہ ہو سکتی ہے کیونکہ ایک ہی شعر میں کئی پہلو نکلتے ہیں۔

یہ اشعار محض شواہد کی حیثیت سے نمونتاً دئے جاتے ہیں انتخاب نہیں ہے۔ کلیات مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام میں اب بھی ایسا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کی قیمت کا اندازہ محض سیر کلام سے ہو سکتا ہے۔

عنوان اس لئے قائم کردئے گئے ہیں تاکہ چند منتشر اشعار ایک جگہ نظر آئیں۔

میں نے کم سے کم عنوان مقرر کئے ہیں ورنہ خصوصیات کا حصر جامع نہایت دشوار تھا یہی نہیں کہ اسی صورت میں صدہا عنوان قائم کرنے پڑتے بلکہ ہر عنوان بہت سے ثانوی عوانین میں تقسیم ہو جاتا۔

ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور گلدستہ شواہد کے حاشیہ پر چند ضروری خیالات کا اظہار کردیا گیا ہے۔

اخوت وملّت

صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے سب کی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ ہیں

جب تک ہم میں رواداری کا مادہ نہ آئے گا ہم آزاد قوموں کے دوش بدوش نہیں چل سکتے۔

ملت کا ادب اُٹھ گیا جس قوم کے دل سے اقبال کے سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

تاریخ عالم اس بات کی گواہ ہے۔

کیجئے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں یہ نمود جبہ و دستار رہنے دیجئے

"درویش صفت باش کلاہ تتری دار" کا نفیس رخ ہے۔

کٹی رگ اتحاد ملّت رواں ہوئیں خون دل کی لہریں ہم اس کو سمجھے ہیں آپ صافی نہائے ہیں نکھر رہے ہیں

ہم خودغرضی کی بدولت محض اپنی ذاتی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں خواہ ہماری کامیابی سے ہمارے صدہا بھائی برباد ہو جائیں۔

کہاں وہ اب لطف باہمی ہے محبتوں میں بہت کمی ہے چلی ہے کیسی ہوا الٰہی کہ ہر طبیعت میں برہمی ہے

اب کے لفظ سے اسلاف و اخلاف کے لطف کا موازنہ کیا ہے اور محبت ہمدردی کا صحیفہ بھی ہے۔

بہت دشوار ہے مسلم کو قومی پیشوا بنتا مصیبت جھیلنا اور ہادی راہ خدا بنتا

مشینوں سے لپٹ کر اس قدر البتہ ممکن ہے بہ باطن خود گھسٹنا اور بہ ظاہر ہما بنتا

شاعر اور معمولی ناظرین میں یہی فرق ہے کہ وہ ہر شے کی ماہیت اور ہر تصویر کے تمام رُخ ایک ہی نظر میں دیکھ لیتا ہے۔ چوتھے مصرعہ کی بلاغت میرے دعوے کی دلیل ہے۔

اس زمانے میں غیرت ملّت رہتی ہے جان کی اماں کے ساتھ

ہم میں ایثار کا جو فقدان ہو گیا ہے یہ شعر اسی حالت کا آئینہ ہے۔

ٹیمز کے ساحل پہ جا کر دیکھئے قسمت کی فال گومتی پر شیعہ وسنی نے کیوں تکرار کی

انگلینڈ کے ایک دریا کا نام ہے کس قدر نصیحت آمیز ہے۔

جنھیں ہے شرک سے نفرت خدا کو ایک کہتے ہیں یہ ان میں کیوں ابھی تک جنگ اور تکرار باقی ہے

سبب اس کا تو ظاہر ہے خدا لب پر خودی دل میں ‏ ‏ بتان سنگ ٹوٹے ہیں بت پندار باقی ہے

اپنے غرور و تکبر کے زعم میں وہ تمام فرقے بھی جو ایک خدا کے قائل ہیں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مذہب کا نام مفت میں بدنام کرتے ہیں۔

گرجا میں لاٹ صاحب مسجد میں شیخ صاحب ‏ ‏ بدھو فلاسفی کے کمرہ میں سڑ رہے ہیں
خاک اُڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے ‏ ‏ مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

فلسفہ Philosophy وہ فلسفہ جو انسان کو نہ دنیاوی اعزاز دے سکے نہ دین کا بنا سکے اور جس سے انسان کا اخلاق درست نہ ہو سکے بالکل بیکار ہے۔

تمہاری حرص بدل کر تمہیں کرے گی ہلاک ‏ ‏ ہمارا صبر بدل دے گا اس زمانے کو

صبر و حرص کے موازنہ سے شاعر نے کتنی اچھی بات سکھلائی ہے۔

سمجھیں نہ حضور تھرڈ والوں کو حقیر ‏ ‏ انجن تو وہی ہے جس کی ہم سب کو ہے آس
اسٹیشن گور تک ہے یہ فرسٹ و سکنڈ ‏ ‏ بعد اس کے موافق عمل ہوگا کلاس

مغرور منعمین اور متکبر زاہدین و عالمین کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ علم و عمل کا فلسفہ روزانہ زندگی کی ایک بین اور سادہ سی مثال دے کر کس صفائی سے بیان کر دیا ہے۔ Class = کلاس = درجہ

یہیں کی پیدا ہیں کی رنگت یہیں کی بولی یہیں کا کھانا ‏ ‏ تو پھر تفاوت ہو کیوں سروں میں ہر اک کو بہتر ہے دیس گانا

وطن پرستی کی ترغیب کیسے مترنم لفظوں میں کی گئی ہے۔ دیس۔ وطن۔ ایک راگ کا نام ہے۔

رہے فرنگی سوان کی سیوا ہر ایک پر آپ فرض کر دیں ‏ ‏ جو خاص مطلب ہوں اپنے اپنے الگ الگ جا کے عرض کر دیں
جو باہمی بحث ہو تو باہم ہم اس پہ قال اقول کر لیں ‏ ‏ جو فیصلہ ہو قبول کر لیں جو خار بھی ہو تو پھول کر لیں
برادرانہ محبتیں ہوں جئیں مزے سے خوشی منائیں ‏ ‏ نہیں ہے اس میل کا یہ مطلب کہ ہم گورنمنٹ کو ستائیں

سیوا = خدمت۔ قال اقول = بحث مباحثہ۔

سیاسی موالات اور باہمی موالات میں جو نکتے سطحی نگاہ والوں سے پوشیدہ ہیں وہ چند لفظوں میں بتا دئے گئے ہیں۔

ترقی پا کے وہ برگڈ میں پہنچے ‏ ‏ کسی کو کیا کہ جب تنہا خوری ہے

وہ بھائی جو معزز عہدوں پر پہنچ کر اپنی غریب قوم کی فلاح کا خیال نہیں کرتے ذرا غور سے اس شعر کو پڑھیں۔

اسلام

بڑھتا رہا جو طاعت و مسجد سے یونہی بیر　　کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزوِ غیر

اسلامی سلطنتوں کے زوال کی مختصر سی تصویر ہے۔

کہتے ہو تم جو وہؔی تو انہیں آتی ہے ہنسی　　یعنی زبان شوق غلط لفظ میں پھنسی

زبان پر تو ہم ہے مگر عمل سے "ہس" "میں" کا ثبوت ملتا ہے۔

آنر کے ساتھ نام گرامی بھی لکھ گیا　　لیکن ادھر سے خط غلامی بھی لکھ گیا

لوگ خاں صاحب خان بہادر سر اور آنریبل ہوکر یہ بھول جاتے ہیں کہ اعزاز عطا کرنے والے نے سلسلۂ غلامی کی کڑیاں اور مضبوط کر دی ہیں۔

موقع کا ہے خیال نہ اب کانشنس[۲] ہے　　ارشاد ہو غلط بھی تو اس کا ڈفنس[۳] ہے

یہ باتیں آئے دن ہوتی ہیں دربارداری کرنے والوں سے پوچھئے۔

ارشاد لاجواب تو قرآن ہی کا ہے　　قانون بے مثال تو رحمان ہی کا ہے

انسانی اور الٰہی ارشاد و قوانین کا تقابل نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے۔

وقعت ہماری شاہ کی منزل میں کچھ نہیں　　کاغذ پہ اعتراف مگر دل میں کچھ نہیں

ظاہری اسناد سے دلی وقعت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔

نقلی کمیٹیوں میں نہ دل ہے نہ دین ہے　　یہ پانیر پُری کی فقط اک مشین ہے

موجودہ مجالس ملیہ و سیاسیہ کی حالت دکھائی گئی ہے۔ پانیر۔ ایک انگریزی روزانہ اخبار ہے۔

طاعت سے نیکیاں ہیں تو نیکی سے عزتیں　　شبہے کی کوئی بات نہیں اس اصول میں

سطور بالا کی تمہید کے بعد بیان اصول نہایت موثر ہے۔

وقعت مگر محال ہے مسجد کو چھوڑ کر　　ممکن نہیں کہ پائیے پھل جبڑ کو توڑ کر

"مسجد" محض فروعی چیز نہیں ہے اصلی شے ہے۔

---

[۱] ہم = Weal [۲] ضمیر = Conscience [۳] تاویل = Defence

اک برگ گل کہے گا کہ ہم گل کے جزو ہیں — تم خود کو کیا کہو گے کس کل کے جزو ہیں

جب تک داد اخوت و ملت نہو گا تم انفرادی حیثیت سے نامکمل رہو گے۔

لاٹھی بھلی ملی ہو اگر اس کی رگ سے رگ — بیکار توپ جس کے ہوں پرزے الگ الگ

قوم سے مل کر اور قوم سے جدا ہو کر انسان کی جو حالت ہو جاتی ہے اس کا مرقع کھینچا گیا ہے۔

پھل پھول پتیوں پہ ہے نری نظر نثار — جڑ پر نظر نہیں ہے کہ جس کی ہے سب بہار

وہ جڑ کیا ہے ؟ اسلام ہے اور اسلام کے تمام قوانین جن پر ہم عمل نہیں کرتے اور جن کو ہم بھولتے جاتے ہیں

مانوں گا میں یہ بات کہ مجبوریاں بھی ہیں — پر بالارادہ دین سے کچھ دوریاں بھی ہیں

بہت سی مشکلات جو بظاہر بہت بھیانک معلوم ہوتی ہیں "اگر خارے بود گلدستہ گردد" ہو سکتی ہیں۔

کلفت اسی کی مجھ کو ہے ہر آن ہر نفس — لاکھوں کی سد راہ ہے دس بیس کی ہوس

بعض مسلم خود پسندی اور طمع ذاتی میں پڑ کر اپنے ابنائے قوم و وطن کو تباہ کر رہے ہیں۔

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں — اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سر سبز شجر امید کا تھا — جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

شاعر نے زمین بھی ایسی عمدہ پسند کی ہے جس میں روانی صوت و الفاظ کی رکاوٹ سے درد و غم کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ حالت قابل رحم ہے مگر امید بھی دلائی ہے کہ اگر سر میں ہوائے طاعت بھر دی جائے تو شجر اسلام دوبارہ پھل پھول سکتا ہے۔

وہاں قالو بلےٰ یاں بُت پرستی — ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا

روز الست اسلام کے بموجب ہر روح نے وعدہ کیا تھا کہ میں دنیا جاکر صرف تیری پرستش کروں گی مگر کتنی روحیں اپنے عہد پر قائم ہیں ؟

گو چکا چوند کا عالم ہے نئی روشنی میں — ہے مگر پیش نظر عرش کا تارا اسلام

ان کے مضبوط جہازوں کی مددگار ہے آگ — مری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام

خوف حق الفت احمد کو نہ چھوڑ اے اکبر — منحصر ہے انہیں دو لفظوں پہ سارا اسلام

صبر و امید و قناعت و آرزو کا مرقع نہایت لطافت سے کھینچا گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں اسلام کی حالت آئندہ کا باب اوّل ملاحظہ فرمائیے۔

وزن اب ان معین نہیں ہو سکتا کچھ　　برف کی طرح مسلماں گھلے جاتے ہیں

جس طرح برف کا گھلنا بالکل مسلسل ہوتا ہے ویسا ہی مسلمانوں کا تنزل بالکل مسلسل ہے۔

گردن محرام مسجد خم ہوئی تعظیم کو　　اٹھی آوازہ اذاں اسلام کی تعظیم کو

دونوں مصرعوں میں حسن تعلیل ہے

واعظ تو بتاتے ہیں مسلماں کو کافر　　افسوس یہ کافر کو مسلماں نہ کریں گے

آج کل تکفیر کے فتاوے کی جو کثرت اور تبلیغ کی جو حالت ہے اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

اکبر کو دعا دیتے ہیں احباب یہ کہہ کر　　اب اپنی جماعت میں مسلمان یہی ہے

یہ بات اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں ہے بلکہ حقیقت حال یہی ہے مشکل سے دو چار نفوس مسلم و مومن نظر آتے ہیں ورنہ منافق بہت ہیں۔

اب منکر ہیں غلامی بھی نہیں ملتی ہے　　سلطنت کر گئے عقبےٰ سے ڈرانے والے

رسول اور اصحاب رسول کی شان ملاحظہ فرمائیے۔

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشا اللہ　　مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

غلط تعلیم کا اثر مذہب پر غلط ہوتا ہے۔

اگر میں ڈوب جاؤں قلزم رشک ندامت میں　　گناہوں کا سفینہ غرق ہو دریائے رحمت میں

واقعی توبہ کے سچے آنسو گناہ کا بیڑا پار کر دیتے ہیں۔

تائید وضع ملت و دین کی کروں گا میں　　اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دستکش　　سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

ہر مسلم تائید وضع ملت و دین کے لئے مجبور ہے اس لئے کہ اگر حکیم مرضا کے علاج سے حتی الامکان دستکش ہو جائے تو اخلاقی اور مدنی جرم ہے۔

مجلس میں خیال بادہ نوشی پایا　　مکتب میں سر سخن فروشی پایا

مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر　　لیکن اک عالم خموشی پایا

مسجدوں کے سناٹے کا عالم کس قدر عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقل مسلم سے　　کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا

مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی ‏ ‏ ‏ مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجئے ان کو حکیمانہ طریقوں سے ‏ ‏ ‏ کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے مقراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے ‏ ‏ ‏ کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

محربان اسلام نے کبھی کوئی دقیقہ بربادی اسلام کا اٹھا نہیں رکھا۔

قیامت کر گئی قومی ترقی کوشش مسلم میں ‏ ‏ ‏ لگا کہنے زہے نعمت اگر حاصل شود مارا
اگر آں شاہد مغرب بدست آرد دل مارا ‏ ‏ ‏ بخشم مست او بخشیم تسبیح و مصلا را

مارا کے دو معنوں میں بڑا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

مارا۔ مجھ کو۔ ہتے لیا ہے۔ ‏ ‏ ‏ اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را + بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

مصلے کو غرض تہ کر کے اٹھا عابد مشرق ‏ ‏ ‏ جو طاقت آ گئی تھی دل میں اس طاقت سے للکارا
ادھر تحریر ادھر تسبیح ادھر سازش ادھر بندش ‏ ‏ ‏ اسے جھڑکا اسے ڈانٹا اسے گانٹھا اسے مارا

ان دو شعروں کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ہستی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں پردہ اسلام میں سب ہیں

ڈنر، عہدے، تبسم، مشورے وعدے بنے گیسو ‏ ‏ ‏ وہ گیسو جس سے پھیلی بوے مست عنبر سارا
حواس ظاہری کے دام سے بچنا ہوا مشکل ‏ ‏ ‏ کجا موہوم حوریں اور کہاں پریوں کا نظارا
وہ ٹوٹے یہ گرے وہ پھسلے یہ چت ان کو غش آیا ‏ ‏ ‏ نہ ایماں میں رہی طاقت نہ دل میں ضبط کا یارا
حریفان طرب آ گئیں نے چھیڑا ساز عشرت کو ‏ ‏ ‏ بجایا سب نے مضراب ہوس سے دادرا دارا
بتوں کے عشق میں پڑ ہی چکے تھے عقل پر پتھر ‏ ‏ ‏ مسوں کا بے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا
غریبوں دردمندوں بے کسوں کے دل کی کیا ہستی ‏ ‏ ‏ وہ حالت پیش آئی تھی کہ جس سے سنگ ہو خارا
نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے ‏ ‏ ‏ نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا
ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا ‏ ‏ ‏ نہ تھا یہ مطلب سید کہ اس رخ پر چلے دھارا
وہ پردے کے بڑے حامی تھے طاعت کے موید تھے ‏ ‏ ‏ وہ خواہاں تھے کہ چمکے اوج پر اسلام کا تارا
سنا سب کچھ مگر دیکھا جو بالآخر تو کیا دیکھا ‏ ‏ ‏ وہی اینٹیں وہی پتھر وہی چونا وہی گارا
ادھر شیرازہ قومی کو ہیں ہم توڑتے جاتے ‏ ‏ ‏ ادھر بازی حریفوں کی ہے ہاتھ ان کے ہے پو بارا
مدار خیر خواہی ترک مذہب پر نہیں ہرگز ‏ ‏ ‏ ہر اک نے دل سے انگلش کی ہے لائلٹی کا دم مارا

صلواۃ بے وضو سے رو رہی ہے اس طرف مسجد
ادھر قرآن بے رغبت سے دل مذہب کا سیپارہ

مشینیں چل رہی ہیں اور کسی کی کچھ نہیں چلتی
ادھر ہیں بے چھلے کندے ادھر ہے برق وش آرا

بٹھایا کیوں نہیں جاتا یہ نقش جانفزا دل پر
کہ روحانی ترقی میں ہمولڑ کا عرش کا تارا

میں یہ پیچیدہ بحثیں پیش کرنے کو تھا آمادہ
کہ اتنے میں جناب حضرت حافظ نے للکارا

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ہندوستان میں تنزل اسلام کے اسباب میں سیاسی اور مجلسی کمزوریاں بھی بڑی حد تک شامل ہیں۔

لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ اکبر سر سید کے مخالف تھے۔ ذیل کے اشعار سے بالعموم اور خط کشیدہ مصرعوں سے بالخصوص یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سید کے مخالف ہرگز نہ تھے بلکہ اُس جماعت کے مخالف تھے جو سر سید کے ارشادات کو غلط معنی پہناتی تھی اور غلط طور پر سید کے بتائے ہوئے نیک راستوں پر گامزن تھی۔ اکبر کا یہ خاص خوبی ہے کہ نصیحتوں کے دفتر بہا جاتے ہیں اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ نصیحتیں ہیں یا روزانہ کی معمولی باتیں۔

آخر میں حافظ کے ایک شعر سے قلب سامع و ناظر کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ بھی قابل قدر ہے وجدان کی حالت پیدا ہوتی ہے اور جو "نقش جانفزا" اکبر بٹھانا جانتے تھے وہ نہایت نفاست سے بیٹھ جاتا ہے۔

برق کلیسا

رات اُس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن وشوخی وہ نزاکت وہ اُبھار

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتش حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی

پہلوے حسن بیاں شوخی تقریر میں غرق
ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

منیجا کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا — یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار — دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے — ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی — ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سوحلے پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں — آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائیں کوئی میدان میں تو اترا جائیں — پائیں سامان اقامت[۱] تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ ہیں یہ نیک نہاد — ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

عرض کی میں نے کہ لے لذت جاں راحت روح — اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف — ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ — دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ — سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں — نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

مثنوی کے پیرایہ میں اسلام کے موجودہ حالت کی جتنی عبرت انگیز اور دلچسپ تصویریں کھینچی گئی ہیں اس کی مثال اُردو تو کیا اور بہت سی زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

میری نگاہ میں یہ اشعار تنقید سے بے نیاز اور حواشی سے بالاتر ہیں۔ بار بار پڑھیے میں یقین دلاتا ہوں کہ ہر بار ایک نیا لطف حاصل ہوگا ایک نئی بات معلوم ہوگی اور ایک نیا سبق ملے گا

۱؎ ہاتھ دیتے پہنچا پکڑیں۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو اک فرضی[1] لطیفہ | کیا ہے میں نے جس زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلی کی ماں نے | کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلی کو تجھ سے | بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

[1] فرضی لطیفہ نہیں ہے واقعہ ہے ایک جگہ سے جج صاحب کے سالے حافظ حسین صاحب کی نسبت محض اس لئے روکی گئی تھی کہ وہ بے چارے انگریزی نہیں جانتے تھے ۔ کاغذ ۔

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی | کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوش طبیعت | کجا ٹھوسی ہوئی چیزوں کا احساس

ہماری موجودہ طرز تعلیم میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مناسبت فطری اور ذوق طبیعت کا خیال نہیں کیا جاتا ایک ہی طالب علم کو بہت سے مضامین پڑھنے پڑتے ہیں خواہ اس کی طبیعت کے موافق ہوں یا مخالف ۔

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے | ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی | مجھے سمجھی ہو کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود | نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلی | تو استعفا مرا باحسرت و یاس

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں
اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے
خیال میٹر کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے نیشن رکا ہے ملحد کا اپریشن
نہیں ہے گم لفظ سالویشن خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے وہاں وہی عزت بشپ ہے ۔
یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں

ردیف میں ہر جگہ ایک نیا لطف ہے ۔ مغرب و مشرق کے مذہب کے تنزل میں جو

باتیں مشترک ہیں اور جو ممیز ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

سراسر نورِ تقوے سایہ پر قربان کر آئے　　یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے مس لائے

مس = (۱) دوشیزہ = (۲) ایک معمولی دھات +

نور تقوے اور محبوبہ حسین میں وہی فرق ہے جو خالص سونے اور مس میں ہے۔

فرق کیا عاشق و واعظ میں بتائیں تم سے　　اس کی حجت میں کٹی اس کی محبت میں کٹی

(لف و نشر غیر مرتب) ایک ہی مصرعہ میں دونوں کی ساری زندگی نظم ہوگئی ہے۔

طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر　　یہ تو اک ٹکس ہے اس آبادی پر

آبادی کی کثرت سے غربت اور گرانی بڑھتی جاتی ہے۔

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو　　پیش درگاہ خدا واہ کی حاجت کیا ہے

علم بے عمل بیکار۔

گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود　　مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

ہمارے مسلم بھائی معمولی عہدوں پر پہنچ کر مسجد سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ان کو بتایا گیا ہے کہ جب بڑے بڑے عہدے کے لوگ بھی اپنے معبدوں میں نظر آتے ہیں آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے۔

اسلام کی بو وہاں نہیں ہے مطلق　　مسجد بھی ہے مولوی بھی ہیں ٹاٹ بھی ہے

دریا میں نہیں ہیں جو ہر تیغ اکبر　　گو آب بھی اس میں دھار بھی کاٹ بھی ہے

پہلے شعر میں جو دعوے کیا گیا ہے دوسرے شعر میں اس کی دلیل دریا و تیغ کے موازنہ سے دی گئی ہے۔

طاقت اسلام کی کہتی تھی مسلمانوں سے　　جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے

وعدہ فراموشی کی تنبیہ بھی ہے اور مردانگی کی ترغیب بھی۔

اگر ہو ذوق سجود پیدا ستارہ ہو اوج پر جبیں کا　　نشان سجدہ زمیں پر ہو تو فخر ہے وہ رخ زمیں کا

طاعت کی شان اور عبودیت کا مرتبہ دکھایا گیا ہے۔

اگرچہ صبح کو پھیکے ہیں مثل مہ صائم　　چمک اٹھیں گے یہ جب وقت شام آئے گا

صوم کی تحریک کتنے ہمت افزا لفظوں میں کی گئی ہے۔

آج بنگلہ میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں　　جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

اللہ اللہ اب اذاں کی آواز ایسی حیرت انگیز ہوگئی ہے۔

فلٹ نفیس سڑک خوشنما ڈنر مہر شب　　یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

شباب و بادہ و فکرِ مآل کار چہ خوش　　جنونِ عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی

آج آرام سے گذرتی ہے + عاقبت کی خبر خدا جانے۔ اسی شعر کی پوری توضیح ہے۔

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ　　گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

(ایک سورۂ قرآنی ہے)۔ تثلیث = عیسائی ذات واحد میں تثلیث کے قائل ہیں۔ تین اردو میں ۳ کے عدد کو کہتے ہیں۔ معانی کے اشتراک سے لطف پیدا ہوگیا ہے۔

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے　　کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

"اکبر کی شاعری کا دور آخر" مطبوعہ مجلہ اُردو اورنگ آباد ۲۲ء

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے　　یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

دولت دنیا کے مقابلہ میں دولت ایمان کی کوئی قدر نہیں ہے۔

خدا ہی کی عبادت جن کو ہے مقصود اے اکبر　　وہ کیوں باہم لڑیں گو فرق ہو طرزِ عبادت میں

کتنا عمدہ فلسفہ ہے کاش ابنائے وطن اس سے سبق حاصل کرتے۔

تاج پوشی

لندن سے دہلی آئے ہیں دس یوم کے لئے[1]　　یہ زحمتیں اُٹھائیں فقط قوم کے لئے

دیکھو حضور جارج ہیں کیسے خدا پرست　　گر جا میں سر جھکا ہے دسمبر ہو یا اگست

رکھتا نہیں نماز سے تو اپنے دل کو گرم　　اے مدعی دین خدا شرم شرم شرم

یا لوگ پرائیوٹ ہیں کالی کے ساتھ ہیں[2]　　اک آپ ہیں کہ ہوٹلوں والی کے ساتھ ہیں

مسلمین کی حالت اور اقوام عالم کے مقابلہ میں قابل رحم ہے۔ مغربی ہی نہیں خود ہندوستان کی اور قومیں ترقی کر رہی ہیں ایک ہم ہیں کہ عیش و نشاط کے نشہ سے چونکتے ہی نہیں۔

---

[1] تاجپوشی کے لئے ۱۹۱۲ء۔ [2] کالی کلکتہ والی۔

نہ کھول آنکھ کسی عکس بے بقا کے لئے　　صفائے دل پہ نظر رکھ فقط خدا کے لئے

ایک طرف تو خالق و مخلوق کی شان فنا و بقا کا اظہار ہے دوسری طرف اسلام کی سچی تعلیم کا اعادہ ہے کہ ہمارا ہر کام خدا کے لئے اور صرف خدا کے لئے ہونا چاہئے۔

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام　　یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

جب تاریخیں پس پشت ڈالدی جائیں اور دلائل محض تکرار اور ضد تک محدود ہوں تو اس سے اچھا جواب نہیں ہوسکتا۔

کریں گے شوق سے مسلم غذا میں مے داخل　　شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

جاننے والے افسوس کے ساتھ جانتے ہیں کہ اب مے خوری اور بادہ نوشی میں مسلم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

وہ اس کو محو کلیسا بنا کے چھوڑیں گے　　اس اونٹ کو خر عیسےٰ بنا کے چھوڑیں گے

مسلم غلامی کے پنجے میں پھنس کر ظاہری نمود میں مبتلا ہو کر اور لذات جسمانی کے شکار ہو کر جس ردی حالت تک نہ پہنچ جائیں وہی کم ہے۔

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے　　صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں　　کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولس　　ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

اسلام کے قابل فخر مجاہدین کی حالت کا مقابلہ آج کل کے نام نہاد مسلمین سے کیجئے تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہو گی مگر ساتھ ہی ساتھ دل بے چین ہو جائے گا آنکھیں ڈبڈبا آئیں گی۔

حضرت اکبر ہرے کس کام کے　　ہیں تو مسلماں مگر نام کے
لے گئی ایماں تری چشم مست　　اہل نظر رہ گئے دل تھام کے

جب "لسان العصر" اپنی تعلیم کا اثر خاطر خواہ نہیں دیکھتے تو سبب اصلی کا انکشاف کر دیتے ہیں۔

میرا[۱] مسلک کچھ جدا ہے شیخ کے اسلام سے　　یاں خدا سے کام ہے اس کو خدا کے نام سے
یاں نگاہ خاص سے ہوتا ہے دل کو انبساط[۲]　　اس کو راحت ملتی ہے فطرت کے فیض عام سے
عشوۂ ساقی کا یاں طالب ہوں میں بہر سرور　　اخذ[۳] کر لیتا ہے وہ مستی کو دور جام سے

---

[۱] طریقہ و راستہ [۲] خوشی [۳] حاصل کر لیتا ہے۔

ہے کفیل[1] کارِ سیرایاں جنونِ صلح عیبتر — واسطہ رہتا ہے اس کو عقل جنگ انجام سے

اب آپ ہی انصاف فرمائیے "صراطِ مستقیم" کون ہے اور کس کا اسلام حقیقی اسلام ہے۔

ہوئی طریق بزرگاں کی پیروی مفقود — بس ان کے نام پہ لٹھ صبح و شام چلتا ہے

کسی اخبار کو اٹھا لیجئے۔ نام نہاد پیر یا بزرگوں کے نام پر بے جا لڑے مرتے ہیں اور "پیروی" حقیقتاً مفقود ہوتی جاتی ہے۔

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے — مسجد سے ہم نکل گئے بسکٹ کی چاٹ سے

اس شعر میں معاذ اللہ جناب آدم کی کوئی تضحیک نہیں ہے۔ ایک لطیف پہلو تو یہ ہے کہ بہشت و مسجد ہم رتبہ ہیں اور دوسرا یہ کہ مسجد ہم نے نہایت معمولی چیز کے بدلے چھوڑ دی۔

ان ستونوں پر نہ سنبھلے گی تری سقف حرم — خط ترسا پر اگر بنیاد ڈالی جائے گی

قاعدہ ہے کہ ہوشیار کاریگر اور معمار دیوار بنیاد قائم کرتے وقت پہلے سوت اور کھریا کے نشان ڈال لیتے ہیں۔ تقلیدی طور پر اعمال اسلام میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

جو پوچھا مجھ سے دور چرخ نے کیا تو مسلماں ہے — میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے — اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ — ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

یہ نظم مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ماتم ہے۔ ظرافت کے پردہ میں کیسی کھری کھری باتیں سنا دی گئی ہیں اور حضرت اکبر سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مصرعہ ثانی و ثالث میں تھوڑا سا رنگ طبیعت بھی شامل ہے۔

شان نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے — مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

وہ نماز جس کے لئے اقبال کہتے ہیں کہ :۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اسی نماز جماعت میں لوگ آپس میں تفریق کرنے لگے ہیں۔ غریب وفاتی جو مسلم ہونے کی حیثیت سے تمام مسلمین کے برابر ہے اس کو صف میں سب کے برابر جگہ نہیں ملتی

---

[1] راہبر۔ کام سنبھالنے والا۔ راستہ بتانے والا۔

کہاں مسجد میں وہ اگلے سے مسلم خدا کے نام کی خانہ پُری ہے

ماضی وحال کا موازنہ ہے۔

اگرچہ دعوے اسلام ہے مگر بالفعل سوا خدا کے ہمارا کوئی گواہ نہیں

غریب مسلمین واقعی شاہد حقیقی کے سوا اور کس کو اپنا گواہ پیش کر سکتے ہیں۔

اصلیت

شیخ کے حق میں اُٹھا رکھا ہے کیا رندوں نے   ظرف انہیں کا ہے کہ سب کچھ یہ پئے جاتے ہیں

برداشت کیئے جاتے ہیں۔ شراب پیئے جاتے ہیں۔ دونوں پہلو ہیں۔

جو مال ہی پہ ہے نظر تو خون ہے اور تر اجگر   مرض ہے جس کو حرص کا کبھی اسے شفا نہیں

واقعی حریص آخر کار خود تباہ ہو جاتا ہے۔

دیکھیں پروانے کو دعوے پہ ابھرنے والے   عشق اسے کہتے ہیں یوں مرتے ہیں مرنے والے

کہنے والے اور کرنے والے میں بڑا فرق ہے۔

ترکیب و تکلف لاکھ کرو فطرت نہیں چھپتی اے اکبر   جو مٹی ہے وہ مٹی ہے جو سونا ہے وہ سونا ہے

مٹی پر بھی سونے کا پانی چڑھ جاتا ہے مگر کتنی نگاہیں دھوکا کھاتی ہیں اور پھر کتنے دنوں تک؟

زوال جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے   کہ دُنیا کو بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے

انسان "دُکھ کر سیکھتا ہے" اسی کی تشریح ہے۔

ہے بے اثر کیا نہیں جس نے فقط کہا   اکبر نے یہ کہا تو کچھ کیا بُرا کہا

"اگر قائل عامل بھی ہو تو وزن قول بہت بڑھ جاتا ہے"

کیا دین کو قوت دیں یہ جوان جب حوصلہ افزا کوئی نہیں   کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں   اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا

کلام پاک میں حضرت آدم کے گیہوں کھانے کی مفصل حکایت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے جب انہوں نے مالک کے خلاف مرضی گیہوں کھا لیا تو "اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا"

نفس ہی کی خواہشوں کا ہے نفاذ   روح نے مذہب کو ڈگری دی تو کیا

جب تک تہذیب نفس نہو مذہب سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

انر و دولت میں خود واعظ ہیں غرق   دوسروں پر نکتہ چینی کی تو کیا

ہمارے لیڈران قوم ذرا اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھیں۔

بظاہر تھا براق راہ عرفاں — چو دم برداشتم لیڈر بر آمد

"چو دُم برداشتم" ایک لفظ بدل دینے سے تمام مفہوم بدل گیا۔

کوئی واعظ نہیں فطرت سے بلاغت میں سوا — مگر انسان میں کچھ فہم اشارات تو ہو

حقیقت یہی ہے کہ فطرت اور طبع انسانی سے بڑھ کر دوسرا کوئی رہبر اور مقرر نہیں ہو سکتا۔

نہ پھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے اچھا سمجھتا ہے — تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

Know Thyself خود اپنی حقیقت معلوم کرو اگر عالم کی نگاہوں تم نہایت اچھے ہو اور خود اپنی نگاہ میں بُرے ہو تو ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند — خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

ظاہر اور باطن کا فرق اس سے زیادہ اچھے پیرایہ میں نہیں دکھایا جا سکتا۔

دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو لمبا قصہ ہے — ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے

اگر انسان اس امر پر غور کرے تو بہت سے فائدے صبر و قناعت و کوشش کے حاصل ہو سکتے ہیں۔

جب خوب کیا کا کوئی موقعہ نہ نکالا — پھر کیا جو ہوئی دھوم فقط خوب کہی کی

علم و عمل کا فرق قابل غور ہے۔

ہے وہی دیوار میں مٹی بگولے میں جو ہے — نیو کے پنجے میں وہ ہے یہ ہوا کے ہاتھ میں

کاش یہ شعر صائب کے کانوں تک پہنچ جاتا۔ نیو اور دیوار کا فرق لائق دید ہے۔

الفاظ کی شوکت و نزاکت پہ نہ جاؤ — قائل کو قول کے اثر میں دیکھو

اگر نہایت عمدہ بات موثر طریقہ سے سادہ لفظوں میں بیان ہو جائے تو وہ اس مسجع اور مرصع عبارت سے ہزار گنا بہتر ہے جو بے اثر ہو۔

دعا کو بھی وہ کبھی ہے اُٹھتا اسے ہے دن رات حرف چکر — خدا کی قدرت کے کارخانے میں ہاتھ بھی ہے مشین بھی ہے

فطری اور مصنوعی اشیاء میں جو فرق ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

دل کو غفلت نے کدورت میں چھپا رکھا ہے — بخل نے زر کو تہ خاک دبا رکھا ہے

کیا عمدہ مثال ہے، لفظوں میں تصویر کشی اسی کو کہتے ہیں۔

سنئے حکمت جو میری گفتار میں ہے — اک حد ادب ہر ایک سرکار میں ہے

پروانہ سے شمع نے لپٹنا چاہا   پہلے تھا نور میں پر اب ناز میں ہے

"ایاز قدر خود بہ شناش" کو عاشقانہ رنگ میں لاکر مضمون میں نئی روح پھونک دی۔ حد سے زیادہ بڑھنے میں جو خرابیاں ہیں وہ بھی بیّن طریقہ سے بتادی گئی ہیں۔

کہا کسی نے یہ سید سے آپ اے حضرت   نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
نہ آپ عالم برزخ[1] سے مانگتے ہیں مدد   نہ فاتحے کے طریق ادا کو مانتے ہیں
نظر تو کیجئے اس بات پر جو ہیں ہندو   بہ صد خلوص ہر اک دیوتا کو مانتے ہیں
بہت وہ ہیں جو عناصر پرست ہیں دل سے   وہ آگ پوجتے ہیں یا ہوا کو مانتے ہیں
کرسچین بھی فدائی ہیں نام مریم کے   بہ دل مسیح علیہ الثنا کو مانتے ہیں
خود آپ ہی میں جو ہیں شیعیاں با تمکین   وہ اہل بیت کو آل عبا کو مانتے ہیں
وہ لوگ جو ہیں ملقب بہ صوفیائے کرام   فدا قبور پہ ہیں اولیا کو مانتے ہیں
مرادیں مانگتے ہیں لوگ پاک روحوں سے   کسی بزرگ کو یا مقتدا کو مانتے ہیں
پھر آپ میں یہ ہوا کیا سما گئی ہے کہ آپ   نہ دستگیر نہ مشکل کشا کو مانتے ہیں
جواب انہوں نے دیا ہم ہیں پیروِ قرآں   ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں
اسی کا نام زبان پر ہے حی اور قیوم   اسی کی قدرت بے انتہا کو مانتے ہیں
یہ بوئے شرک ہی ہے جنگ و اختلاف کی جڑ   تو عقلمند کب ایسی بلا کو مانتے ہیں
جواب حضرت سید کا خوب ہے اکبر   ہم ان کے قول درست و بجا کو مانتے ہیں
ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر   خدا کو اور نہ طریق دعا کو مانتے ہیں

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوت فرماں روا کو مانتے ہیں

ظاہر پرستوں کی انتہا ہو چکی ہے لوگ اصول مذہب سے بیگانہ ہو کر فروغ کی بھول بھلیاں میں کھو گئے ہیں اس نظم میں خود اکبر کے معتقدات سید صاحب کی زبانی صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔

---

[1] موت اور حشر کا روحانی عالم۔

اس کو چکر ہی رہا اور یہ خدا تک پہنچا دل پر سوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا
اس کے دربار تک پہنچنے کے لئے سوز باطن ہی درکار ہے۔

لطیف الطبع ساتھی چاہئے فیاض طینت کا چمن سے بے ہوا کے کارواں بو نہیں چلتا
کتنی اچھوتی اور لطیف بات پیدا کی ہے۔

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے اس کو تو میں دُنیا کی ترقی نہ کہوں گا
اس کا اندازہ وہ خوب کر سکتے ہیں جو محاسب اور اقتصادی ہیں۔

کم بضاعت کو جو اک ذرہ بھی ہو جائے نصیب خود نمائی کو وہ اڑ چلتا ہے جگنو کی طرح
جگنو میں کیا ہے نور کا محض ایک ذرہ ہے۔

گذشتہ آں قدر یاراں ز حد سید لے اکبر کہ آں مرحوم اکنوں در شمار شیخ می آمد
محض سید و شیخ کے الفاظ کا لطف دکھانا مقصود ہے۔

فلاسفی کو ہے مرغوب طبع الا اللہ طریق سینٹفک کو ہے لا الہ پسند
لفظی نزاع کو چھوڑ کر حکیمانہ اور فلسفیانہ طریق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

رہا رسول کا درجہ سو وہ تو ہے قانون کرے حریف اسے ناپسند خواہ پسند
درجہ رسالت کا اعتقاد مسلم کے لئے ناگزیر ہے۔

اب اس کے آگے ہے جو کچھ گروہ بندی ہے ہر اک کو اپنی ہی نسبت ہے واہ واہ پسند
واقعی اگر ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی نگاہ سے اپنے آپ کو دیکھے تو خود نمائی خود فروشی خود پسندی اور خود ستائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اے برہمن کہوں گا ہر بحر کو میں مائی موقوف کچھ نہیں ہے گنگا و نربدا پر
اگر محض امواج آب آور وجہ تقدس ہیں تو گنگا و نربدا کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی دوسرے یہ کہ وسعت نظری کا سبق دیا گیا ہے۔

کیا جانئے سید تھے حق آگاہ کہاں تک سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک
حد سے گذر جانے کی خرابی دوسری شان سے دکھائی گئی ہے۔

یہاں کی عورتوں کو علم کی پروا نہیں بیشک — مگر یہ شوہروں سے اپنے بے پروا نہیں ہوتیں

غلط تعلیم نسواں یقیناً بیوی کو شوہر سے ایک بہت بڑی حد تک بے نیاز کر دیتی ہے واقعات عالم شاہد ہیں۔

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں — افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

دُنیا کے بہت سے اختلاف محض لفظی نزاع ہیں اور کچھ نہیں۔

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی — ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم ان کے ہاتھ میں

اگر مغرب کی ترقی اور مشرق کا تنزل یوں ہی ہے تو یقیناً کچھ دنوں میں سارا مشرق غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا نظر آئے گا۔

دید نرگس سے چمن میں لطف اُٹھاؤ بے خطر — لیکن اس چشم فسوں انگیز سے ڈرتے رہو

احتیاط اور دور اندیشی سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ نرگس اور چشم فسوں انگیز میں وجہ شبہہ نہایت لطیف ہے۔

اکبر دعا کا ذوق ہو کیوں کر نصیب دل — اُٹھے نہ درد دل بھی جو دست دعا کے ساتھ

جب تک دل سے دعا نہ کی جائے بے لطف و بے اثر رہتی ہے۔

نہیں ہاتھ آتی دولت نام رٹنے سے بزرگوں کے — ہجا سے جد کے ترکیب زبرجد ہو نہیں سکتی

"پدرم سلطان بود مرا چہ" کو جد و زبرجد کے نکتہ سے نہایت بلند کر دیا ہے۔

نہایت خوشنما پتھر پڑے ہیں عقل پران کے — جنھیں تسکین بے لعل و زمرد ہو نہیں سکتی

"خوشنما پتھر" کی تعریف ناممکن ہے۔ تضحیک وطعن کا سبق لوگوں کو اکبر سے سیکھنا چاہیئے۔

یہ بات تو اچھی ہے کہ الفت ہو سوں سے — حوران کو سمجھتے ہیں قیامت ہے تو یہ ہے

وہی حدوں والی بات تیسرے طریقہ سے بیان کی گئی ہے۔

کیا شک ہے آفتاب کے شان و جلال میں — روشن تر اس سے کون سی شے ہے خیال میں

لیکن نہیں وہ کچھ بھی موثر پس از غروب — لازم ہے غور کیجیئے اس مسئلے پہ خوب

ہرچند تم خیال کرو آفتاب کا — گوشہ بھی اُٹھ سکے گا نہ شب کی نقاب کا

پوچھو گے اس کو تب بھی وہ پھیرا نہ جائے گا — اس کو پکارنے سے اندھیرا نہ جائے گا

انسان کا حال بھی میرے نزدیک ہے یہی — تحقیق کی نظر سے جو کرو ٹھیک ہے یہی
کتنا ہی کوئی صاحب اوج و کمال ہو — کتنا ہی با اثر ہو کہ عالی خیال ہو
جب کر گیا جہاں سے وہ ملک عدم کو کوچ — پھر اس سے کچھ مدد کا تصور ہے ہیچ پوچ
قیوم و حیّ ذات ہے اللہ کی فقط — زندہ ہمیشہ بات ہے اللہ کی فقط
سن لو کہ اتباع و ادب اور چیز ہے — مطلب کی لیکن ان سے طلب اور چیز ہے

آزردہ کوئی شیخ ہو یا برہمن خفا
حقانیت یہی ہے یہی ٹھیک فلسفا

سید صاحب والی نظم "نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں" کو اس نظم سے ملا کر پڑھئے تو لطف آجائے بعض نکات جو اس سلسلہ میں بیان ہونے سے رہ گئے تھے وہ نہایت عمدگی سے ایک نئے پیرایہ میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

کہتے ہیں مغلوب ہے اکبر خیال حور سے — کہدو یہ بہتر ہے جھوٹے بسکٹوں کے چور سے

حور ایک موہوم ہستی سہی پھر بھی دوسروں کے اُگلے ہوئے لقموں سے بہتر ضرور ہے۔

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں — یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زباں و ہم قسمت — کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں

اتحاد ہندو مسلم کی تحریک کے لئے ان الفاظ سے زیادہ موثر الفاظ مل نہیں سکتے۔

شمع سے تشبیہ پا سکتے ہیں یہ عیاش امیر — رات بھر پگھلا کریں دن بھر رہیں بالائے طاق

ہندوستان کے بہت سے راجہ اور نوابین کی سچی حالت کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔

نام خدا کو اکثر زیب زباں تو پایا — عشق بتاں کو لیکن نقش قلوب دیکھا
اوروں پہ معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی — اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

انسان میں اگر ظاہر و باطن کا فرق کرنے کی قابلیت آجائے اور نفس شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو بے جا اعتراضات کا بہت بڑا حصہ دنیا سے غائب ہو جائے۔

جو دیکھی ہسٹری[1] اس بات پر کامل یقیں آیا — اسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

اس واسطے کہ شہید، غازی، بہادر اور دنیا کے زبردست لوگ مر کر زندہ جاوید ہوئے ہیں۔ — [1] ہسٹری = تاریخ۔

کیا کہیں اوروں کو یہ ایسے ہیں وہ ایسے ہیں　　سچ جو پوچھو تو ہمیں کون بہت اچھے ہیں

ہم میں عیب جوئی کی خراب عادت بہت ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم کو اپنی اچھائی کا خیال ہر وقت دامنگیر رہتا ہے۔

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے جھگڑے کو شیعہ سنی　　بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش[1] تم بھی ملکش وہ بھی

آپس میں شیعہ و سنی لڑا کریں مگر شخص ثالث کے سامنے واقعی دونوں کی حیثیت ایک سی ہے اگر دونوں ایک ساتھ ہو کر عمدہ راستوں پر گامزن ہو تو یہ خرابی جا سکتی ہے۔ [1] نجس۔

بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انھیں فرنگی کے پاس پہنچا　　وہ بولا اس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی بیٹھو وہ بھی بیٹھو

فلک نے آخر ہر اک کی سن کر کہا کہ تم سب ہو مست غفلت　　سمجھ لو اس کو تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

جو خیال ان مصرعوں میں ادا کیا گیا ہے وہ محض شاعرانہ نہیں ایک ایک حرف اصلیت سے بھرا ہوا ہے۔

جو ایر شپ[1] پر چڑھے تو ایسے کہ بس ہمیں ہیں خدا نہیں ہے　　جو ایر شپ سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہے

[1] ہوائی جہاز　　۔ انقلاب کی تصویر سے حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

رقبہ تمہارے گانوں کا میلوں ہوا تو کیا　　رقبہ تمہارے دل کا تو دو انچ بھی نہیں

انسان کو دل کا دھنی ہونا چاہئے ورنہ ساری دولت بیکار ہے۔

دانے کو ہے حق نشو و نما اس سے تو نہیں انکار مجھے　　لیکن یہ بتاؤ مجھ کو ذرا وہ کھیت میں ہے یا پیٹ میں ہے

ہر ترقی کے لئے موقعہ و محل ہوتا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیے اگر دانہ پیٹ میں اپنا حق نشو و نما استعمال کرے تو آپ کی کیا درگت ہو جائے۔ دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ حقوق اور آزادی کی بھی حدیں ہوتی ہیں۔

انقلاب زمانہ

نہ کرو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب   بے اثر ہوگی شرافت مال دیکھا جائے گا

اس شعر کی توضیح کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی واقعی دولت کے سامنے حسب و نسب کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

وہ مطرب اور وہ ساز وہ گانا بدل گیا   نیندیں بدل گئیں وہ زمانہ بدل گیا

زمانہ کی نئی کروٹ کو کیسے اچھوتے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

نغمہ سنجی سے تو آتی تھی خواتین کو شرم   ساز مغرب سے مگر ہوگئی اب ناچ کی دھن

جنھیں سرود پسند نہ تھا وہ اب رقص میں نظر آتے ہیں یہ انقلاب نہیں ہے تو کیا ہے؟

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب   گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

دوسرا مصرعہ کمال شاعری ہے۔

ختم کیا صبا نے رقص فصل بہار ہو چکی   جوش نشاط ہو چکا صوت ہزار ہو چکی
نیک و بد زمانہ کو دیکھ کے گل نے راہ لی   لطف نسیم ہو چکا کاوش خار ہو چکی
رنگ بنفشہ مٹ گیا سنبل تر نہیں رہا   صحن چمن میں زینت نقش و نگار ہو چکی
مستی لالہ اب کہاں اس کا پیالہ اب کہاں   دور طرب گذر گیا آمد یار ہو چکی
رُت وہ جو تھی بدل گئی آئی بس اور نکل گئی   تھی جو ہوا میں نکہت مشک تتار ہو چکی
اب تک اسی روش پہ ہے اکبر مست و بے خبر   کہدے کوئی عزیز من فصل بہار ہو چکی

فطرت کا قاعدہ ہے کہ فیض تقابل اور حسن موازنہ سے چیزوں کی اصلی حالت نظر آتی ہے موجودہ حالت کی بے رنگی دکھانے کے لئے ماضی کی دلفریب تصویریں جس عمدگی سے کھینچی گئی ہیں اس کا پتہ صرف اس سے چلتا ہے کہ بار بار پڑھنے میں لطف ترنم اور کیف اثر بڑھتا جاتا ہے۔

یہ موجودہ طریقے راہئی ملک عدم ہوں گے   نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنواں سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی   نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی   نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی — کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے — مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

یہ بالکل سچ ہے کہ شاعر کی نگاہ نہ صرف ماضی و حال کے تمام کنہ تک پہنچتی بلکہ بالکل جوتش اور قابل منجم کی طرح آنے والے زمانہ میں بھی بہت دور تک جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر کا کلام عالمگیر ہوتا ہے اور ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی دلوں پر اس کا اثر بہت زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اکبر کی کچھ پیشینگوئیاں اصلاحات و انقلابات افغان میں پوری ہو چکی ہیں مقطع سے پہلے کا شعر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

لباس، آرایش، مصر و ترکستان و افغانستان وغیرہ۔

روحانیت کے بدلے آنکھوں میں خاک اب ہے — اس میں وہی وہی تھا اس میں ہمیں ہمیں ہے

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے

وہ تھا اک وقت جب سیر چمن میں پھول چنتے تھے — زمانہ ایک یہ ہے خاک اُڑاتے ہیں بیاباں کی

یہ طفل ناداں غریق غفلت ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں
بہار ہی سے نہیں ہیں واقف خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہیں انھیں کے دل پر جو محو رنگ چمن رہے ہیں

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست — حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

نیا فلک ہے نئے ستارے یہ شوق سے کرتے ہیں نظارے — انھیں کو کچھ حس ہے گردشوں کا جو زیر چرخ کہن رہے ہیں
بہت خفا تھے مسائل دیں کہ ہو رہی ہے ہماری توہیں — اب ان کو منطق منا رہی ہے وہ سر جھکائے ہیں من رہے ہیں

کیا تصویر کھینچی ہے۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے — کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی — کیک کو چکھ کے سیوئیوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر پگھلی طبیعت ایسی — چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیسے کیسے دل نازک کو دکھایا تم نے — خبر فیصلہ روز جزا بھول گئے
بخل ہے اہل وطن سے جو وفا میں تم کو — کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے
نقل مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں — اور یہ نکتہ کہ میری اصل ہے کیا بھول گئے
کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو — جبکہ بوڑھے روش دین خدا بھول گئے

اکبر کبھی ہندوستان سے باہر نہیں نکلے مگر اعجاز تخیل دیکھیے لندن کی لائف کا ایسا جیتا جاگتا فوٹو کھینچا ہے کہ مشاہدہ عینی کا دھوکا ہوتا ہے لطف یہ ہے زجر و توبیخ کا لب و لہجہ اتنا ملائم اور دلنشین ہے کہ پڑھنے والے کو پتہ بھی نہیں چلتا اور الفاظ اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔

چکر آیا اک ایسا جھولا جھولے — قومی عزت کی ہسٹری کو بھولے

ہم کو تو اپنی ذات کے سامنے نہ قوم کا خیال ہے اور نہ خود اپنی ہی تہذیب نفس کی طرف توجہ ہے ایک ذرا سی مادی ترقی ہوئی اور ہم پھولے نہیں سماتے۔

عزیزان وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس — چرٹ اور چاء کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے

= اطلاع سامان مدارات بھی بدل گئے۔

اللہ رے انقلاب طرز و مذاق مشرق — حافظ کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈر
لیلیٰ کا ناز رخصت اسکول مسٹرس ہیں — سودائے قیس غائب اب وہ بنے ہیں لیڈر

تصویر مضحکہ آمیز ضرور ہے مگر نصیحت خیز بھی ہے۔

تسبیح وہ اب کہاں وہ تہلیل کہاں — قرآن مجید کی وہ ترتیل کہاں
کل کے آگے خیال فردا کس کو — جب ریل ہے سامنے تو جبریل کہاں

نہ اب وہ طشت زریں ہیں نہ وہ چاندی کے کلسے ہیں
کمیٹی خوانِ نعمت ہے فقط لفظوں کے جلسے ہیں

اب کہاں دستِ جنوں تار گریباں اب کہاں
پانیر در دستِ مجنوں اور خبر ہے تار کی

لے لیا شیریں نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا
ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی

صرف مشرقی شاعری نہیں مشرقی رنگ محبت بھی بدل گیا ہے۔

نظروں میں بسا ہے رنگ چمن آنکھیں وہی گلشن ڈھونڈھتی ہیں۔
موسم وہ نہیں ہے اے اکبر جو بات تھی کل وہ آج کہاں

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت
وضو کی اور مناجات سحر کی

مگر ہاں چائے پیکر حسب دستور
تلاوت کرتے ہیں وہ پانیر کی

کتنے مناسب لفظوں میں تلاوت قرآن کی ترغیب کی ہے اور بتایا ہے کہ صبح کا تھوڑا وقت ہم اس میں صرف کریں تو نہایت عمدہ بات ہے۔

رنگ ہی کچھ اور اب تو روز و شب کا ہو گیا
جس طرف دیکھو دگرگوں حال سب کا ہو گیا

اس تغیر سے مگر اس پر نہیں پہنچا ضرر
انقلاب آیا بھی اکبر پر تو رب کا ہو گیا

لفظ اکبر کو اُلٹ دیجیے "رب کا" ہو جاتا ہے۔

بزمِ ہستی میں مرے پیشِ نظر کیا کچھ نہ تھا
دیکھتے ہی دیکھتے لیکن جو دیکھا کچھ نہ تھا

بیک لحظہ بیک ساعت بیک دم
دگرگوں می شود احوالِ عالم

پنجۂ شیخ سے نکلے تو پریشاں ہیں اب
ٹوٹی تسبیح کے دانے یہ مسلماں ہیں اب

انتشار مسلمین کی تصویر اس سے زیادہ موثر اور مکمل کھینچی ہی نہیں جا سکتی۔

رہ گئے کم عربی شعر سمجھنے والے
چل بسے گیسوئے لیلیٰ میں اُلجھنے والے

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے
اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

جدّ امجد خود میں کرتے تھے یہ موسم بسر
ہم کو اپنے عہد میں پالا پڑا اکنٹوپ سے

ذرا اخلاف اور اسلاف کی شجاعت کا اندازہ کیجیے۔

جہاں نے ساز بدلا سازنے نغموں کی گت بدلی
گتوں نے رنگ بدلا رنگ نے یاروں کی مت بدلی

فلک نے دور بدلا دور نے انسان کو بدلا
گئے ہم تم بدل قانون بدلا سلطنت بدلی

تم نے جو سنا صحیح ہے ہاں صاحب — عربی سے گریز کرتے ہیں خاں صاحب
سچ کہتے ہیں وہ کہ ہم کو اس سے کیا کام — ہیں کیمپ میں ہم تو خانساماں صاحب
پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے — کہنے لگے اس سے تیرا مطلب کیا ہے

الٰہی تیری پناہ مذہب اب محض ایک لفظ بے معنی ہے جس کی ہم کو روزانہ زندگی میں کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

وہ اک دن تھا میاں کو عار تھا صاحب بھی بننے میں — پڑا اب سایہ مغرب تو بی بی بھی بنیں آیا
اس انقلاب پر جو میں رووں تو ہے بجا — مجھ کو وطن میں اب کوئی پہچانتا نہیں

بظاہر اس شعر میں محض حسن بیان معلوم ہوتا ہے مگر پہچاننا کی بلاغت پر غور کیجئے تو حقیقت معلوم ہو انتہائے انقلاب ہے کہ وطن والے جانتے ضرور ہیں مگر نہیں پہچانتے۔

زمان حال میں اگلے فسانے امر ماضی ہیں — جو تلواریں چلاتے تھے وہ اب ٹھوکر پہ راضی ہیں
خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا — کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی
افسوس ہے گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے — شاخ گل تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے
اس قوم سے وہ عادت دیرینۂ طاعت — بالکل نہیں چھوٹی ہے مگر چھوٹ رہی ہے
وہ راہ شریعت کہ جہاں بچھتی تھیں آنکھیں — یہ کفر کے کنکر سے اسے کوٹ رہی ہے

میں وطن سے حزین و ملول پھرا نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا وہ چمن ہی نہ تھی وہ ہوا ہی نہ تھی

کہوں یہ رندان ایشیاء سے کہ بزم عشرت کے ٹھاٹھ بدلیں — اڑن کھٹولا ہے اب مسوں کا گئی پری جان کی وہ ڈولی

ہم محض تخت سلیمان اور اڑن کھٹولے کے قصے لیکر بیٹھے ہیں اور یورپ والے صناعیوں سے طیارے بنا بنا کر حقیقتاً اوج فضاء میں اڑتے پھرتے ہیں۔

جو گذرو گے ادھر سے میرا اجڑا گانوں دیکھو گے — شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے

ہندوستاں کے بہت سے قدیم اور مقدس مقامات کی سچی تصویر اس شعر کے پڑھتے ہی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں ینگ بدھو وارث اسلام ہیں
گردش گردوں کے آگے کس کا زور کون دم مارے خدا کے کام ہیں

اولڈ مرزا = پُرانی روش کے باوضع یا مذہب بزرگان قوم۔

ینگ بدھو = نئی روشنی کے کم درجہ گرویدہ نوجوان۔

فروغ دل اب نہیں ہے باقی وہ سوز و ساز اس میں اب کہاں ہے
یہ آہ و فریاد ہے جو لب پر بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے

ہماری فریادوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ شکوہ اقبال صدائے صحرا ہو کر کیوں رہ گیا؟ اس کے اسباب جو کچھ ہوں سوز و ساز بھی شامل وجوہ ضرور ہے۔

دور قرآن و تجارت ہو چکا اب زمینداری ہے یا تنخواہ ہے
دل میں اب نور خدا کے دن گئے ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

سو برس کے بعد مردہ ہڈیوں میں ایک خاص روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس پر اکثر مسافروں کو ویرانوں میں بھوت شیطان کا دھوکا ہوتا ہے۔

بے ثباتی دُنیا

زبانِ خلق پر بس اک فسانہ و فار ہا — نہ ہم رہے نہ دل رہا نہ دل کا مدعا رہا
نئے بنائے سازِ عیش چرخ نے سدا مگر — فنا کی دھن پہ مستقل جہان بے بقا رہا
ہم کو زیرِ آسماں ہو کر گذرنا ہی پڑا — منزلِ ہستی پہ لٹنے کو ٹھہرنا ہی پڑا

ہماری زندگی ناگزیر ہے۔

یہ سست ہے تو پھر کیا وہ تیز ہے تو پھر کیا — نیٹو جو ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا
نہ وہ بک رہ گئے سرسید — دل احباب سے نکلتی ہے آہ
ذاتِ محمود سے تسلّی تھی — لی اُنھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ — اے حریصانِ شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقشِ احمد و محمود — رہ گیا لا الہ الا اللہ

جسٹس محمود سرسید احمد کے لڑکے۔

فنا اسی رنگ پر ہے قائم فلک وہی چال چل رہا ہے — شکستہ و منتشر ہے وہ کل جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے

دُنیا کی تمام مصنوعات اور ایجادات کا یہی رنگ ہے کہ باہمی اجزا کے ملنے سے ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہے اور بکھرنے سے ایک دوسری شکل ہو جاتی ہے۔

یہ دیکھتے ہو جو کاسہ سر غرور غفلت سے کل تھا مملو — یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے، نظر ہو جس کی وسیع دیکھے — ابھی یہاں خاک بھی اُڑے گی جہاں یہ قلزم ابل رہا ہے
دنیا کے لئے ہنگامے تھے خلق ایک طرف آپ ایک طرف — اب شہر خموشاں عالم ہو مٹی ہے لحد کا کونا ہے
ہے کاما ہی کاما جو پڑھا دہر کا نامہ — جز موت کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے

کاما ایک نشان ہے جہاں ذرا سا رُکنا پڑتا ہے۔ فل اسٹاپ انگریزی Coma (,) Fullstop (.) تحریر کا وہ نشان ہے جو ختم جملہ پر ہوتا ہے اور جہاں بالکل رُک جانا پڑتا ہے پوری سانس لے کر آگے بڑھنا ہوتا ہے

مٹ گئے نقش و نگار دیر فانی کے مرید — نام انہیں کا رہ گیا روشن جو ہر کو جب گئے
پوچھتا کوئی دم مرگ سکندر اکبر — کتنے دن کی یہ تعلی تھی کہ دارا نہ رہا

منتشر ذروں کو یکجائی کا جوش آیا تو کیا | چار دن کے واسطے مٹی کو ہوش آیا تو کیا
عارضی ہیں موسم گل کی یہ ساری مستیاں | لالہ گلشن میں اگر ساغر بدوش آیا تو کیا
دور آخر بزم دنیا کا ہے جام خون دل | عیش اس محفل میں بن کر بادہ نوش آیا تو کیا
حد حیرت ہی میں رکھا ضعف نے ادراک کو | پیکر خاکی کو اس عالم میں ہوش آیا تو کیا

بہ ظاہر ہم کو ہوش آیا مگر ہم پر اسرار عالم میں سے ایک سر بھی نہیں کھلا۔

بزم دُنیا میں کہاں سامان حشمت کو ثبات | گم ہوئی مہر سلیماں جام جم جاتا رہا

مہر سلیمان = حضرت سلیمان کی انگوٹھی جس کی وجہ سے وہ سارے عالم پر حکمراں تھے اور تمامی مخلوق کی زبانیں سمجھتے تھے۔

جام جم = فارس کے شہنشاہ جمشید کا ساغر ہے جس میں تمام دنیا کا حال معلوم ہوتا تھا۔

دو روزہ زندگی ہے جاہ و حشمت پر نہ ہو غافل | فریدوں ہے نہ کیخسرو سکندر ہے نہ دارا ہے
لوگ کہتے ہیں یہاں اکبر کبھی آباد تھا | شاید ایسا ہی ہوا اب تو خاک کا اک ڈھیر ہے
میں مست بادہ عبرت ہوا ہوں اس تصور سے | کہ دو ذرے بھی اب اک جا نہیں ہیں ساغر و جم کے

جمشید اور اس کے جام "جہاں نما" کی مٹی ایسی برباد ہوئی کہ دو ذرے بھی اکٹھا نہیں ہیں۔

اس بزم میں کیا آثار ملے ہنگام سحر سامانوں کے | اک داغ تھا شمع مردہ کا کچھ پر تھے پڑے پروانوں کے
ہستی کی یہ لہریں دام نظر دم بھر میں نشاں ان کا نہ اثر | گرداب فنا میں غرق ہیں اب دریا ہیں رواں افسانوں کے
دل لذت نفس کا گرویدہ دنیا کی حقیقت پوشیدہ | امڈے ہیں قریب امیدوں کے طوفان ہیں بپا ارمانوں کے
ہر گام پہ ہیں قبروں کے نشاں ہر سمت ہے اک عبرت کا سماں | اجڑا ہے محل آبادی کا آباد ہیں گھر ویرانوں کے

غالب کا مشہور قطعہ اس کے ساتھ پڑھئے تو لطف آئے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل | زنہار اگر تمھیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو | میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے
کل شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط | دامان باغبان وکف گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں | نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغ تپ فراق کی شب بھر جلی ہوئی | اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اکبر نے یقیناً غالب سے اچھی زمین موسیقی و جذبات کے اعتبار سے پسند کی ہے۔

کل برگد تھا جن کا براتی　　ان کی قبر پر پھول نہ پاتی
عبرت یہ ہے دوہا گاتی　　ستّر پوت بہتر ناتی

(جس راوں کے دیا نہ باتی) کیسی سلاست اور صفائی ہے۔

ذرے ہیں چند جن کو صنعت اُبھارتی ہے　　اک خاک عبرت آگیں لیکن پکارتی ہے
اس انجمن میں، ہم بھی اک رات جل چکے ہیں　　تم شمع بن رہے ہو اور، ہم پگل چکے ہیں

شمع کی تعمیر میں جو راز بربادی مضمر ہے اس کو کتنی خوبی سے بیان کیا ہے اور نوجوانان ناواقف کو بر سہا برس کا تجربہ ذاتی کس اسلوب سے بتا دیا ہے۔

پردہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں　　اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مرحوم کی یہ رباعی سلاست بیان اور اختصار لطیف کی بدولت اس قدر مقبول ہوئی کہ اکثر اخبار و رسائل میں چھپتی رہی، بات ہے اور چبھتی ہوئی، ظرافت ہے اور سنجیدہ، اکبرؔ اگر قادر الکلام نہ ہوتے تو پہلے مصرعہ میں "بی بیاں" کا انتخاب ذرا مشکل تھا، سطحی نظر رکھنے والوں کے نزدیک "عورتیں" بھی اتنا ہی معنی خیز ہوتا جتنا کہ "بی بیاں" ہے، مصرعہ بھی درست ہوتا، تقطیع بھی نہ بگڑتی، وزن میں بھی پاسنگ کا فرق نہ ہوتا، مگر معنی میں حقیقتاً زمین اور آسمان کا فرق ہو جاتا، "عورتیں" ایک عام کلمہ ہے، جس کو کسی مذہب و ملت سے کوئی خاص نسبت نہیں انگریزی ہو یا فرانسیسی، جاپانی ہو یا ہندوستانی، لیکن اُردو کی زبان اور روزمرہ کے لحاظ سے "بی بی" کا لفظ اُس خاص طبقۂ لطیف تک محدود ہے جس کی طرز معاشرت دوسری ہمسایہ قوموں سے ممتاز ہے اور جن کے اصول زندگی میں پردہ بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے اکبرؔ نے "بی بیاں" کہکر اپنے تخاطب کو ممیز کر دیا، "قومی" کی خصوصیت بھی نہایت نازک ہے، شاعر کے نزدیک خود غرضی ایک زبردست گناہ ہے، اگر اس ہوش رُبا نظارہ کا اثر صرف اکبرؔ ہی تک محدود رہتا تو "غیرتِ فطری" سے کام چل جاتا، لیکن دردِ اسلام اور اخوت قومی نے ایسا غلبہ کیا کہ موصوف نے اپنے محسوسات سے قطع نظر کرتے ہوئے "غیرت قومی" کا اقرار فوراً ہی فرما دیا، ممکن ہے کہ بعض لوگ "دردِ اسلام" پر معترض ہوں، اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پردہ اسلام کی ایجاد ہے اور اسلام ہی کے لئے مخصوص ہے، "وہ" کا لفظ بھی نہایت بامحل ہے، اس ایک لفظ نے بہت سے الفاظ کی تشریح کر دی ہے، ورنہ اتنا ضروری ہوتا کہ وہ پردہ جس پر آپ کو ناز تھا کیا ہوا؟ چوتھا مصرعہ حاضر جوابی اور شوخی گفتار کی تصویر ہے، الفاظ اس قدر برمحل ہیں گویا عورتوں کی زبان کی لطافت و متانت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو، انداز تقریر سے کھسیانے پن اور جھنجلاہٹ کی شان بھی صاف ظاہر ہے۔

کس نماند است کہ در بیشہ شکارے بکند تیغ گیرد بکف و فتح دیارے بکند
ایں زماں ہمت مرداں ہمیں محدود است زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

پہلے مصرعہ میں اسلام کی داستان پارینہ کا ذکر ہے، اُس زمانے کی یاد دلائی جارہی ہے جب ہمارے لئے شیر کا شکار تلوار یا بھالے سے اُتنا ہی آسان تھا جتنا آجکل کے مرد حضرات کو سیف قلم سے کسی شیر ادب کو ٹوک دینا سہل ہوگیا ہے، دوسرے مصرعہ میں ملت بیضاء کی معراج کی وہ زبردست تصویر کھینچی گئی ہے جب افریقہ و عجم، اسپین اور حلب کی دیواریں ہمارے معرکوں سے کانپ کانپ جاتی تھیں، ہم اُس وقت مرد تھے، غلام نہ تھے حاکم تھے، بزدل نہ تھے، شرم دلانے کے لئے اکبر نے کس قدر موثر پیرایہ اختیار کیا ہے، کیا اسلاف فاتح کا ذکر اخلاف مفتوح کے لئے قابل عبرت نہیں ہے؟ تیسرا مصرع اس ٹھاٹھ سے لگایا ہے کہ چول سے چول بیٹھ گئی ہے، انقلاب کا پورا مرقع "ایں زماں" میں ملفوف کردیا ہے، چوتھے مصرع میں "مردے" کو "زنے" اور "غیب" کو "پردہ" بدل کر وہ لطف پیدا کردیا ہے کہ وتد و سبب کی میزان میں بھی کوئی کمی و زیادتی نہیں ہوئی، ظرافت کا دریا بھی موجزن ہوگیا اور واقعہ کی شان بھی ظاہر ہوگئی۔

دلکش نہیں وہ حسیں جسے شرم نہیں رونق نہیں اُس کی جس کا دل گرم نہیں
سختی میں بھی ہو گداز طینت ہو جو صاف پگھلی ہے برف گو کہ وہ نرم نہیں

ہماری زندگی کے عام واقعات پہلے مصرعہ کی دلیل کامل ہیں، شرم یا "احساس شرم" ہی وہ چیز ہے جو صحت و شباب کی گہری سرخی بن کر حسن کی رگوں میں دوڑ جاتی ہے، ورنہ حسن کی دیوی بھی "یونانی مجسمہ مرمریں"، یا "بہزاد کی تصویر ساکت" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، دوسرے مصرعہ میں شمع کی تشبیہہ پنہاں کس قدر نفیس ہے، کیا اس سے کسی اہل دل کو انکار ہوسکتا ہے کہ شمع سرد کبھی رونق محفل نہیں بن سکتی، اسی مصرعہ میں حسن کے ساتھ بھی جو تشبیہ ہے وہ اس قابل ہے کہ موتیوں میں تولی جاے، اگر آپ حقیقتاً "گرم دل" کا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو ذرا اس کی ضد کی تصویر کھینچ لیجئے ایک چاند کا ٹکڑا انگاروں کے سامنے ہے لیکن اُس کا دل اس قدر سرد ہو چکا ہے کہ جذبات و محسوسات کا گہرا اثر بھی سکوت حسن میں کوئی بیداری کوئی زندگی پیدا نہیں کرسکتا؟ فرمائیے، اب آپ کو گرم دل والے حسین کی قدر معلوم ہوئی؟ تیسرے اور

چوتھے مصرعہ میں ندرت بیان اور جدت خیال کے بہترین جواہر موجود ہیں، لیکن ان سب کا تعلق پردہ سے کیا ہے، اس کا جواب "شرم" اور "سختی" سے مانگئے۔

وہ شوکت وشان زندگانی نہ رہی　　غیرت کی حرم میں پاسبانی نہ رہی
پردہ اٹھا تو کھل گیا اے اکبر　　اسلام میں اب وہ لن ترانی نہ رہی

پہلے دو مصرعوں میں اُن جذبات مسلم کی صحیح ترجمانی ہے جن کے ماتحت پردہ 'امر اسلامی' کی منزل عالی سے نیچا ہو کر رسم وضرورت کی زنجیروں میں گرفتار ہو گیا ہے، حقیقتاً بیشتر پردہ پرست حضرات پردہ کی اسلامی عظمت و قدر اور اپنی فطری غیرت سے بے خبر ہیں، تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں حضرت کلیم اللہ جناب موسیٰ کے واقعۂ طور کی طرف مودب و موثر و عبرت آمیز اشارہ ہے، کاش اُردو کے کم نظر شاعر ادب و تمیز کا خیال رکھیں اور جناب کلیم کا ذکر و تخاطب بے تکلفی سے نہ فرمایا کریں۔

غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبر　　بڑی مایوسیوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے
یہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اُس کا عاشق صادق　　مگر کہتی ہے خلقت شمع سے پروانہ جلتا ہے

غلط فہمی کے دو وجوہ ہیں، ایک تو یہ ہماری زبان میں ہر جذبہ یا ہر محسوس کے لئے جداگانہ الفاظ نہیں ہیں، دوسرے خود الفاظ کا صرف بھی بعض وقت کئی کئی معانی کا حامل ہوتا ہے، شمع اور پروانہ کی نسبت سے لفظ روشن کا انتخاب کس قدر مناسب و موزوں ہے، پردہ کی بعض برکات جو سبب و اثر کے ماتحت ہیں میں اُن کی تشریح حوالۂ ناظرین کرتا ہوں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ واقع ہو۔

ذیل کے چند اشعار مرحوم کی ایک نظم سے منتخب ہیں، اکبر نے 'سودا' کی طرح واعظ کو مخاطب کر کے پردہ کی چند خوبیوں کا اظہار نہایت دلکش پیرایہ میں فرمایا ہے، زمین بھی وہی ہے، ردیف بھی وہی ہے صرف قافیوں کا فرق ہے، سودا کا یہ مصرعہ "دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا" شاعری کے نقطۂ نظر سے نہایت حسین ہے، اکبر کا طرز بیان مخصوص لطف و خوبی سے لبریز ہے، سودا کا نفس مفہوم صرف "مجبوری مے نوشی" اور "تاثرات حسن" تک محدود ہے، یہاں اخلاقی تعلیم اور بے پردگی کی بے تکلفی کا مرقع کھینچا گیا ہے۔

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی ‏ ‏ کس ن بتوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نوخیز دلفریب گل اندام نازنیں ‏ ‏ عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُک گئے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسیں ‏ ‏ ول مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا

امیر کے گھر کی خصوصیت اس لئے ہے کہ سرور و لطف کی تمام باتیں موجود ہوں "ذکر الفت" مغربی تہذیب میں داخل ہے، چوتھے مصرعہ کی نزاکت ملاحظہ فرمائیے۔ نقاب تو کجا دامن نگاہ کا بار بھی ناگوار "رُک گئے" کو ذرا ڈوب کر دیکھئے، چھٹے مصرعہ میں انگریز نژادوں کی مخصوص اُردو موجود ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب کچھ کہہ گئے مگر متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا اس کے خلاف سودا کا یہ مصرعہ "دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا"
کس قدر گرا ہوا ہے۔

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بی بیاں کب تک ‏ ‏ بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

اس شعر میں ہماری نسلوں کی تدریجی تنزل کا بہترین فوٹو موجود ہے۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی ‏ ‏ تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

ذرا تواریخ اسلام کی ورق گردانی فرمائیے، اور اُس کے بعد موجودہ مسلمین خصوصًا ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت دیکھئے "تیغ" اور "تیلی" میں جو فرق ہے وہی ہمارے اسلاف میں اور ہم میں ہے۔

طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں ‏ ‏ یہ غیرتیں یہ حرارت یہ گرمیاں کب تک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں ‏ ‏ سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک

واقعہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ خواتین میں ایسی فردیں بھی موجود ہیں جو حالت سفر میں پردہ کی اہمیت کو ضروری نہیں سمجھتیں، اس لئے کہ مسافروں کی نگاہیں کچھ سہی مانوس و شناسا نہیں ہوتیں خصوصًا ایسی حالت میں جب سکنڈ اور فرسٹ میں ٹھاٹھ کے ساتھ سفر ہوتا ہو، اس واقعہ کے علاوہ اُس خاص فرق کا اظہار بھی نہایت عمدگی سے ہے جو غربا اور امرائی روشنی اور پُرانی روشنی والوں میں ہے۔

جو مُنہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس ‏ ‏ چھپیں کی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

"ابلیس"، سے جن لوگوں کا تخاطب ہے وہ بھی پردہ کی بات ہے، خود ہی سمجھئے اور لطف اُٹھائیے "حضرت حوّا"، کی تخصیص بھی نہایت نازک ہے، بیٹیوں کی مناسبت سے بھی اور اس لئے بھی کہ شیطان نے پہلے حضرت حوّا ہی کو بہکایا تھا' اور اُنھیں نے جناب آدم کو کمال اصرار پر اسرار سے گیہوں کھلا دیا تھا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت کا ذرّہ ذرّہ اُن محترم ہستیوں سے پرہیز کرنے لگا اور ہزار ہا خرابیاں واقع ہوئیں یہ شعر پوری ایک کتاب ہے، اس میں ابلیس فطرت حضرات کی چالاکیاں، صنف لطیف کی کمزوریاں اور ضدی طبیعتوں کی اصلیت اور نتائج پردہ دری کا کچا چٹھا سب کچھ موجود ہے۔

جناب حضرت اکبر ہیں حامی پردہ مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

"جناب حضرت"، کی ترکیب محض جمعیت مترادفات نہیں ہے ورنہ ایک کی موجودگی میں دوسرے کا عدم اختصار حسین ہوتا' بلکہ "حضرت اکبر" میں خطاب شوخ ہے جو پردہ در حضرات کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا' دوسرے مصرعہ میں فنا کا ذکر ہے اور نہایت لطیف، خدا کے واسطے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی رُباعیاں بھی ختم ہوگئیں، یہ بات نہیں ہے، اس لئے کہ فنائے مادہ کے ساتھ فنائے روح لازم نہیں مطلب صرف اتنا ہے کہ تلون طبع جمہور کے نزدیک حضرت اکبر اور اُن کی رُباعیون کا یہ اثر جو اَب ہے کم ہوتا جائے گا۔

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سُن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اسمیں شریک یہ اگر سچ ہے تو بیشک پیرنا بالغ ہیں وہ

اس وقت معمورۂ عالم میں جو قومیں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں اُن کی تمام ترقیاں صرف "مادیات"، ہی تک منحصر ہیں، اخلاقی ترقی دیکھنا ہو تو ذیل کی کتابیں دیکھئے۔

"اسرار دربار لندن"	"اسرار لندن"	"اسرار دربار فرانس"	"اسرار فرانس" وغیرہ وغیرہ
۶ جلد	۸ جلد	۱۲ جلد	۱۴ جلد

تمھیں دھوکہ میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے وہاں سایہ حکومت کا ہے یا غربت کا پردہ ہے

فاتح اور مفتوح کا فرق ہماری روز انہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے' ہم بے بس ہیں'

وہ صاحبِ اختیار ہیں "سایہ" کا لفظ کس قدر جامع ہے۔

پردہ کا کہا ہے خود واڑ لنگا پیدا — خود ہم نے کیا اِزار و انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے — فطرت نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

یہ رُباعی ان لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو "پردہ دری" کی دلیل میں "فطری آزادی" کو پیش فرماتے ہیں، حضرات! ہر چیز میں حدیں ہوتی ہیں، واقعی جب فطری آزادی ہی مدنظر ہے تو اِزار و انگا کی کیا ضرورت، سب کے سب ننگے ہو جائیے اور رہئے، اہاہاہا، کیا اچھی دنیا ہو جائے گی۔

پردہ میں ضرور ہے طوالت بے حد — انصاف پسند کو نہیں چاہئے ہٹ
تشبیہ بری نہیں اگر میں یہ کہوں — بیگم تو ہے پیچواں لیڈی سگریٹ

واقعی کس قدر زبردست تشبیہ ہے، پیچوان بیگم کے حصول وصرف میں جو طوالتیں اور لیڈی سگریٹ کے استعمال میں جو سہولتیں ہیں وہ صاف ظاہر ہیں، نَے درست کیجئے، پانی تازہ کیجئے حقہ کا پانی بدلئے، چلم پر تمباکو جما کر آگ رکھئے، سانس اور پانی میں قلقل کی موسیقی پیدا کیجئے، دم ہونے کا انتظار فرمائیے، جب پیجیئے اور لیڈی سگریٹ کو ڈبہ سے ایک منٹ میں نکال کر جھٹ سے سلگائیے اور شغل شروع فرما دیجئے، لیکن شعر کا لطیف ترین پہلو ملاحظہ فرمائیے، جو لوگ تمباکو کش ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ پانی سے دھل کر آنے والے دھوئیں میں کس قدر سبکی و لطافت لذت و فرحت شامل ہوتی ہے، اور کاغذدار تمباکو کا دھواں کتنا تیز و مضر ہوتا ہے، اور آگے چلئے، طبی اصول سے دونوں کے اثرات میں نہایت درجہ فرق ہے۔

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے — ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بہے کا پانی ہے

بدقسمت ہندوستان، غلام ہندوستان، کے نوجوان طبقہ کی حالت قابل رحم ہے، اکثر ایسے ہیں کہ جوانی سے پہلے ہی جوانی کی حدیں ختم کر چکتے ہیں اور روزانہ صدہا خودکشیاں عمل میں آتی رہتی ہیں، واقعی ان لوگوں کے لئے پردہ کا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں وہ ہے لیڈی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ذرا نگاہ عبرت سے جہالت کے پردے اُٹھا کر بزم رقص کی سیر کیجئے' اور 'بی بی' کی تفریق مزاجی کو دور تک سوچئے۔

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن — اُس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

ذرا شان امتیازی ملاحظہ فرمائیے، جتنا ہی سوچیئے گا اُتنا ہی پردے اُٹھتے جائیں گے۔

نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ — شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

قوم کے تنزّل کا اس سے بہتر نقشہ کھینچا نہیں جا سکتا' دوسرے مصرعہ کا اثر دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے۔

سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات — میاں بدلے تو بی بی کیوں نہ بدلیں

ظرافت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی واقعہ یہ ہے کہ ہم اخلاقی کمزوریوں کے طفیل اس قدر بدلتے رہتے ہیں کہ اگر بیویاں بھی بدل جائیں تو انتقام جائز سے زیادہ کوئی بات نہ ہوگی۔

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں — حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
لطف آزادی کی دل میں بڑھ گئی ہے چاشنی — اب تو شیشہ میں اُترنے کی نہیں یہ جیلیاں
اپنے ہاتھوں اپنے سانچے کا کریں گی بند وبست — یہ نہیں وہ گڑ کہ تم اُن کی بناؤ بھیلیاں

قافیوں کی خوبی ایسی ہے کہ بار بار دہرانے کو جی چاہتا ہے' زبان ایسی پیاری ہے کہ چاشنی دار جیلی کا لطف قوت ذائقہ کو بیتاب کئے دیتا ہے، محاوروں کی بندش تمام عیوب سے پاک ہے۔

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی — اب تک میں بچا تھا آج پی لی
پھاڑے مغرب نقاب نسواں — مشرق نے تو آنکھ اپنی سی لی

"آج پی لی" کی مجبوریاں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ اگر متواتر و پیہم مواقع ملتے رہیں تو صادق و خالص دل بھی شباب بے حجاب کی کیفیت سے فطری طور پر کبھی نہ کبھی لذت اندوز ہو ہی جائیں گے آخر کے دونوں مصرعوں میں مغرب اور مشرق دو لفظوں کو زندہ مرو سمجھ کر دیکھئے، کیسا عبرت خیز کیسا عبرت خیز نظارہ ہے، حضرت مغرب پوری بے دردیوں کے ساتھ پردہ دری فرما رہے ہیں اور

جناب مشرق ایسے بے حس ہیں گویا دیکھتے ہی نہیں۔

حجاب تمکنت کو دور کرتا ہے زبیدہ سے   سوا اس کے جو باتیں ہیں فقط اک پردہ پوشی ہے

بعض اعتدال پسند حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں پردہ قائم رکھا جائے لیکن اس کی سخت گرہیں اُس حد تک ڈھیلی کردی جائیں جتنی فارس و عرب مین ہیں، میں ان حضرات سے ادب کے ساتھ ملتمس ہوں کہ اکبرؔ کے اس شعر کو نگاہ میں رکھیں، واقعہ یہ ہے کہ وہاں ہر گھرانے کی عورت بازار جاکر تمام ضروریات زندگی کی خرید و فروخت کرتی ہے، حمام و مجالس میں بھی آزادانہ جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں یہ آزادی ابھی دو سو برس تک مضر ثابت ہوگی، اس واسطے کہ وہاں کے معیار اخلاق و مراسم و طرز معاشرت میں نہایت درجہ صلاحیت ہے، وہاں اگر اتفاقاً کسی شخص کی نگاہ کسی حسین چہرہ پر ایک بار پڑ جاتی ہے تو وہ شخص دوبارہ اُس برقعہ پوش عورت کی طرف نہیں دیکھتا اور اُس کو حسب السّن اپنی ماں یا بہن یا لڑکی کے برابر سمجھتا ہے لیکن یہاں کی گلیوں میں اگر کوئی عورت برقعہ پوش نظر آئے تو آوارہ مزاج بدطینت شوخ وضع حضرات کی پوری جماعت ہر ممکن دغابازی کے لئے مستعد ہو جاتی ہے بعض عامیانہ پھبتیاں کستے ہیں، بعض راستہ بہکاتے ہیں، بعض تعاقب کرتے ہیں اور بعض ظلم اور تعدی سے کام لیتے ہیں۔

پردہ کے متعلق خود اکبر کے خیالات

ذیل کے اقتباسات خود اس قدر مسلسل اور واضح ہیں کہ مزید توضیح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی

اقتباسات خطوط بنام حسن نظامی صاحب ۔ خطوط اکبر صفحہ ۱۰۹ - ۸ ر اگست ۱۹۱۱ء

"بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں پوچھتی ہیں بی اکرم صاحبہ) کہ یہ بی بیاں کہاں نظر آئیں ۔ مولوی بشیر احمد صاحب ایڈیٹر البشیر سے پوچھیں وہی بمبئی گئے تھے ۔ کسی جلسہ میں عورتوں کے اعضا ظاہر ہوئے شوخیاں ظاہر ہوئیں اسی مضمون کو دیکھ کر میں نے یہ قطعہ کہا تھا"

صفحہ ۱۰۹ ۹ ر اگست ۱۹۱۱ء

"کلیات کے دوسرے حصہ میں ایک ظریفانہ نظم ہے اس میں تو بے پردگی کا دعوےٰ بیان کیا ہے آپ نے نہ دیکھی ہو تو دیکھئے ؎

لڑکیاں بول اُٹھیں خود بہ طریق تائید کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اس نظم پر نسواں کو نظر کرنا چاہیئے ۔

صفحات ۱۰۹ و ۱۱۰

معلوم نہیں پرانی نظموں کو تہذیب نسواں صاحب کیوں لے بیٹھے سب کو معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں مرحوم نہ صرف پردے کے حامی تھے بلکہ لڑکیوں کے سرکاری اسکول میں جانے اور جدید کورس پڑھنے کے مخالف تھے ۔

میرے نظموں کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے ۔ لڑکیاں اسکول میں جانے لگیں پردہ بھی شدہ شدہ جاتا رہے گا ۔ میں نے اس بات کو بھی کہدیا ہے حصہ دوئم میں دیکھئے ۔ ۳۰ ۔ ۴۰ کا اندازہ کیا ہے (اگر یہی دور رہے) ۔

نصرت الاخبار دہلی نے تو ابھی ایک رسالہ حمایت پردہ میں شائع کیا ہے ۔ قریبًا تمام عالم اس وقت تک پردے کا حامی ہے ۔ میری کیا تخصیص ہے اگر میں اس بات میں سخت ہوں تو

اس سے کیا ہوتا ہے۔

میں نے تو کچھ جواب دینا مناسب نہیں سمجھا...... تہذیب نسواں کے اعتراض سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ چاہتے کیا ہیں پردے کی ضرورت سے تو وہ بھی انکار نہیں کرتے۔ ...... اگر بعض خواتین کو کچھ زیادہ ضرورت آزادی کی محسوس ہو تو عام طریقہ کو اس سے کیا تعلق۔

صفحہ ۱۱۱ ۱۲ر اگست ۱۹۱۱ء

"...... میری نظمیں تو مدت کی ہیں اس وقت کون سی نئی بات ہوئی کہ یہ اعتراض شروع کیا گیا..... مجھ کو تو شبہ ہوتا ہے کہ بہت دور سے یہ جرأت دلائی گئی ہے، یورپ کی کمیٹیاں تعلیم و تہذیب نسواں پر بڑا زور دے رہی ہیں چونکہ پردہ توڑنا مقصود ہے لہذا یہ بنیاد قائم کی گئی ہے ــــ بعض دوست تو شاید اس ڈر سے چپ ہو جائیں کہ بیگمات سے ڈاڑھی کون نچواے۔ اگر چہ خواہر مذکر بھی اس پردے میں ہوں میں نے تو ان کو لکھ دیا ہے کہ یہ نظم انقلاب روکنے کو نہیں ہے یادگار انقلاب ہے...... بات یہ ہے کہ میری نظم کی شہرت مغربی مجالس تک پہنچ چکی ہے میں نشانہ بنایا گیا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ ساری قوم سنے اور پردہ شکنی پر تیار ہو جائے۔ بتدریج (اگر بھی لیل و نہار ہیں) سب کچھ ہو گا۔ مردوں کا احساس بھی بدل چلا ہے بدل جائے گا۔ اس وقت کچھ ہرج بھی نہیں ہے۔

صفحات ۱۱۲ و ۱۱۳

...... اگر پردہ قائم ہے اس کی پابندی ہے اور میں نے خلاف واقع بے پردگی کی شکایت کی ہے تو یہی کہنا چاہئے کہ الزام غلط اور خلاف واقع ہے یہ کیا شکایت کہ پردے کے باب میں میں بہت سخت ہوں اور اس سے ترقی میں خلل پڑتا ہے۔ اگر یہ شکایت ہے تو یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ کس چیز کی ترقی میں خلل پڑتا ہے تعلیم میں یا پبلک سے ملنے میں اور کہاں تک آزادی کی اجازت مانگی جاتی ہے۔

..... اس بحث سے تمام شرفا کو تعلق ہے میں نے غالباً (تمام) پہلو اپنے اشعار میں دکھا دیئے ہیں۔ لیکن اشعار یکجا نہیں ہیں۔ میرے دیوان سے کبھی تمام اشعار اسی بحث کے متعلق یکجا کر لیجئے۔

لیکن میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اظہار خیالات میں میں نے مدبرانہ رنگ نہیں اختیار کیا بلکہ شاعرانہ ؎

نظم پردہ کا ہے غصہ اکبر رنجور پر — حاشیہ اچھا چڑھایا سورۂ والنور پر

ایک اور شعر ہے

نصیحت میں نے پردہ کی لکھی ہے خوش مزاجی سے — وہ کیوں ولوارہے ہیں مجھ کو گالی اپنی باجی سے

...... زمانہ برسر انقلاب ہے ...... ہم کیا ہمارے دعوے کیا قانون قدرت ہم کو مٹانے ہی پر مائل ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں ...... ہم کو اپنے مذاق مذہبی اور رسمی کی حمایت کی اگرچہ آزادی ملی ہے لیکن ترقی اور اطمینانی حالت سروست انھیں کی ہے اور وہی روشن ضمیر سمجھے جاتے ہیں جو ایسے مذاق اور اُن رسوم و عادات کے دشمن اور مخالف ہیں ـــــ ہم کو میاں بی بی سے بحث ہے نہ کہ لیڈی جنٹلمین سے مسلمات سے مطلب ہے نہ کہ نئی تپلیوں سے۔

صفحہ ۱۱۴ — ۲۵ر اگست ۱۸ء

"میں تو آصف جہاں صاحبہ سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں کہ جب تک آپ کا شباب ہے میں اپنی نظموں کو واپس لیتا ہوں"۔

صفحہ ۱۱۵ — ۲۹ر اگست ۱۹۱۸ء

اب لوگ ان اشعار پر بھی ہنسیں گے ؎

مدح اکبر میں ہر اک نے قوم میں — کچھ نہ یا دہ خواہ تھوڑا کہدیا

ہاں مگر آصف جہاں نے بے گناہ — اُن کو در پردہ نکوڑا کہدیا

صفحات ۱۱۵ لغایت ۱۱۸ — ۳۱ر اگست ۱۹۱۸ء

"راشد الخیری صاحب کو میرا سلام پہنچائیے اور کہئے کہ مدعی سست گواہ چست کی بات نہیں ہے۔

ساری قوم مدعی ہے گواہ اللہ ہے قرآن ہے سورۂ نور ہے سورۂ احزاب ہے بے شمار مدعیوں میں سے ایک مدعی کو جو شاعر ہے اگر کسی بیگم نے اپنی شوخی سے ڈھیلا کر دیا تو مقدمہ خراب نہیں ہو سکتا ـــ میرا طرز بیان مدعیانہ یا واعظانہ نہیں رہا اگرچہ مقصود یہی ہے لیکن اسلوب کلام شاعرانہ ہے ـــــ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے تہذیب نسواں کو کیا لکھا لیکن جو کچھ کیا میں نے

اپنی نظمیں واپس نہیں لیں۔ وہ ملک میں اور کانوں میں گونج رہی ہیں لیکن یاد رکھئے کہ نظموں کی داد ایک طرف اور نئی تعلیم نسواں جو در پردہ ہو رہی ہے (اگر یہی لیل و نہار ہیں) اس کا اثر ایک طرف .... تہذیب نسواں صاحب نے میرا ہی نام کیوں لیا اور کہا کیوں بجز اس کے کہ قبول عام اور مرحبا ہے جن و ملک نے آتش حسد کسی سینے میں مشتعل کی۔ کسی عورت کے نام سے خواہ مخواہ نیش زنی کی گئی۔ میری نظم کی داد تو مجھ کو انگریزوں نے دی۔ آزادی مفرط سے تو وہ پریشاں ہیں — بہت خوشی سے بے تکلف حجّت کیجئے — بحث بہت لطیف اور جنگ بہت لذیذ ہو گئی۔ مجھ کو بھی بذلہ سنجی کا موقعہ ملے گا — لیکن میں اپنے پوزیشن کے خلاف بھی سمجھتا ہوں کہ ان غیرت فروش پردہ نشینوں کی آویزش میں مبتلا ہوں۔ آویزش بے سود۔ کیونکہ ایک دن میں نہ کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے نہ انقلاب کو روک سکتا ہے۔

ہندوستان بڑا ملک ہے حالتیں مختلف ہیں سوشل طبقات مختلف ہیں ضرورتیں مختلف ہیں پولیٹیکل تعلقات مختلف ہیں غریب کی بی بی ٹیکس دے کر سبکدوش ہو جاتی ہے خواص آنریبل کی بی بی کو بال اور پارٹی میں لیڈیوں سے ملنے اور اظہار آزادی کی تحریک ہوتی ہے

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق — بے بلائے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
ترک پردہ یہ نہیں اس کے لئے میں نے کیا — صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

ایک بڑا دھوکا جو مغرب کی طرف سے دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عورتیں قید کی گئی ہیں۔ یہ غلط فہمی ہے۔ پردہ قید نہیں ہے بلکہ ان کو حق تمکنت دیا گیا ہے۔ اب یہ حق ان سے چھینا جاتا ہے ...... ؎

شوخی مغربی کے خریدار ہیں بہت — گاہک مگر خدا ہے حیا کی دکاں کا

...... جب اعتراض کیا گیا تھا کہ قرآن نے چار کی اجازت کیوں دی میں نے ظرافتاً کہدیا کہ ؎

پردے کی وجہ سے یہ اجازت ہے چار کی — پردہ نہو تو ایک کی بھی احتیاج کیا

— میں نے ہرگز سپر نہیں ڈالی مقصود یہ ہے کہ انقلاب نہیں رُک سکتا ..... ؎

نئے طریقوں سے مقصد شرع کار فرما نہ ہو سکے گا — ادھر جو پردہ نہو سکے گا ادھر بھی تقوے نہو سکے گا

صفحات ۱۱۹ و ۱۲۰ و ۱۲۱ ۳ ستمبر ۱۹۱۸ء

.....عورتوں کی طبیعتیں رسموں کی ماتحت ہیں۔ مغرب کو بڑی فکر تعلیم نسواں کی ہے جس کا اثر خواہ مخواہ شوخی و بے حجابی ہے —— اللہ مالک ہے جو مناسب ہوگا کرے گا اور کر رہا ہے۔

.....پردہ یہاں تمکنت کا نشان ہے۔ عورتوں کا حق ہے مفید نہیں ہے —— جو دولتمند ہو گئے ان کی عورتیں پردہ نشین ہو گئیں۔ اس بات کو میں نے کسی نظم میں ظاہر کر دیا ہے۔

صفحہ ۱۲۱ ۴ ستمبر ۱۹۱۸ء

—— مسز عشرت لکھنے والی تھیں۔ پر یانواں میں ناگہانی حادثہ پیش آیا۔ الزام لگایا گیا ہے کہ بے پردہ نظر آنا خلاف واقع کہا گیا ہے —— مجھ سے تو چشم دید گواہوں نے کہا —— دوسرے یہ کہ جو خطرات ساختہ و پرداختہ والی نظم میں ظاہر کئے گئے وہ بے اصل اور شرمناک ہیں۔ اس کی تردید چاہئے —— ہاں تیسرا الزام یہ تھا کہ میں سختی کرتا ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ نہیں اس سبب سے نہیں کہ بے پردگی کے نتائج بد ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ یورپ خود آزاد ہونے سے نالاں ہے لہذا خواتین کو خود سمجھ آ گئی سختی کی کیا ضرورت ہے اگر ضرورت ہو تو لکھا جائے ورنہ حوالہ فطرت۔

صفحہ ۱۲۲ و ۱۲۳ ۵ ستمبر ۱۹۱۸ء

میری نظموں نے پردے کے جذبات نہیں قائم کئے بلکہ قوم میں پردے کے جذبات سے میری نظمیں پیدا ہوئیں۔ قرآن پاک کا موید تجربہ ان کا سفارشی ——

سنا ہے کہ تہذیب نسواں نے ایسی تمہید لکھی ہے گویا اس نے فتح پائی۔ کوئی پوچھے کہ میں نے بے پردگی کی اجازت کب دی۔ حق شعر گوئی سے کب دست بردار ہوا تعلیم و آزادی مغربی کی کب اجازت دی۔

—— بیگم صاحب بھوپال بھی پردے کی حمایت میں کچھ لکھ رہی ہیں لیکن سید سلیمان صاحب (ندوی) کہتے ہیں کہ بے پردگی غالب آئے گی۔

مجھ کو اپنی ایک نظم یاد آئی جو حال ہی کی ہے یعنی جب دسمبر گزشتہ میں سروجنی نائیڈو صاحبہ مجھ سے ملیں اس کے بعد کی ہے

ادھر جوانوں کو ہے یہ سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں ‏ ادھر خواتین خلوت آرا ہنوز مست اپنی نوج میں ہیں
مگر یہ قید حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک ‏ کہ گبرو ترسا کی لیڈیاں بھی شریک واعظ کی فوج میں ہیں

صفحہ ۱۲۴ ۷ ستمبر ۱۹۱۸ء

ہاں بیگم صاحب نے آخر میں لڑکوں کو زندہ دفن کرنے کا جو ذکر کیا ہے اس پر کوئی کچھ لکھے کہ کیا تم نے (بیگم صاحب کی طرف اشارہ ہے) پردہ کو زندہ دفن ہونا سمجھا ہے یہ تو خدا نے تمہاری عزت بڑھانے اور تمہاری فضیلت کے لئے تم کو پردے کا حق دیا ہے کیا خوشی ہوگی کہ آیا کی طرح میموں کے پیچھے پھرو - اگر انقلاب مجبور کرے تو وہ صدمے کی بات ہوگی - نہ کہ ترقی تہذیب کی اور پھر عورتوں کے مدارج ہیں -

صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵ ۹ ستمبر ۱۹۱۸ء

میرا یہ کہنا کہ انقلاب کو روک نہیں سکتا یہ اشعار صرف یادگار انقلاب ہیں یہ معنی نہیں رکھتا کہ آصف جہاں صاحبہ کی دھمکی میں آگیا یا ڈر کے مارے اپنی رائے بدل دی میرے کلیات حصہ دوئم کو ذرا اٹھائیے صفحہ ۱۳ میں چوتھا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب ‏ یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

یہ پرانا شعر ہے دیکھ لیا جائے کہ میری رائے یہی تھی اور ہے اور ہر سمجھدار آدمی اس سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوگا - صفحہ ۶۷ میں چودھواں شعر یہ ہے ؎

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے ‏ لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوج سے

یہ محض شاعری اور ظرافت ہے ...... یہ شہادت تو مقبول عام ہے

صفحہ ۱۷۵ ۹ ستمبر ۱۹۱۸ء

ہاں ایک بات تہذیب نسواں کی نسبت لکھنا بھول گیا - یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ جو کرتے ہیں مرد کرتے ہیں عورتیں ان کے تابع ہیں جواب دینا چاہئے کہ تم نے سچ کہا لیکن یہ اشعار بھی مردوں ہی کی تنبیہ کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں -

---

آخر میں مصلح جلد ۱ نمبر ۵ مئی ۱۹۲۸ء صفحہ ۴ کا ایک جملہ لکھے بغیر نہیں رہا جاتا کسی صاحب نے

نہایت قابلیت سے "ہندوستانی پردہ کا کیا انجام ہوگا" کی سرخی سے ایک مضمون حوالہ قلم فرمایا تھا۔ سلسلہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سید اکبر حسین صاحب مرحوم کا یہ مقولہ مجھے یاد ہے کہ غیر قوموں کی اندھی تقلید کرنا غبی ہونے کی محتتم دلیل ہے۔

پردہ

کوئی موقع نکل آئے کہ بس آنکھیں مل جائیں
راہیں پھر آپ ہی کرلیں گی جوانی پیدا

راہ پر ان کو لگا لائے ہیں ہم باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

دل ہو وفا پسند نظر ہو حیا پسند
جس حسن میں یہ وصف ہو وہ ہے خدا پسند

کہا جو اس نے کہ اب میں پھروں گا بے پردہ
منہ اس کا دیکھ کے بس رہ گئے نقاب فروش

معلوم نہیں اکبر صاحب نے مُنہ کا لفظ کیوں پسند کیا حالانکہ اس سے زیادہ رُخ سے روانی آتی تھی۔

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دلکش و آزاد و خوش رو ساختہ پرداختہ

یہ تو کیا معلوم کیا موقع عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ

مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے
ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ

اوج قومی سے شرافت کا ہما گر جائے گا
ماکیاں سے پست تر دکھلائی دے گی فاختہ

ڈال دے گی سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو باختہ

کھول کر در کو کہا اس بت اسکولی نے
جب نقاب اُٹھ گئی آگے سے تو چلمن بھی سہی

(گو زاید ہے) یہ ترقی شاعر کی نگاہ میں فطری ہے۔

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے
کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے

یہی ہے عقدہ کشائی قوم تو اک دن
ازار بند کو کہہ دیں گے حبس بیجا ہے

بحر آزادی میں یہ کیسا تموج ہو گیا
"قاصرات الطرف"[۱] کو شوقِ تبرج[۲] ہو گیا

[۱] نیچی نگاہ والیاں [۲] اپنا سنگار دکھانا۔ قرآن کے الفاظ ہیں اور کس سلاست سے نظم ہوئے ہیں۔

مرد جنٹلمین ہو کر پا رہے ہیں جب عروج
بی بیاں پھر گھر میں رنج کس میرسی کیوں سہیں

مطمئن رہیئے نہ رہ جائے گا عورت کا حجاب
چادر قومی کی آخر کی کھلتی جاتی ہیں تہیں

حفظ عظمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں
مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی

پردہ در کہتا ہے اب اس کی ضرورت ہی نہیں
میرزایانہ ادا تھی سلطنت کی بات بھی

خوں میں غیرت رہی باقی تو سمجھے گا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

شمشیر زن کو اب نئے سانچے میں ڈھالئے
شمشیر کو چھپائیے زن کو نکالئے

کالج بنا عمارت فخر النسا بنی
شکر خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی

بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا
جن کو یہ ڈر ہے ان کی تو جانوں پہ آ بنی

لیکن نگاہ نبض شناساں وقت میں
امراض قوم کے لئے عمدہ دوا بنی

جب تک ہم میں ہے قومی خصلت باقی
بیشک پردے کی ہے ضرورت باقی

چالیس برس کی بات ہے یہ شاید
بعد اس کے رہے گی پھر نہ حجت باقی

چالیس برس کے بعد عام طور سے عورتیں خواہشات نفسانی سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

نہ یہ قید شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردہ ہے
رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے

تمھیں دھوکے میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے
وہاں سایہ حکومت کا ہے یاں عزت کا پردہ ہے

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردمی
کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں کا

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلماں تو ہیں

پردہ در کی رائے سنکر بی بیاں کہنے لگیں
اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علیگڈھ کے حوالے

دوسرا مصرعہ عورتوں کی زبان میں کس بے تکلفی سے نظم ہوا ہے۔

مذہب کا تو دم بھرتے ہیں بے پردہ بتوں کو کرتے ہیں
اسلام کا دعوے ایک طرف یہ کافرادائی ایک طرف

اسٹیج پہ دنیا کے کیا رنگ دکھاؤ گے
کیا لطف اٹھا پردہ درجے سے اگر گر کے

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ باہر نکل گئی

کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

تمکین اک نشان ہے عصمت کی آن کا
پردہ بس اک ظہور ہے عورت کی شان کا

پردہ تو ان کا حق ہے نہیں ان پہ جبر کچھ
آیا ہے ان پہ وقت یہ سخت امتحان کا

شوخئ مغربی کے خریدار ہیں بہت
گاہک مگر خدا ہے حیا کی دکان کا

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ادھر جوانوں کو ہے یہ سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں — ادھر خواتین خلوت ارا ہنوز مست اپنی نوحؔ ہیں ہیں

لہ خدا نہ کرے ایسا ہو۔

مگر یہ قید حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک — کہ گبرو ترسا کی لیڈیاں بھی تحریک واعظا کی فوج میں ہیں
کس طرح پردے میں رہے اے شیخ عورت اک طرف — سارے خیالات اک طرف ملکی ضرورت اک طرف
مشرق کے واعظ اک طرف مغرب کی زینت اک طرف — عقلی دلیلیں اک طرف اوروں کی رغبت اک طرف

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بہت سے پردہ درمحض نفس پرستی کی وجہ سے اس کی تحریک کر رہے ہیں؟

بحث میں آہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب — زہرہ ممبر ہوئیں و وٹر تھے جناب خورشید
دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب — کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید
شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید
نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند — لڑکیاں بول اُٹھیں خود بطریق تائید
جب حکومت نہیں باقی تو یہ غمزے کیسے — کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید
تم نے شلوار کو پتلون سے بدلا اے شیخ — پھر مرے واسطے محرم رہے کیوں حبل ورید
خود تو گٹ پٹ کے لئے جاں دئے دیتے ہو — ہم سے کہتے ہو کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید
لال جب خود ہی کتیری کا ہوا ہے بندہ — تو یہ مُنیار ہے کیوں گوشۂ عزلت میں شہید
دولہ بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ — ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید
در نظارہ مقفل رہے ہم پر کب تک — کیوں نہ غنچوں کے لئے باد صبا کی ہو کلید
اکبر افسردہ شد از گرمئ این طرز سخن — شیخ بگر یخت و در صومعۂ خویش خزید
کھل گئے ورنہ رہا شاید مشرق میں حجاب — غل مچا ہرے کا بول اُٹھے یہ مغرب کے مرید
للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست — آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

کس قدر لاجواب اور مرصع نظم ہے اکبر کی شاہکار نظموں میں سے یہ بھی ایک ہے۔

فرض عورت پہ نہیں ہے چار دیواری کی قید — ہو اگر ضبط نظر کی اور خود داری کی قید
ہاں مگر خود داری وضبط نظر آساں نہیں — منہ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں

قول وعمل میں واقعی نہایت درجہ فرق ہے جب ہماری تہذیب وتعلیم تمدن و اخلاق کی سطح حقیقتاً بلند ہوجائے تو پردہ کی کوئی حاجت نہیں ہے

تم میں وہ ضبط نظر ان میں وہ خودداری کہاں — رعب قومی مثل فاتح ملک پر طاری کہاں

اب رہی تعلیم کون اس امر کا مفتون نہیں — بی بیوں پر مغربی سانچا مگر موزوں نہیں

اکبر تعلیم نسواں کے مخالف نہ تھے طرز تعلیم کے مخالف ضرور تھے۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اس کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

غریب اکبر نے بحث پردہ کی بہت کچھ مگر ہوا کیا — نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کرے گا مرا موا کیا

نئے طریقوں سے مقصد شرع کار فرما نہ ہو سکے گا — ادھر جو پردہ نہ ہو سکے گا ادھر بھی تقویٰ نہ ہو سکے گا

کیا گذری جو اک پردے کے عادی روکے پولس سے کہتے تھے — عزت بھی گئی دولت بھی گئی بی بی بھی گئی زیور بھی گیا

مس سے بیگم نے کہا کل تو کہاں اور ہم کہاں — بوٹ کی چرچر میں کیا رکھا ہے یہ چم چم کہاں

مس یہ بولی پڑھ کے نکلو تو ذرا اسکول سے — اور ہی چالیں نظر آئیں گی یہ عالم کہاں

کتنا ہی ہو وقت بے حجابی — تم پیروی حیا کئے جاؤ

کس قدر سادہ الفاظ میں کیسی ہمت افزا نصیحت ہے۔

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو — پردہ اٹھنا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تمہاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں برسائیں ان پہ شوخی — میری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشم خوباں سے شرم ٹپکے

خدا کی مار کا کرتا نہیں میں کچھ مذکور — طبیعت اور ہی پہلو پہ جا کے لڑتی ہے

نہ رہ سکے گی لطافت جو زن ہے بے پردہ — سبب یہ ہے کہ نگاہوں کی مار پڑتی ہے

کیا پردہ در حضرات چوتھے مصرعہ کی حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں ؟

بت پرستی میں بھی پردے کا ہوں حامی اکبر — بخش ہی دے گا خداوند خطا پوش مجھے

جنوں پردہ در ہے شائق رسوائی مجنوں — عجب کیا ہے کہ اب لیلیٰ کو بھی وحشت ہو محمل سے

ضرورت کم ہے راہ عشق میں خضر ہدایت کی — بہ قدر شوق سالک خود کشش ہوتی ہے محمل سے

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

پردہ نے میاں ہم کو بنا رکھا ہے اب تک — بگڑی ہوئی حالت ہے مگر بات بنی ہے

ہماری عزت، افلاس، بد اخلاقی اور شرمناک حالت کا فوٹو ہے۔

اے بانوے خلوت نشیں تا کے بہ قید آں و ایں — از پردہ بیروں آ و بیں نازِ زنانِ لشکری

ہمارے مصلح اگر یہی ہیں بدل ہی دیں گے مزاج لیلی ‏ ‏ یہ مشورے دے رہے ہیں حضرت کہ بھیجدو قیس کو بریلی
پہلے سنتے تھے صدائیں مردمیداں کون ہے ‏ ‏ اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گوئیاں کون ہے
اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق ‏ ‏ یے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی میری ہمسائے کی خاطر سے نہیں ‏ ‏ صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

عام واقعات عالم ہیں کوئی صاحب کسی خاص واقعہ کی طرف منسوب کرلیں تو کوتاہ نظری ہوگی۔

گو ڈر جدید روشنی کے مشعلوں کی ہے ‏ ‏ پردے کی احتیاج ہے کیا اس نباو پر
جب شمع ہو تو اس کی حفاظت ضرور ہے ‏ ‏ فانوس کوئی رکھ نہیں سکتا الاو پر

کس قدر بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اس موقع پر اکبر کا وہ غیر فانی قطعہ باربار یاد آتا ہے۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید ‏ ‏ بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ ‏ ‏ شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

تغزل

بحوالہ "نگار" اپریل ۲۶ء صفحات ۱۱-۲۱ اور "اکبر" اپریل و مئی ۲۶ء صفحات ۲۷ تا ۳۴ و ۵۶ تا ۶۰

"اکبر الٰہ آبادی و شاد عظیم آبادی" کے عنوان سے سید شاہ ولی الرحمن و کی بی۔اے کاکوری نے نگار میں ایک مضمون لکھا تھا اسی سرخی کے ماتحت سید افضال احمد صاحب فاضل ادب نے جواب مضمون لکھا تھا میں آپ کے سامنے دونوں مضامین کے ضروری حصے پیش کئے دیتا ہوں اور دونوں صاحبان کی رائے بھی لکھے دیتا ہوں یہ بالکل سچ ہے جیسا خود آپ کو بھی نظر آئے گا کہ دونوں کے مضمون میں جانب داری اور لوث کسی قدر شامل ضرور ہے مگر نکتہ سنج نگاہیں اصلیت و حقیقت کے پہلو ہر جگہ نکال لیتی ہیں۔

میں نے دونوں کے مضمون کی تمہیدیں پس پشت ڈال دی ہیں ان کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ اصل موضوع سے بالکل غیر متعلق تھیں یہ وجہ بھی ہے کہ ان میں کوئی خاص بات نہ تھی میں اپنی رائے دو وجہوں سے نہیں لکھتا ایک تو یہ اکبرؔ و شادؔ کے موافق اور مخالف جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ ان دونوں بزرگوں نے کہدیا ہے دوسرے یہ کہ موجودہ صورت میں ان اشعار اور آراء پر غور کر کے آپ خود جس نتیجہ پر پہنچیں گے وہ بہت زیادہ لطیف اور موثر ہوگا۔ مزید طوالت بھی بہتر نہ ہوگی۔

شاہ ولی الرحمن۔ اب میں اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ دونوں نے ایک تخیل کو کس انداز میں ادا کیا ہے۔

اکبر حباب آسا اُٹھایا بحرِ ہستی میں جو سر اپنا — بنایا بس وہیں موجِ فنا نے ہم سفر اپنا
شادؔ۔ موجِ فنا مٹا نہ دے نام و نشان وجود کا — دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

دونوں شعروں میں یہ اخلاقی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ زندگی کا انجام موت ہے غرور و خود بینی کا نتیجہ فنا ہے۔ اکبر کا شعر محض اظہار حقیقت ہے برخلاف اس کے شاد کے شعر میں بیان واقعہ کے ساتھ ہی عبرت پذیری و سبق آموزی کا پہلو بھی موجود ہے اور طرز ادا نے اس شعر کو اور چمکا دیا ہے۔

سید افضال احمد۔ عقیدت مندی ملاحظہ ہو حضرت اکبر کا شعر بجائے خود اس قدر مکمل ہے کہ زیادہ

کہنے کی ضرورت نہیں تاہم کچھ عرض کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ حباب کے ساتھ بحرِ ہستی کی مناسبت نہایت موزوں ہے۔ جناب شاد نے اس کا التزام نہیں فرمایا۔

۲۔ حضرت اکبر کے دوسرے مصرعہ اور جناب شاد مدظلہ کے پہلے مصرعہ کا مضمون بالکل متحد ہے مگر لطف و پاکیزگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ موج کا ہم سفر ہونا ایجاز بلیغ ہے جس میں بے ساختگی کا پہلو غالب ہے برخلاف اس کے جناب شاد محض اس خطرہ کا اظہار فرمارہے ہیں جو حباب کو موج فنا سے پیش آنے والا ہے۔

۳۔ حضرت اکبر کے شعر کی معنویت بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ حضرت اکبر کا شعر عملی تعلیم کا بہترین نمونہ ہے اور جناب شاد کا شعر ایک خیالی خاکہ ہے جس کے وجہ سے شعر میں تکلف پیدا ہوگیا ہے اور طرزِ ادا کی خوبی جاتی رہی۔

اکبر۔ پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی　　تاثیر حسن و عشق جو ہونی تھی ہو چکی

شاد۔ پروانہ کی میت جب یوں آگ میں جلتی ہے　　گو سخت ہے ظاہر میں پر شمع پگھلتی ہے

شاہ ولی الرحمٰن۔ اکبر کا شعر بے نیاز تعریف ہے حسن و عشق کے پر تاثیر انجام کو اس دلاویز انداز میں ادا کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس شعر کے مقابلہ میں اسی جدت تخیل کے ساتھ شعر نکالنا شاد ہی کا کام تھا۔ ان کے شعر سے یہ بلاغت بھی نمایاں ہے کہ گو دیکھنے میں شمع صورتاً و معناً سنگدل معلوم ہوتی ہے اور پروانہ کے حال زار پر رحم نہیں کھاتی مگر جب پروانہ اس کے جمال پر قربان ہو جاتا ہے تو محبت کی آگ سے وہ بھی متاثر ہوتی ہے اور گھل گھل کر فنا ہو جاتی ہے

سید افضال احمد۔ شاہ صاحب حضرت اکبر کے شعر کو بے نیاز تعریف قرار دیتے ہوئے حضرت شاد کی بلاغت کے مداح ہیں کہ وہ مضمون آفرینی میں جناب اکبر سے کم نہیں رہے۔ سبحان اللہ۔ حضرت اکبر نے جس اختصار لطیف سے کام لیا ہے۔ اس کی تصویر الفاظ سے کھینچنا ناممکن ہے۔ شعر کیا ہے حسن و عشق کا ایک عظیم الشان مرقع ہے۔ جتنا ہی سوچئے اتنا ہی لطف دوبالا ہوگا سلاست الفاظ، عبرت، معنی کے ساتھ محبت کی داستان کو ایک شعر میں اس طرح ادا کرنا گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔

حضرت شاد کے شعر کی بندش حضرت اکبر کے شعر کے مقابلہ میں سست ہے پہلے مصرعہ
میں یوں زائد ہے دوسرے مصرعہ میں پھر کے بعد "بھی" کا لفظ حشو کریہہ ہے۔

اکبر۔ اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

شاد۔ دیکے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا جس کی طلب تھی ساقیا اس نے کہیں سوا دیا

شاہ صاحب۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ دونوں میں صبر و توکل تسلیم و رضا کی تلقین ہے۔ اکبر کے دوسرے مصرعہ کا تیور دلاویز ہے۔ وہ زندگی کی تلخی پر قضا و قدر کی شکایت نہیں کرنا چاہتے۔ شاد میدان رضا میں ایک قدم اور آگے ہیں اور اپنی ناکامی او نامرادی پہ عدم شکایت کے بجائے الٹے شکر ادا کرتے ہیں گو معنوی حیثیات شاد کے شعر میں زیادہ ہیں تاہم طرز ادا کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

سید صاحب۔ اس بارے میں بالکل خاموش نظر آتے ہیں۔

اکبر۔ اگرچہ تکلیف نزع میں ہوں سکون خاطر بھی کم نہیں ہے
کسی سے ملنے کی ہیں امیدیں کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

شاد۔ آخر ہے عمر ضیق میں دل بھی ہے جان بھی مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

شاہ صاحب۔ اکبر کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ معشوق حقیقی کے وصال کی امید ہے اور زوال دُنیا سے مفارقت کا مطلق رنج نہیں ہے لہذا امید وصل میں نزع و سکرات کی تمام تکالیف و آرام گوارا ہیں اور مسرت و اطمینان حاصل ہے۔ شاد کے شعر کا مفہوم بہت بلیغ و ارفع ہے وہ کہتے ہیں کہ عالم وجود میں آنا معشوق حقیقی سے دور ہونا تھا زندگی کی تمام تکالیف و مصائب بطور امتحان عشق و محبت کے تھے جن کے سہنے پر وصال کی شادکامی منحصر تھی۔ اب تمام آرام و تکالیف کا خاتمہ ہو رہا ہے اور شاہد حقیقی سے ملنے کا وقت قریب ہے صرف ایک آخری امتحان محبت باقی ہے یعنی نزع کی بے چینی کرب و الم تکلیف و انقباض لہذا پامردی اور استقلال کے ساتھ ان مصائب کو بھی برداشت کرنا چاہئے پھر تو روح مشتاق ہے اور معشوق کے گلشن وصال کی گل چینی ظاہر ہے کہ شاد کے شعر میں جو حقائق و اسرار، اسالیب بلاغت اور خوش بیانی موجود ہے اکبر کے شعر میں نہیں۔

سید صاحب - پیران نمی پرند مریدان می پرانند۔
حضرت اکبر کا شعر چند وجوہ سے حضرت شاد کے شعر سے اعلیٰ ہے۔

۱- حضرت اکبر کا شعر صنعت تضاد کی بہترین مثال ہے۔ تکلیف - سکون۔ ملنا۔ چھٹنا کے اجتماع سے جو لطف پیدا ہو گیا ہے اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۲- بقول شاہ صاحب حضرت شاد اگرچہ اس وجود دنیاوی کو ایک امتحان محبت سمجھتے اور معشوق حقیقی کے قرب کا ذریعہ خیال کرتے ہیں تاہم آخری وقت میں دل و جان کی بے چینی سے گھبرا کر "مردانہ باش" پکار اُٹھتے ہیں برخلاف اس کے حضرت اکبر شاہد حقیقی کے خیال میں اس قدر محو ہیں کہ انھیں نزع کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اور سکون خاطر میں کمی نہیں ہوتی۔ فنا فی العشق کی آخری منزل یہی ہے۔

۳- حضرت اکبر کا شعر استدلالی شان لئے ہوئے ہے مرحوم نے تکلیف نزع کی بے حسی اور سکون خاطر کی مکمل توجیہ دوسرے مصرعہ میں پیش کر دی ہے۔ حضرت شاد مدظلہ کا شعر الفاظ بے ربط کا مجموعہ ہے "یہ امتحان" کو امتحان محبت پر محمول کرنا شاہ صاحب ہی کا کام تھا۔ مدعی سُست گواہ چست۔

اکبر- آنے دو مصیبت کو ذرا خانۂ دل پر — جو بند ہے غفلت میں وہ عبرت میں کھلے گا
شاد- جو دیکھے غور سے سارا بھرم کھلتا ہے دُنیا کا — مصیبت آدمی کو صاحب ادراک کرتی ہے

شاہ صاحب - انگریزی کا ایک فلسفیانہ مقولہ ہے "ادبار بہترین مدرسہ تربیت ہے۔ اسی مفہوم کو دونوں نے نظم کیا ہے شاد کے شعر کو قطعی ترجیح ہے ان کا دوسرا مصرعہ تو مقولہ مذکور کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور اتنا بے ساختہ ہے کہ ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہونے کے لائق ہے۔

سید صاحب - ناظرین انصاف فرمائیں کہ کیا شاہ صاحب کی ترجیح بلا مرجّح نہیں ہے اکبر کا شعر کئی حیثیتوں سے بڑھا ہوا ہے۔

۱- لفظی اعتبار سے حضرت اکبر کا شعر بے نظیر ہے۔ خانہ بند ہونا، کھلنا، غفلت عبرت ان رعایات لفظی کے ساتھ معنویت پر قابو رکھنا اکبر سے قادر الکلام استاد کا کام تھا۔ اس کے مقابلہ میں شاہ صاحب نے ایک ایسے شعر کو پیش کیا ہے جس کے دونوں مصرع

آپس میں مرتبط بھی نہیں ہیں۔

۲۔ اکبر کے شعر کا تیور بھی نرالا ہے "آنے دو" سے زجر و تخویف کا پہلو نمایاں ہے " ذرا " نے مصرعہ میں جان ڈال دی ہے۔ حضرت شاد نے دوسرے مصرعہ میں تصریح کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے اس لئے لطف جاتا رہا۔ حضرت اکبر نے اس امر کو کنایہ سے ادا کیا ہے اور الکنایہ احسن من التصریح۔

اکبر۔ آئے گی تجھ کو نظر صانع قدرت کی جھلک — سامنے کچھ نہ رکھ آئینہ فطرت کے سوا

شاد۔ صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نظر — آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

شاہ صاحب۔ دونوں شعر متحد المضمون ہیں جن کا مفہوم فلسفۂ الٰہیات کی ایک دلیل ہے منجملہ اور دلیلوں کے جو اثبات باری تعالیٰ میں پیش کی جاتی ہیں شاد کے شعر کو اکبر کے شعر پر فوقیت ہے۔ خصوصاً مصرعہ ثانی کا زور بیان طرز ادا اور حسن بندش قابل داد ہے۔

سید صاحب۔ حسب معمول شاہ صاحب یہاں ترجیح بلامرجح دینے سے باز نہ آئے شاہ صاحب کو معلوم نہیں کہ وہ جسے زور بیان اور حسن بندش سمجھتے ہیں فی الحقیقت تنافر لفظی ہے۔

اکبر۔ دل ہے ملول فرقت قامت وروئے یار میں — بھاڑ میں جائیں سرو و گل آگ لگے بہار میں

شاد۔ میں اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں — کیسی بہار آگ لگا دوں بہار میں

شاہ صاحب۔ شاد کے شعر کا طرز ادا صفائی زبان چستی بندش بے ساختگی اور تیور محتاج بیان نہیں۔ اکبر کا شعر اس کے مقابلہ میں بہت سست ہے اور لفظی رعایت نے اس کو اور بھی بے مزہ کر دیا ہے۔

سید صاحب۔ چہ خوش۔ "محتاج بیان نہیں" لکھ کر فرض تنقید سے سبکدوش ہو گئے اکبر کا شعر اس کے مقابلہ میں بہت سست ہے کیوں؟ نہیں بتاتے "لفظی رعایت نے اسے اور بھی بے مزہ کر دیا" اچھا معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رعایت لفظی کے بارے میں آنکھ بند کر کے کفر کا فتوےٰ صادر کر دیتے ہیں خواہ اس سے حسن بیان میں چاشنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے۔

اکبر۔ داغ دل پر نظر یاس نہ کر اے اکبر — کوئی ذرہ چمن دہر میں بیکار نہیں

شاد۔ خالی سمجھ کے پھینک نہ اے موجِ رائگاں ہر کیسہ حباب کے اندر خزانہ ہے

اکبر کے شعر کا ماخذ مرزا غالب کے یہ دو مصرع ہیں۔

(۱) یک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا (۲) ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار

ظاہر ہے کہ اکبر نے اس مضمون کو بجنسہ لے لیا اور کوئی جدت نہیں پیدا کی برخلاف اس کے شاد نے اس عالمگیر کلیہ کو ایک جدید اسلوب اور اچھوتے تخیل میں بیان کر دیا۔ میرے خیال سے اس خوبی سے اس مضمون کو اُردو میں میں کسی نے نہیں ادا کیا۔

سید صاحب نے خدا جانے کیوں اس جگہ بھی سکوت اختیار کیا ہے۔

اکبر۔ دل بیتاب نے کیا کیا دکھائے ہیں مجھے عالم یہ پرزہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانہ میں

شاد۔ سرکار دل بھی ہوش ربائے زمانہ ہے وسعت تو کچھ نہیں مگر اک کارخانہ ہے

شاہ صاحب۔ دونوں اپنے اپنے رنگ میں سرکار دل کی کارفرمائیوں کو بیان کر رہے ہیں اکبر کا شعر صاف ہے شاد دل کی طلسمی کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ دیکھنے میں دل تو ایک مختصر مضغۂ گوشت ہے مگر اس کے اندر ایک وسیع کارخانہ قدرت نظر آتا ہے کیونکہ تخلیاب وجذبات کا جلوہ گاہ دل ہے اس شعر کے طرز ادا اور جوش بیان کو اکبر کا شعر نہیں پہنچتا اور معنوی محاسن کے لحاظ سے بھی شاد کا شعر کہیں مرجح ہے۔

سید صاحب ۔شاہ صاحب نے حضرت شاد کے شعر کو ترجیح تو دے دی مگر کوئی معقول توجیہ نہ کر سکے حضرت 'اکبر' کا شعر جناب شاد کے شعر سے کہیں اچھا ہے۔

اکبر نے پہلے مصرعے میں لفظ عالم سے جو ایہام کی صفت پیدا کر دی ہے محتاج بیان نہیں برخلاف اس کے شاد کا مصرعہ اوّل بہت کمزور بندش بھی سست ہے۔ "ہوش ربا" میں اشیاء کی کیفیت سے جو کراہت پیدا ہو گئی ہے اس نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔

حضرت شاد نے دل کو محض ایک کارخانہ کہہ کر وسعت کو محدود کر دیا ہے لیکن حضرت اکبر نے دل بے بیتاب کی مناسبت سے قیامت کا لفظ اتنا خوب انتخاب کیا ہے جس کی شوریدگی ووسعت کا اندازہ مشکل ہے۔

اکبر۔ خلوتِ نازمیں کیا شان خود آرائی ہے حسن خود عالم حیرت میں تماشائی ہے

شاد۔ دیدنی تھا یہ سماں تیرے نکھرنے کی قسم — سکتہ آئینہ کا جلوہ ترا حیرت میری

شاہ صاحب۔ اکبر نے مطلع خوب کہا ہے الفاظ بہت رنگین آئے ہیں ایک حسین کی فطرت میں داخل ہے کہ آرایش کے بعد اپنے حسن کا نظارہ آئینہ میں ضرور کرتا ہے۔ شاعر ایک ایسے پری جمال معشوق کی خودآرائی کا ذکر کر رہا ہے جو حسن وجمال میں اپنی آپ نظیر ہے لہذا معشوق اپنے حسن وجمال کا عکس آئینہ میں دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور آپ اپنا تماشائی بن جاتا ہے مولانا وحید الہ آبادی نے بھی اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے ؎

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں — جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

شاد نے معشوق کی آرایش کی تصویر کشی نہایت خوب کی ہے معشوق آرایش جمال سے فارغ ہوا ہے اس کی جلوہ پیرائی نے ایک حشر برپا کر دیا ہے کہ ایک طرف تو اس کا تماشائی محو حیرت ہے اور دوسری طرف آئینہ دم بخود ہے۔ اس شعر کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑا حسن تخیل کا آئینہ ہے "تیرے نکھرنے قسم" کان لطافت کا ایک جوہر ہے دوسرے مصرعہ کا حسن تقسیم اتنا کیف زا ہے کہ اس کے محاسن ضبط تحریر میں نہیں آسکتے ذوق سلیم خود اس سے لذت اندوز ہو سکتا ہے۔

سید صاحب اس موقع پر بھی چپ ہیں۔

اکبر۔ کہتے ہیں فطرت جسے یہ ہے نقاب روے دوست — ہے اسی پردہ میں پنہاں آفتاب روے دوست

شاد۔ جو آنکھیں ہوں تو چشم غور سے اوراق گل کو دیکھو — کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

شاہ صاحب۔ اکبر کہتے ہیں کہ مظاہر فطرت کے پردہ میں شاہد حقیقی کا حسن وجمال مستور ہے اسی مسئلہ کو شاد دلاویز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اوراق گل جرائد فطرت ہیں جن میں حسن حقیقی کی شرحیں مرقوم ہیں اگر شیداے حقیقت ان رسالوں کو غور سے دیکھے تو انوار معرفت کا نظارہ کر سکتا ہے پھولوں کو رسالہ قرار دینا کتنا معنی خیز ہے اور لفظ کسی میں کتنی بلاغت مستور ہے۔ شاد کا شعر اکبر کے شعر سے بہرحال بہتر ہے۔

سید صاحب۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ "پھولوں کو رسالہ قرار دینا معنی خیز ہے"۔ حالانکہ شاد صاحب کا ماخذ فارسی کا یہ زبان زد شعر ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

فرمائیے اب وہ دلاویز انداز کہاں گیا۔ اکبر کا شعر اس قدر خوب اور حقیقت کا پہلو لئے ہوئے ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ حضرت شاد نے محض اوراق گل ہی تک حسن حقیقی کی شرح محدود کر دی ہے مگر اکبر کی وسعت نظری ملاحظہ فرمائیے کہ وہ تمام فطرت کو حسن ازلی کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں سچ پوچھئے تو اکبر نے وحدت شہود کے متعلق مسئلہ جس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے اس کو کچھ وہی لوگ سمجھتے ہیں جو خود ذوق سلیم سے متصف ہیں، شاہد حقیقی کا حسن اوراق گل ہی میں نہیں وہ تو فطرت کے ذرے ذرے میں تاباں ہے۔

اکبر۔ بہار آئی ہے اک آئینہ معنی نشاں ہو کر چمن میں بوئے گل پھیلی ہے تیری داستاں ہو کر

شاد۔ مہک اُٹھا چمن وہر کا پتہ پتہ راز چھپنے نہیں دیتا ترا خوشبو تیری

اکبر نے بہار کو "آئینہ معنی نشان" قرار دیا ہے جو نہایت خوش اسلوب و بلیغ ہے بوئے گل کو داستان معشوق کی تشہیر ثابت کرنا بھی کتنا دلاویز ہے شاد کا بھی وہی مضمون ہے اور نہایت خوبی سے بندھا ہے دوسرے مصرعہ کی ترکیب کتنی پیاری ہے۔ شاد کا ذوق نظر نہایت وسیع ہے وہ کائنات کے ذرے ذرے میں معشوق کی جلوہ پیرائی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اکبر نے اس کو صرف موسم بہار تک محدود کر دیا ہے۔

سید صاحب۔ نہیں معلوم شاہ صاحب نے اکبر کو محدود کر دینے کا مرتکب کیسے ٹھہرایا۔ "بہار آئی" سے تو یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ تسلیم بھی کر لیں تو حضرت شاد کا پہلا مصرعہ بھی اس کو ظاہر کر رہا ہے۔ اہل زبان پر پوشیدہ نہیں کہ مہک "اُٹھا" سے استمراری یا دوامی کیفیت مراد نہیں لی جا سکتی۔ حضرت اکبر کا شعر واقعی "نہایت خوش اسلوب و بلیغ ہے" اس کے مقابلہ میں شاد کا شعر نہایت پھیکا ہے شاد کے دوسرے مصرعہ میں تو تعقید لفظی نے غضب ہی کر دیا۔

اکبر۔ آج آرائش گیسوئے دوتا ہوتی ہے پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے

شاد۔ چشم سیاہ میں سرمہ دے زلف سیاہ میں شانہ کر قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

شاہ صاحب۔ اکبر کے شعر کا مضمون سامنے کا ہے اور کوئی جدت نہیں پائی جاتی شاد کا شعر ایک محشرستان تخیل ہے اور اس میں جو مستی، جوش، دلاویزی، چستی اور بلاغت پائی جاتی ہے۔

اکبر کے شعر میں نہیں ہے۔

سید صاحب۔ یہاں بھی چپ ہیں۔

اکبر۔ یہ ادائیں یہ لگاوٹ یہ بلا کی چستون — میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہو

شاد۔ ہائے وہ جادو بھری آنکھیں وہ کافر چتونیں — وہ بڑا مومن تھا قائم جس کا ایماں رہ گیا

شاہ صاحب۔ دونوں معشوق کے ملائک فریب معجزۂ حسن کی تصویر کھینچ رہے ہیں میرے خیال میں شاد کا شعر زیادہ مستانہ ہے دوسرے مصرعہ میں لفظ مومن کتنا بلیغ واقع ہوا ہے اور خصوصًا کافر کے مقابلہ میں اس کا بے اختیار اور برمحل استعمال نہایت کیف انگیز ہے۔

سید صاحب۔ حقیقت میں یہاں پر شاہ صاحب نے اپنے خوش اعتقادی سے زیادہ کام لیا ہے ورنہ اکبر کا شعر بہت اعلیٰ ارفع ہے۔

۱۔ حضرت اکبر کے شعر میں محاکات کا پہلو جس قدر مکمل ہے شاد کے یہاں نہیں حضرت اکبر نے پہلے ہی مصرع میں معشوق کی تین کیفیتوں کا نقشہ کھینچا ہے اور شاد صاحب صرف آنکھوں ہی کے بیان تک رہ گئے۔

۲۔ حضرت اکبر کا شعر اثرات حسن کا کامل ترین ترجمان ہے معصوم فرشتوں سے بھی ضبط نہونا حسن معشوق کا انتہائی معرف ہے شاہ صاحب کی تگ ودو صرف مومن تک رہ گئی۔

اکبر۔ حیرت میں ختم ہو گئی انشائے زندگی — حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی

شاد۔ ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہیں اس پر اکیلی ہے — ہماری روح بے بوجھی ہوئی اب تک پہیلی ہے

شاہ صاحب۔ دونوں اشعار کا مضمون فلسفیانہ ہے جس کا نتیجہ ایک ہے معنویت کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ شاد نے اس فلسفہ کو رنگ تغزل میں ادا کیا ہے جس سے شعر میں زیادہ کیف پیدا ہو گیا ہے۔

سید صاحب۔ خاموش ہیں۔

اکبر۔ امتیاز حسرت و رنج و الم جاتا رہا — غم ہوا اتنا کہ اب احساس غم جاتا رہا

شاد۔ خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے — تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

شاہ صاحب۔ دونوں اساتذہ نے فلسفۂ جذبات کے مسئلوں کو نظم کیا ہے جس میں دل کی

ایک پوشیدہ اور گہری کیفیت کی تصویر کشی کی ہے۔ اکبر کا فلسفہ یہ ہے کہ غم والم کی کثرت دل کو غم والم کا اتنا خوگر بنا دیتی ہے کہ اس کا احساس باقی نہیں رہتا اور رنج والم ایک راحت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہ فلسفہ جذبات کا ایک مسئلہ ہے جس کو مرزا غالب بہت قبل نہایت لطیف انداز میں کہہ چکے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اکبر کا شعر اسی شعر سے ماخوذ ہے۔ شاد قلب کی ایک دوسری کیفیت کی مصوری کر رہے ہیں وہ یہ کہ مصائب و الام کا ضبط کرنا اور بھی اندوہ فزا ہے اس سے اندوہ غم اور سنگین ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی روح اندر ہی اندر تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ رنج والم کی اس خلش کو کم کرنے کی صورت یہ ہے کہ انسان دل کھول کر روئے تڑپے نالہ کرے۔ اس سے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور ایک تسکین محسوس ہوتی ہے دونوں شعروں کا فلسفہ جداگانہ ہے اپنی جگہ پر دونوں شعر خوب ہیں مگر اکبر کا شعر مستعار ہے اور شاد کا شعر اور جنل (طبعزاد) اس لئے شاد کے شعر کو ترجیح دینی چاہئے۔

سید صاحب۔ شاہ صاحب باوجودیکہ اس بات کے قائل ہیں کہ "دونوں شعروں کا فلسفہ جداگانہ ہے" لیکن حیرت ہے کہ موازنہ کی الجھن میں پھنس گئے۔

اکبر۔ بہار بے بقا پر ناز کیسا اور خوشی کیسی　　بجا ہے حیرت نرگس کہ گل کی یہ ہنسی کیسی

شاد۔ یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا　　ہنسو گے خود اس چمن میں غنچو زمانہ آئے ذرا نمو کا

شاہ صاحب۔ دونوں شعروں میں دُنیا کی بے ثباتی اور عبرت پزیری کی تلقین ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ پھولوں کی ہنسی کو دیکھ کر نرگس حیرت زدہ ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بہار چند روزہ ہے اور پھولوں کا انجام ایک دن خاک ہے۔ لہذا اپنی بہار پر مسرور ہونا عبث ہے۔ شاد کہتے ہیں کہ گلشن عالم کی عشرت کسی کو راس نہیں آتی۔ ابھی کم سنی کی وجہ سے غنچوں کو اپنے رنگ و بو پر مسرت ہے مگر جب نمو پزیر ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ نشو و نما کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ اس رنگ و بو کو آخر خاک میں ملنا ہے لہذا وہ خود بہار و باغ کے وجود پر ہنسیں گے۔ شاد کے شعر کو اکبر کے شعر پر فوقیت ہے مضمون تو دونوں کا ایک ہے مگر بلاغت کے پہلو شاد کے شعر میں زیادہ ہیں مصرعوں کی ترکیب نہایت مترنم اور کیف زا ہے۔

سید صاحب۔ افسوس کہ شاہ صاحب نے شاد کے شعر کا مطلب خود اس قدر خبط کر دیا ہے کہ اس کی رہی سہی خوبی بھی جاتی رہی۔ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں "ابھی کمسنی کی وجہ سے غنچوں کو اپنے رنگ و بو پر مسرت ہے" نہیں معلوم کہ یہ مطلب شعر کے کس ٹکڑے سے اخذ کیا گیا ہے ہاں اگر اس کا تعلق "بطن شاعر" سے ہو تو دوسری بات ہے۔ اس چمن میں ہنسنے سے اس چمن پر ہنسنے کا مطلب پیدا کرنا کہاں کا محاورہ ہے اصل میں حضرت شاد کے شعر کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس چمن میں نشو و نما کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ اس لئے جب غنچوں کے نمو کا زمانہ آئے گا تو وہ خود اپنی غفلت پر ہنسیں گے مگر یہ مطلب شعر کے الفاظ سے اچھی طرح حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر شعر یوں ہوتا تو بہتر تھا ؎

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا　　ہنسو گے غفلت پر اپنی غنچوں زمانہ آئے ذرا نمو کا

شعر سابق کے دوسرے مصرعے میں اس چمن کا ٹکڑا بالکل فضول تھا اس لئے کہ پہلے مصرعے میں لفظ یہاں بذات خود مکمل تھا اب میں شاہ صاحب ہی کے انصاف پر چھوڑتا ہوں کہ ان دونوں شعروں میں کون سا شعر بہتر ہے۔

اکبر۔　فروغ دل اب نہیں ہے باقی وہ سوز و ساز اس میں اب کہاں ہے
یہ آہ و فریاد ہے جو لب پر بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے

شاد۔ نہیں ہے توں سے وہ ولولہ دل زار سینہ میں جل گیا　　فقط ایک ڈھیر ہے راکھ کا نہ وہ سوز ہے نہ وہ ساز ہے

شاہ صاحب۔ میرے خیال میں اکبر کا شعر شاد کے شعر سے بہتر ہے۔ اولاً تو اول الذکر نے اس مضمون کو مطلع میں ادا کیا ہے جس سے مصرعوں میں ترنم پیدا ہو گیا ہے ثانیاً آہ و فریاد کو شمع دل کا دھواں قرار دیا ہے جس سے تخیل میں نزاکت پیدا ہو گئی ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ شمع کے بجھنے پر تھوڑی دیر تک دھواں اٹھتا ہے۔ مضمون بہت نیچرل ہے اور تشبیہ مکمل شاد کا شعر نہایت درد انگیز اور موثر ہے۔

سید صاحب۔ کے زبان قلم پر سکوت کا عالم نظر آتا ہے۔

اکبر۔ یاس ہی پاس تھی جب موت کا پیغام آیا　　میں نہ سمجھا کہ یہ جینا مرے کس کام آیا

شاد۔ اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

شاہ صاحب۔ دونوں کا مضموں فلسفہ زندگی کے لئے جداگانہ ہے۔ اکبر زندگی کی ہیچ انجامی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موت کے وقت سوائے یاس اور حرماں کے اور کچھ نہیں ہے شاد کا شعر ایک وسیع تخیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک طویل عمر گزارنے پر بھی نہ نصب العین حیات کی تکمیل ہوئی اور نہ زندگی کو بہتر و مفید اسلوب میں صرف کرنے کا سلیقہ آیا لہٰذا ایسی ہستی سے دل بیزار ہے اور اس سے پناہ مانگتا ہے۔ اس شعر سے اکبر کے شعر کو کوئی نسبت نہیں یہ حسن تغزل کا بہترین نمونہ اور جوش و اثر اور تمام محاسن شعری کا گنجینہ ہے۔

سید صاحب۔ سچ ہے عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ شاہ صاحب کو چند جملے یاد ہیں "اس شعر سے اکبر کے شعر کو کوئی نسبت نہیں"۔ "شاد کا شعر بہر حال بہتر ہے" وغیرہ وغیرہ اکبر کا شعر شاد کے شعر سے کسی حیثیت سے کم نہیں اکبر کہتے ہیں کہ جب موت آئی تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہ تھا اسلئے اب انھیں اپنی غفلت کا احساس ہوتا ہے اور بے ساختہ کہ اٹھتے ہیں ع میں نہ سمجھا کہ یہ جینا مرے کس کام آیا۔ شاد ایک طویل عمر بسر کرنے پر بھی زندگی کی شکایت کرتے ہیں اور اس سے پناہ مانگتے ہیں ظاہر ہے کہ اکبر کا شعر بے خبری اور غفلت کا بہتریں خاکہ ہے کہ تمام زندگی اس کا احساس ہی نہیں ہوا برخلاف اس کے شاد نے غفلت کو "ایک عمر" پر محدود کر کے شعر کا لطف کھو دیا۔

اکبر۔ سالک راہ محبت کو خرد سے کیا کام وہ تو چاہے گا کہ خود ہوش بھی ہمراہ نہ ہو

شاد۔ جسم خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

شاہ صاحب محبت ایک لطیف و مجرد جوہر ہے۔ جو ہر انسان کے آئینہ دل میں ودیعت کیا گیا ہے اس کی مدد سے روح ذات واجب الوجود سے مواصلت کی کوشش کرتی ہے مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ انسان ہوش و خرد، جسم و مادہ وغیرہ سے تمام تر بیگانہ ہو جائے کیونکہ عالم روحانیات میں ان مادی چیزوں کا وجود راہ ترقی میں سد راہ ہیں۔ شاد کہتے ہیں کہ روح جسم سے منزہ ہوتی تو راہ محبت بہ آسانی طے کر لیتی مگر چونکہ جسم خاکی بھی روح سے وابستہ ہے

اس لئے ہزار ہا علایق دنیوی کا سامنا ہے اور منزل حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی۔ معنویت کے لحاظ سے شاد کے شعر کو ترجیح ہے کیونکہ سالک راہ محبت کی تکمیل نصب العین میں صرف ہوش و خرد ہی نہیں بلکہ اس کا سراپا مادی وجود ہی رخنہ انداز ہے۔

سید صاحب۔ پھر خاموش ہیں۔

اکبر۔ اس وعدہ خلافی پہ کرو غور کسی دن | ہر روز یہ کہدیتے ہو اب اور کسی دن
شاد۔ بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے | تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

دونوں شعروں کی صفائی زبان، انداز بیان، خوبی بندش، چستی ترکیب نہایت لاویز ہے اور میرے خیال میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل نظر آتا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو شاد کا شعر زیادہ پر معنی و متخیل ہے اکبر صرف معشوق کی وعدہ خلافی کے شاکی ہیں شاد کے شعر سے ایک دنیائے تخیل سامنے آجاتی ہے۔ خصوصاً اس کا دوسرا مصرعہ غضب کا ہے۔

سید صاحب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاد کا شعر اکبر کے شعر سے معنویت میں فایق ہے مگر شوخی اور زبان کی صفائی میں اکبر کے شعر سے کہیں کمتر ہے "اب اور کسی دن" میں ایک دنیائے حقیقت مضمر ہے۔

اکبر۔ اس گلستاں میں بہت کلیاں مجھے تڑپا گئیں | کیوں لگی تھیں شاخ میں کیوں بے کھلے مرجھا گئیں
شاد۔ آئی کس شوق سے اور باغ میں پھولی نہ پھلی | اے کلی کیوں نہ ہو صدمہ ترے مرجھانے کا

شاہ صاحب۔ ان شعروں کا ماخذ ذوق کا یہ مصرعہ ہے ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مُرجھا گئے

بہرکیف مضمون کے لحاظ سے دونوں کا شعر اپنے اپنے انداز بیان میں قابل داد ہے اکبر کا مضمون چونکہ مطلع میں ادا ہوا ہے اس لئے زیادہ مترنم کیف زا اور موثر ہے۔

سید صاحب۔ نے غالباً مصلحتاً سکوت اختیار کیا ہے۔

اکبر۔ نشتر لگائے جا تو اے رنج ناامیدی | دل کو ابھی شکایت باقی ہے جوش خوں کی
شاد۔ یونہی رہ رہ کے تو اے ناامیدی دل کو چھیڑے جا | یہی مہمیز خشش عمر کو چالاک کرتی ہے

شاہ صاحب۔ اکبر کے شعر میں ناامیدی سے استدعا کی گئی ہے کہ دل سوداز دہ میں اتنی نشتر زنی

کرے کہ جوشِ خوں بالکل زائل ہو جائے اس میں کوئی ولولہ و ہنگامہ اور جنون وسودا باقی نہ رہے اور اطمینان وسکون حاصل ہو جائے۔ شاد کہتے ہیں کہ ناامیدی کی چھیڑ دل کے لئے نہایت امید افزا ہے کیونکہ اس مہمیز سے توسن عمر تیزگام ہو جاتا ہے۔ شاد کے دونوں مصرعے باہم نہایت متوازن و متقابل ہیں۔ مفہوم پاکیزہ ہے تخیل میں جدت ہے ترکیب پرجوش اور پُراثر ہے۔ اکبر کا شعر بھی خوب ہے۔

سید صاحب۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ دانا دشمن ناداں دوست سے بہتر ہوتا ہے شاہ صاحب حضرت شاد کے معتقد تو ہیں مگر بری طرح سے وہ جوش عقیدت میں حضرت شاد کے شعروں کا مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے شاہ صاحب شاد کے شعر کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ناامیدی کی چھیڑ دل کے لئے نہایت امید افزا ہے کیونکہ اسی مہمیز سے توسن عمر تیزگام ہو جاتا ہے" اگر شاد کے شعر کا مطلب یہی ہے تو حضرت اکبر کا شعر بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ ناامیدی سے خدا جانے کس طرح توسن عمر تیزگام ہو جاتا ہے۔ جب کہ زندگی کی گھڑیاں ایک مدت معینہ کی تابع ہیں۔ اصل یہ ہے کہ رخش عمر کی چالاکی سے اس کی تیزگامی مراد نہیں ہے اس لئے کہ عمر کی رفتار گھوڑے کی طرح مختلف نہیں ہوتی کہ کبھی قدم چلے اور کبھی پویہ۔ رخش عمر کی چالاکی کا مفہوم محض اضطراب و کشمکش ہے جو دل کے چھیڑ سے بڑھتی ہے۔ اب شاد صاحب اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کس کا شعر بہتر ہے۔

اکبر۔ دل شکستہ ہوں مگر دل میں خدا کا نور ہے — یہ وہ ویرانہ ہے روشن جس میں شمع طور ہے

شاد۔ سراپا سوز ہے اے دل سراپا نور ہو جانا — اگر جلنا تو جل کر جلوہ گاہ طور ہو جانا

شاہ صاحب۔ دونوں شعر کا مطلب قریب قریب ایک ہے فرق صرف طرز بیان کا ہے دونوں شعر اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ اکبر کہتے ہیں خانۂ دل کی تخریب کے بعد جلوہ الٰہی اس میں جلوہ گر ہوتا ہے شاد دل کو ہدایت کرتے ہیں کہ آتش عشق میں جلنے کا نتیجہ نور مجسم ہو جانا ہے لہٰذا اگر جلنا ہے تو کوہ طور کی طرح جل تاکہ انوار الٰہی نور فشاں ہو۔ شاد کے شعر میں دل کا "سراپا سوز" ہو کر "سراپا نور" ہو جانا بہت نیچرل ہے۔

سید صاحب۔ خاموش ہیں۔

اکبر۔ اگرچہ دل کو ہے سودا اسے برا نہ کہو کسی کی زلف سے ملتا ہے سلسلہ اس کا
شاد۔ واعظ بتوں کو تو نے کہا اہل زور تک اے بے خبر یہ بات پہنچتی ہے دور تک

شاہ صاحب۔ دونوں شعر خوب ہیں۔ اکبر کے شعر میں رعایت لفظی کا لطف ہے یعنی سودا زلف سلسلہ مفہوم بھی پاکیزہ ہے۔ شاد کے شعر میں خوبی بیان اور صفائی زبان کا لطف ہے اور ایک نازک کنایہ اس میں موجود ہے وہ یہ کہ خود شاد نے ایک جگہ بتوں کے حسن کے متعلق کہا ہے کہ " یہ حسن حسن حقیقی کا استعارہ ہے" پس بتوں کی برائی کرنا خدا سے گستاخی کرنا ہے:۔

اکبر۔ یہ سوز داغ دل یہ شدت رنج و الم کب تک
ہمارے ہی لئے یہ جور گردوں ہے تو ہم کب تک

شاد۔ بڑھے جاتے ہیں دکھ یہ عمر جوں جوں گھٹتی جاتی ہے
مگر میں سوچ کر خوش ہوں کہ بیڑی کٹتی جاتی ہے

شاہ صاحب۔ اکبر کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر شدید مصائب و آلام کا سامنا ہے اور پیر فلک میرے ہی ستانے پر آمادہ ہے تو اس کا غم بے سود ہے کیونکہ آخر میری زندگی ایک دن ختم ہو جائے گی اور تکالیف دنیوی سے نجات ابدی حاصل ہوگی۔ شاد کہتے ہیں کہ جیسے جیسے عمر کم ہوتی ہے مصائب زندگی اور زیادہ ہوتے ہیں مگر مجھے اس کا مطلق غم نہیں بلکہ اطمینان اور مسرت ہے کیونکہ اب عمر آخر ہے اور بہت جلد رنج و الم کی بیڑی کٹنے والی ہے۔ مفہوم دونوں شعروں کا ایک ہے مگر شاد کا شعر زیادہ دلاویز و کیف زا ہے انداز بھی نہایت پسندیدہ ہے اکبر کا شعر بھی نہایت خوب ہے اور تاثیر سے لبریز ہے۔

سید صاحب۔ خاموش ہیں۔

اکبر۔ سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا
شاد یونہی راتوں کو تڑپیں گے یونہی جان اپنی کھوئیں گے
تری مرضی نہیں اے درد دل اچھا نہ سوئیں گے

شاہ صاحب۔ مضمون دونوں شعروں کا بالکل جداگانہ ہے مگر چونکہ دونوں کا تعلق جذبات

سے ہے اور طرز زبان اور خوبی بیان کا لطف دونوں میں تقریباً یکساں ہے لہذا موازنہ کے لئے میں نے انھیں منتخب کر لیا ہے۔ اکبر کے شعر میں الم دوستی اور ایذا طلبی کا مضمون ہے دوسرے مصرعہ کی برجستگی نہایت پر کیف ہے شاد کا شعر محاسن تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔ اس بات کو کہ "درد دل کے ہاتھوں خواب و آرام حرام ہے" کس پر کیف و پرجوش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ میر کے نشتر کی کیفیت اس شعر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

سید صاحب۔ کے لبوں پر مہر سکوت ہے۔

اکبر۔ امید دل میں نہیں سانس ہی ہے سینہ میں — مجھے تو اب کوئی لذت نہیں ہے جینے میں

شاد۔ سمجھ رہا ہوں کہ ہر سانس ہے اخیر کی سانس — یہ کون جینے میں جینا ہے دم شماری ہے

شاہ صاحب۔ میرے خیال میں دونوں شعر جذبات و کیفیات پیرانہ سالی کا آئینہ ہیں اور حسن تغزل کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے مگر اکبر کا مضمون چونکہ مطلع میں ادا ہوا ہے اس لئے شعر میں ترنم و کیف زیادہ پیدا ہو گیا ہے۔

سید صاحب۔ ابھی تک خاموش ہیں۔

اکبر۔ زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی — ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں

شاد۔ پیری میں امنگیں وہ نہیں جوش نہیں ہے — اب اپنے کو سمجھوں یہ مجھے ہوش نہیں ہے

دونوں شعر اپنے اپنے انداز میں خوب ہیں مگر گو اور محاسن شاعری دونوں میں تقریباً یکساں ہوں تاہم شاد کا مصرعہ ثانی نہایت برجستہ و بے ساختہ، پرجوش و پر اثر ہے یوں بھی ان کا شعر ہر نوع جذبات سے لبریز ہے۔

سید صاحب۔ اکبر کا شعر شاد کے شعر سے کہیں اعلیٰ ہے۔ حضرت شاد نے عدم ہوس کو محض پیری ہی تک محدود کر دیا ہے اور پھر حضرت اکبر کا شعر قید زمان سے آزاد ہے ظاہر ہے کہ جتنی وسعت اکبر کے شعر میں ہے شاد کے شعر میں نہیں۔

شاد کہتے ہیں مجھے یہ بھی ہوش نہیں کہ اپنے کو سمجھوں۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔ اس کو اکبر نے بھی ادا کیا ہے مگر بلیغ طریقہ سے۔ ہوش میں رہ کر ہوشیار نہ رہنا سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

اکبر۔ علم ابتدا کا ہے نہ خبر انتہا کی ہے　　دور انقلاب کا ہے حکومت فنا کی ہے
شاد۔ سُنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سُنی　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

شاہ صاحب۔ دونوں شعروں میں جو ذوق شعری و معنوی ہیں ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں صاف ظاہر ہے کہ شاد کے شعر میں جو تاثیر و جوش حقایق و اسرار اور حسن تخیل موجود ہے اکبر کے شعر میں نہیں۔ اکبر کے شعر کا مطمح نظر شاد کے شعر سے جداگانہ ہے وہ دراصل دنیا کے انقلاب و فنا کا ذکر کر رہے ہیں۔ شاد کا شعر ایک وسیع تخیل پیش کرتا ہے اور حسن تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔

سید صاحب۔ خاموش ہیں۔

اکبر۔ تمھیں انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر　　بہت نزدیک ہے وہ دن نہ ہم ہونگے نہ تم ہوگے
شاد۔ اجل سلادے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر　　نہ ہم رہیں گے نہ تم رہوگے نہ شاد یہ داستاں رہے گی

شاہ صاحب۔ اکبر انقلاب دہر سے تنگ آکر دل کو تسکین دیتے ہیں کہ اس کا غم کرنا بے سود ہے کیونکہ بہت جلد زندگی ختم ہونے والی ہے اور اس روح فرسا ہنگاموں کے نظارے سے نجات ملنے والی ہے۔ شاد دنیا کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں کہ حیات انسانی اور اس کے تمام لوازمات کو ایک دن فنا ہونا ہے اور ہر فرد کو موت کی گہری نیند سونا ہے شاد کے شعر کا انداز بیان نہایت دلاویز ہے۔ فنا ہونے کو کس لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ "اجل سلادے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر"

سید صاحب۔ خاموش ہیں۔

اکبر۔ حسن بت یہ ہے تواب یاد خدا کی نہیں خیر　　یہ ادا ہے تو نمازوں کی قضا آئی ہے
شاد۔ اب تو جانے لگا مسجد کی طرف وہ کافر　　گر یہ سچ ہے تو شہادت ہے مسلمانوں کی

شاہ صاحب۔ اکبر کے دونوں مصرعوں کا تناسب و تقابل خوب ہے اور "ادا" کو "نمازوں کی قضا" کا ذمہ دار ٹھہرانا نہایت پر لطف ہے شاد کا شعر بھی نہایت خوب ہے 'مسجد' 'کافر' 'شہادت' اور 'مسلمانوں' کی رعایت لفظی نہایت پر لطف ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

سید صاحب۔ اب تک خاموش ہیں۔

اکبر۔ عجب فتنہ خرام نازک قاتل سے اُٹھتا ہے سنبھلتا ہی نہیں دامن قدم مشکل سے اُٹھتا ہے

شاد۔ خرام ناز میں ڈورا یہی کہتا ہے گردن کا نہیں اُٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا

شاہ صاحب۔ اکبر کا شعر نہایت مستانہ اور شاندار ہے۔ الفاظ کی نشست فقروں کا درو بست اتنا خوش اسلوب و پرکیف ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ شاد کا شعر بھی اس کے مقابلہ میں کچھ کم پرلطف نہیں ہے مگر دن کے ڈورے کا زبان حال سے یہ کہنا کہ "نہیں اُٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا" کیف انداز ہے۔

سید صاحب۔ اکبر کا شعر مکمل محاکات پیش کرتا ہے دوسرا مصرعہ ایک تصویر ہے جس سے خرام نازک کا نقشہ آنکھوں میں آپ ہی آپ کھنچ آتا ہے۔ حضرت شاد کے شعر میں لفاظی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

اکبر۔ اُٹھتی ہیں تجھ سے یہ آہیں دل ناشاد عبث سننے والا نہیں کوئی تو ہے فریاد عبث

شاد۔ کس کی تاراجی گلزار کی فریادی ہے مفت اے باد صبا وقت کی بربادی ہے

اکبر کے شعر کا مضمون معمولی ہے شاد کے شعر میں ایک وسیع معنی پوشیدہ ہے اس کا روز بیان چستی ترکیب مصرعوں کی بے ساختگی بے حد پرجوش و پرتاثیر ہے۔

سید صاحب۔ چپ ہیں۔

اکبر۔ سامنا جلوۂ معشوق کا اللہ اللہ ہے یہی وقت کہ بس آپ میں انساں نہ رہے

شاد۔ جلوہ حسن خدا ساز ستم ڈھاتا ہے کیا کہیں دیکھ کے انساں سے رہا جاتا ہے

شاہ صاحب۔ دونوں شعروں میں حسن کی کرشمہ زائیوں اور عشوہ طرازیوں کے بے پناہ اثرات کا بیان ہے۔ میرے خیال میں دونوں شعر اپنی اپنی جگہ قابل داد ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مشکل ہے۔

مذکور بالا اشعار کو باہم موازنہ کرنے پر نظر آئے گا کہ بعض مضمون کو خوش اسلوبی سے باندھنے میں دونوں اساتذہ دوش بدوش ہیں۔ بعض شعروں میں اکبر کی فوقیت نظر آئے گی لیکن اکثر مولانا شاد کی چستی ترکیب، حسن بندش، زور بیان، جدت تخیل، جوش و اثر علانیہ ممتاز نظر آئے گا

حقیقت یہی ہے کہ شاد کا رنگ تغزل اتنا دلکش ہے کہ ہر قسم کا مضمون ان کے طرز ادا اور انداز بیان کے سانچے میں ڈھل کر بے حد دلاویز اور تمام محاسن شاعری سے لبریز ہو جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ اکبر کی غزلوں میں جا بجا حسن تخیل، افشاء جذبات، اسالیب بلاغت، جوش بیان، خیالات عالیہ، بلند مضامین وغیرہ پائے جاتے ہیں لیکن اگر تغزل محض کے نقطۂ نظر سے دونوں اساتذہ کے کلام پر نگاہ تنقید ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ شاد کی نگاہ دوربین جن جذبات و خیالات عالیہ کے نکات تک پہنچتی ہے اکبر کے تخیل کی وہاں تک رسائی نہیں صرف اکبر پر کیا منحصر ہے میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ دور میں کوئی شاعر رنگ تغزل میں مولانا شاد کا حریف نہیں اور غزلیت کا یہ نمونہ نہیں پیش کر سکتا۔ میں دو ہم طرح غزلیں دونوں اساتذہ کے کلام پر درج کرتا ہوں اب ارباب نظر خود دیکھ لیں کہ من حیثیت، خیالات و جذبات اکبر کو شاد سے کیا نسبت ہے۔

سید صاحب۔ موازنہ ختم کرنے کے بعد شاہ صاحب نے حضرت شاد کی ایک دفعہ پھر پرزور الفاظ میں مدح سرائی کی ہے ـــــ حسن اعتقاد کی جو جھلک ان کے الفاظ میں نمایاں ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مرحوم اکبر موازنہ کی الجھن میں نہ پھنسائے جاتے اس لئے کہ موازنہ و مقابلہ تو مقابل و حریف میں ہوا کرتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ آگے چل کر دونوں اساتذہ کی دو دو ہم طرح غزلیں درج فرما کر ارباب نظر سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ دیکھیں من حیثیت جذبات و خیالات اکبر کو شاد سے کیا نسبت ہے۔

شاہ صاحب نے ان دونوں ہم طرح غزلوں میں موازنہ کی زحمت نہیں گوارا فرمائی اس لئے ہم بھی خاموش رہتے ہیں کہ ہماری کوشش مدافعانہ ہو اور اقدام شاہ صاحب ہی کے حصہ میں آئے۔ تاہم حضرت شاد کے متعلق یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انھوں نے دونوں غزلیں حضرت اکبر کی غزلوں پر کہی ہیں چنانچہ ان کی یہ دونوں غزلیں پارسال ہی معارف میں شائع ہوئی ہیں۔

اکبر

یہ ابر زلف یہ برق نظر معاذ اللہ
اگرچہ حسین ہے دلکش مگر معاذ اللہ
طلسم حسن بتاں کے نہ پوچھئے احوال
دہن کا ذکر ہی کیا ہے کمر معاذ اللہ
جناب شیخ پھر آخر بسر کروں کیونکر
جدھر اُٹھاتا ہوں آنکھیں اُدھر معاذ اللہ
جو مُنہ لگائے وہ بت شیخ بھی پڑھیں الحمد
یہ دور ہی سے ہے بس اسقدر معاذ اللہ
میں کیا کہوں شب فرقت میں مجھ پہ کیا گذری
عجیب حال رہا رات بھر معاذ اللہ
بتوں کے عشق میں کیا کچھ نہیں کیا میں نے
بہت رہی ہے لب شیخ پر معاذ اللہ

×
×
×
×
×
×
×
×

فریب چشم ہے خواں جہاں کا رنگ اکبر
مزا زبان کا فتنہ اثر معاذ اللہ

شاد

وہ چشم مست وہ ترچھی نظر معاذ اللہ
حیا ہزار بھری ہے مگر معاذ اللہ
وہ رخ ملیح وہ کافر نگاہ توبہ ہے
وہ کاکلیں وہ لچکتی کمر معاذ اللہ
جو چھپ کے پیتے ہیں کیا ان کا راز پوچھتے ہو
اُدھر زبان پہ عنیا اُدھر معاذ اللہ
خموں کے کھول دے منہ زہے کرم ساقی
میں پی تو لوں گا مگر اس قدر معاذ اللہ
ادھر اذاں کی صدا ان کی اس طرف رخصت
خدا دکھائے نہ ایسی سحر معاذ اللہ
دلوں میں زخم تو سینوں میں پڑ گئے ناسور
جناب شیخ کا وعظ الحذر معاذ اللہ
فلک سحاب کے مشکوں میں بھر کے رکھ پانی
ہمارے نالہ دل کے شرر معاذ اللہ
مریض ہجر سے قاصد پیام یاس نہ کہہ
کہاں وہ شوق کہاں یہ خبر معاذ اللہ
کہاں اتار دیا تونے اپنے مہماں کو
شبیں وہ تار بھیانک وہ گھر معاذ اللہ
طریق عشق کی منزل تو ایک رستے لاکھ
قدم قدم پہ بھٹکنے کا ڈر معاذ اللہ
تمھیں ہے شاد اسی شاعری پہ اپنی ناز
حسد کی جڑ ہے تمھارا ہنر معاذ اللہ

اکبر

وصل جاناں کو دل زار کی حسرت ہی رہی - پر میسر نہ ہوا
عمر بھر جان پہ فرقت کی مصیبت ہی رہی - تھا یہ قسمت کا لکھا
تم نے جو بات کہی میں نے دل و جان سے وہ کی - نہ کیا عذر کبھی
تم کو اس پہ بھی مگر مجھ سے شکایت ہی رہی - پھل یہ خدمت کا ملا
چشمۂ چشم سے اشکوں کی بھی موجیں نکلیں - ٹھنڈی سانسیں بھی بھریں
آتش غم کی مگر دل میں حرارت ہی رہی - نہ ہوا فرق ذرا

شاد

دل تو اک عمر سے بدنام ہے کیا اس کا گلا - کہتے آتی ہے حیا
یہ امیدیں یہ تمنا جنھیں برسوں پالا - یہ کب اپنی ہیں بھلا
وہ تری کج روشی کج کلہی کینہ وری دلبری عشوہ گری
کون غش کھا کے سر راہ گرا کون موا - پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے جو کی بھر کے نگاہ - نہ ملی دل کو پناہ
یار کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا - لاکھ روکا نہ رکا

کھائیں سو مرتبہ قسمیں کہ ہوں عاشق تجھ پر نہیں اوروں پہ نظر
بدگمانی مگر اس شوخ کی عادت ہی رہی - صاف مجھ سے نہ ہوا
ایک تم ہو کہ ہزاروں ہی کئے مجھ پہ ستم - مل کے غیروں سے بہم
ایک میں ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہی رہی کبھی شکوہ نہ کیا
دشمنوں نے تو بہت بات بنائی جا کر - کہ وہ بگڑیں مجھ پر
حال پر میرے مگر ان کی عنایت ہی رہی - کچھ کسی سے نہ ہوا
ہے تمہاری بھی عجب سخت طبیعت بخدا - رحم دل میں نہ ذرا
منزل گور میں تنہا مجھے سب چھوڑ چلے - اپنے بیگانے جو تھے
ساتھ دینے کو مگر اس کی عنایت ہی رہی - اور کوئی نہ رہا

×

×

ہمنشیں اٹھ گئے اس بزم سے اپنے اکبر - تم بھی بس باندھو کمر
نہ وہ جلسے ہی رہے اب نہ وہ صحبت ہی رہی - کیا ہے جینے کا مزا

رت بھری ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کوپل آ گئے پھولوں میں پھل
ایک اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا - اور سو کھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار - دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یونہی رونے میں کٹا - کیا کہیں جیتے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں - تاب اٹھنے کی کہاں
جامہ زیبی کا بھلا او صنم تنگ قبا - کچھ تو دامن کو جھٹکا
فتنہ خو آفت جاں سنگدل آشوب جہاں - دشمن امن و اماں
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی - بے پیئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا - اف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیر اکنکھیوں سے ہے آڑی برچھی - یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا - پھر کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں روئی ہوئی آواز ہے بھرائی ہوئی - باتیں شرمائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا - شاد قسمیں تو نہ کھاؤ

شاہ صاحب - دونوں غزلوں کے مطالعہ سے ہر اہل ذوق سمجھ سکتا ہے کہ مولانا شاد کے رنگ تغزل میں جو جوش بیان، صداقت جذبات، حسن تخیل، بلندی مضامین، سوز و گداز وغیرہ پائے جاتے ہیں

اور جو غزلیات کی جان ہیں۔ اکبر کی غزلوں میں قطعاً مفقود ہیں۔ مستزاد مذکور ہی کو دیکھ لیجئے اس میں جو محشر خیالات و طوفان جذبات و تلاطم کیفیات پوشیدہ ہیں اُردو زبان کے کسی مستزاد میں نظر نہیں آتے۔

سید صاحب خاموش ہیں اور ہم بھی خاموش ہیں۔ ناظرین خود بہتر رائے قائم کرسکتے ہیں اتنی گذارش ضرور ہے کہ الفاظ سے مرعوب نہ ہوں شعر کی عمدگی کا معیار وہ اثر ہے جو طبع سلیم پر ہوتا ہے۔

بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس ۔۔۔ ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
(غالب) کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق ۔۔۔ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش ۔۔۔ طالب زمزمہ بلبل شیدا نہ ملا

ناقدری زمانہ کی کس قدر موثر داستان ہے۔

قیس کا ذکر ہی شان جنوں کے آگے ۔۔۔ اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

شعر کے تیور دیکھنے کے قابل ہیں کیا عمدہ مصرعہ لگایا ہے۔

تری چشم فسوں گر کا اشارہ ہے یہ نرگس سے ۔۔۔ فقط نظارہ کرنے سے کوئی ساحر نہیں ہوتا

روانی و جوش بیان سے لبریز ہے۔

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی ۔۔۔ وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

کیا سادگی ہے اور کس قدر موثر ہے۔

اترا دریا میں پے غسل جو وہ غیرت گل ۔۔۔ شور امواج کو میں شور عنادل سمجھا

رعایت لفظی سے قطع نظر نہایت مناسب نغمہ پیدا کیا ہے۔

اس تمنا میں کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو ۔۔۔ ماہ نو بھی چرخ پر شکل گریباں ہوگیا

پرانی وضع کے کرتوں میں کالر کی جگہ ہلال لگتا تھا۔ حسن تعلیل دیکھئے

محبت کا تم سے اثر کیا کہوں ۔۔۔ نظر مل گئی دل دھڑکنے لگا

نیچرل شاعری کے گرویدہ اکبر کے اس شعر کو ذرا غور سے دیکھیں۔

رشک آتا ہے جو تکئے وہ سر رکھتے ہیں ۔۔۔ صاحب حس نہ کہیں ہو مرے زانو کی طرح

رشک کا کس قدر نرالا پہلو نکالا ہے

کھلیں وہ شرمگیں آنکھیں شب وصلت زباں ہوکر　　محبت کی نظر نے دی اجازت مجھ کو ہاں ہوکر

شوخی طبیعت برسی پڑتی ہے۔

مجال گفتگو کس کو ہے ان کے حسن کے آگے　　زبانیں بند کردیں ان بتوں نے بے زباں ہوکر

دیکھئے کتنے معمولی الفاظ ہیں مگر حسن نظم نے جادو بھر دیا ہے۔

نگاہیں مل گئیں تھیں میری ان کی رات محفل میں　　یہ دنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہوکر

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا۔

پھری قسمت ہوا کی آپ کی زلفوں کے صدقہ میں　　پریشاں ہوکے آئی تھی چلی عنبر فشاں ہوکر

مضمون پائمال ہے مگر اکبر کی طبیعت نے جدت پیدا کرلی۔

نہیں کوئی شب تار فراق میں دل سوز　　خموش شمع ہے خود جل رہے ہیں شام سے ہم

ہجر کی رات یوں ہوں حسرت قدر یار میں　　جیسے لحد میں ہو کوئی حشر کے انتظار میں

بھونرے ہیں مست لوٹے گل تیتریاں ہیں سوئے گل　　سب کو ہے جستجوئے گل موسم خوشگوار میں

ہر سمیع ہے اور ایسی پیاری کہ آورد کا نام بھی نہیں ہے۔

میری نگاہ شوق کا اللہ رے اثر　　معشوق بھول جاتے ہیں اپنی نہیں نہیں

مرض عشق بھی کیا چیز ہے جس سے صحت　　آرزوے دل رنجور یہی ہے کہ نہو

تعقید ہے مگر ایسی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔

دل مرا ان پہ جو آیا تو قضا بھی آئی　　درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی

بیتابیاں نصیب میں تھیں ورنہ ہمنشیں　　یہ کیا ضرور تھا کہ انھیں پہ نظر پڑے

دوسرا مصرعہ کتنے نفیس بول چال میں ہے۔

مذاق فطرت میں بس نہ جاتے جو قامت و گیسوے حسیناں　　یہ راستی سرو میں نہ ہوتی یہ سنبل تر میں خم نہ ہوتا

اللہ بچائے مرض عشق سے دل کو　　سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

ہے صاف نگاہوں سے عیاں جوش جوانی　　آنکھوں سے سنبھلتا نہیں مستانہ پن ان کا

بےخودی شباب کی تصویر اس سے اچھی آج تک میری نگاہوں سے نہیں گذری۔

کوئی اکبر سا بھی دیوانہ نظر آیا ہے کم — پھروں روتا ہے جو پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں

دوسرا مصرعہ لاجواب ہے۔ تیر او ر درد کی نشتر زنی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

سنبھالیں دل کو کہ ہم حالت جگر دیکھیں — تمام آگ لگی ہے کدھر کدھر دیکھیں

"رگ رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی"

اثر دکھانے پہ یہ جذب دل جو آتا ہے — کنویں سے حضرت یوسف کو کھینچ لاتا ہے

سورۂ یوسف کلام پاک میں ملاحظہ فرمائیے "کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را" کا جواب ہے۔

آج آرایش گیسوے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے

شوق پابوسی جاناں مجھے باقی ہے ابھی — گھاس اُگتی ہے جو تربت پہ حنا ہوتی ہے

جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے — جان کیونکر ہدف تیر قضا ہوتی ہے

نزع کا وقت برا وقت ہے خالق کی پناہ — ہے وہ ساعت کہ قیامت سے سوا ہوتی ہے

روح تو اک طرف ہوتی ہے تن سے رخصت — آرزو ایک طرف دل سے جدا ہوتی ہے

ہوں فریب ستم یار کا قائل اکبر — مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اس غزل کو جس پہلو سے دیکھئے لاجواب ہے۔

کیا پوچھتے ہو مجھ سے پہلو میں ترے کیا ہے — اب تو نہیں ہے کچھ بھی دل تھا سو کھو گیا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ میر کی زبان سے شعر ادا ہوا ہے۔

نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی — وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یوں خیال گلرخاں میں ہے منور داغ دل — جل رہا ہو جس طرح پھولوں کی چادر میں چراغ

کر رہا ہے وصف آئینہ کا جو وہ شعلہ رو — ہے یہ گویا شکر احساں سکندر میں چراغ

دیکھئے کتنے اچھوتے چراغ ہیں۔

یہی نظر ہے جو اب قاتل زمانہ ہے — یہی نظر ہے کہ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

نگاہوں کے اشارے سے جو حکم اُٹھنے کا ہوتا ہے — مجھے بھی آپ کیا درد دل شیدا سمجھتے ہیں

کس لطف کا راز و نیاز ہے۔

میں اپنے نقد دل سے جنس الفت مول لیتا ہوں — اطبا کو وزا دیکھو اسے سودا سمجھتے ہیں

پیغام آرہا ہے دل بے قرار کا   قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو مرے دل کو ہوا یہ کھٹکا   کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز + وگرنہ عاشق و معشوق رازدارانند (حافظ)

شگوفہ کھلانا = فتنہ پیدا کرنا۔ کلی کو پھول کرنا۔

خواب نوشیں سے ترا بیدار ہونا الاماں   یہ خمار نرگس مستانہ یہ آثار صبح

مری بیتابی دل پر ادا سے مسکراتے ہیں   قیامت کرتے ہیں بجلی پہ وہ بجلی گراتے ہیں

جنبش ابروے قاتل کا اشارہ ہے یہی   کام چلتا ہے جو دنیا میں تو شمشیر کے ساتھ

مری تقدیر موافق نہ تھی تقدیر کے ساتھ   کھل گئی آنکھ نگہبان کی بھی زنجیر کے ساتھ

ناتوانی مری دیکھی تو مصور نے کہا   ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ

قامت سے تیرے صانع قدرت نے اے حسیں   دکھلا دیا ہے حشر کو سانچے میں ڈھال کے

شوق وصل شعلہ خوباں کیوں نہ ہو برسات میں   ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے

دیکھئے آرزو کا پہلو کس حسن سے نکالا ہے۔

حال میری بیقراری کا بھی کچھ سن لیجئے   یہ بھی اک آویزہ ہو بجلی جو زیب گوش ہے

تا بکے دید حسیناں تا بکے وارفتگی   آنکھ جب تک نظر ہے سر میں جبتک ہوش ہے

سوال و جواب نے عمل اثر کو مکمل کر دیا۔

آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس   شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحب آغوش ہے

آئینہ کو صاحب آغوش کہنا میرے نزدیک بالکل اچھوتی بات ہے۔

کیوں نہ اپنے بل پہ نازاں ہو وہ زلف پرشکن   اس کی خود بینی کو آئینہ صفائے دوش ہے

ہے اگر امید فردا ہی پہ صرف اس کی بنا   کل نہ ہوگا آج اکبر کے جو دل میں جوش ہے

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچہ میں آکے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

دن رات کی یہ بے چینی ہے یہ آٹھ پہر کا رونا ہے　　آثار برے ہیں فرقت میں معلوم نہیں کیا ہونا ہے

(افسر میرٹھی) آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہونا ہے، یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

ناز سے دامن اُٹھاتی تھی جو اپنا لیلےٰ　　زیرلب کہتی تھی مجنوں کے گریباں کی خیر

کس قدر چلبلا شعر ہے۔

فلک جو برباد بھی کرے گا بلند ارادے مرے رہیں گے　　جو خاک ہوں گا تو خاک سے بھی سدا بگولا اٹھا کرے گا

کرو نہ کچھ فکر جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں　　گلوں سے ٹپکے گا رنگ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ اُس کو ٹوٹنے کا موقع نہ شوق گستاخیوں کا حامی　　اداؤں میں کچھ لگاوٹیں ہیں نگاہ سے ہے عتاب پیدا

کشمکش کی کتنی پیاری تصویر ہے۔

تضمین

خوب اک ناصح مشفق نے یہ ارشاد کیا　　بزم میں اس نے تعلی جو کل اکبر کی سنی

تضمین اس حسن سے کرتے ہیں کہ اصل شعر یا اصل مصرعہ اسی سلسلہ کا معلوم ہوتا ہے اور کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی

نہ تری فوج نہ شاگرد نہ پیر اور نہ مرید　　نہ تو ارجن ہے نہ سقراط رشی ہے نہ منی

کس نگیں پر ہیں ترے نقش کے آثار عیاں　　نوٹ بک تیری شکستہ تری پنسل ہے گھنی

فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں　　واہ وا کے لئے لفظوں کی دکاں تو نے چنی

خود پرستی ہے بہت خلق کی خدمت کم ہے　　دل وہی کم ہے تو ہے دل شکنی چارہ گنی

طبع میں تیری وہی خامئ حرص دنیا　　آتش خوف خدا سے نہ جلی ہے نہ بھنی

تکیہ بر جاے بزرگاں نتواں زد بہ گزاف

مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

مشرقی کو ہے ذوق روحانی　　مغربی میں ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈاروِن بولے بوزنا ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست

فکر ہر کس بقدر ہمت او ست

Darwin یورپ کا ایک زبردست حکیم جس نے تخلیق عالم کی تحقیق کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان مختلف اجسام و ہیئات میں ہوتا ہوا فیض ارتقاء سے آج آدمی بنا ہے اس کے ماتحت سب سے اخیر درجہ جس کے بعد ہم آدمی ہوئے ہیں بندر کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اور تمام حیوانات کے نسبتاً ہم عادتاً اور جسماً بندر سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ اکبر نے کس مزے سے تردید کردی ہے۔

مغرب کے معتبوں نے اسٹیج کو سنوارا　　بجنے لگا پیانو چپ ہوگیا چکارا

بیتاب ہو کے آخر یہ شیخ نے پکارا　　دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا

دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

حافظ کی نہایت مشہور غزل ہے یہ دیکھئے کہ مصرعے لگانے میں لطف یہ ہے کہ اُردو فارسی کا پیوند

بُرا نہیں معلوم ہوتا اور شعر کے اثر مصرعوں کے بعد بالکل بدل جاتے ہیں۔

گم ہیں مری نظر سے وہ ساحل دلاویز　　ناکامیوں کی موجیں بہنے لگیں بہت تیز
اسٹیمر اپنی ہم کو دیتے نہیں یہ انگریز　　کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را

فہمیدن آں معانی ہر طبع کے تواند　　لذت بیابہ آں دل کو راز ہا بداند
موجے بہ سینہ خیزد از شوق غرق ماند　　گر مطرب حریفاں این نظم من بخواند
در وجد و حالت آرد پیران پارسا را

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔

رفت دنبال ڈاروں ان شوخ　　بوزنہ ماند و آدمی گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند　　پے نیکاں گرفت مردم شد
پسر نوح با بداں بنشست ✦ خاندان نبوتش گم شد

شیخ جی دیر میں بیٹھے ہوئے گاتے تھے بھجن　　نگراں سوے برہمن تھے بشوق بھوجن
میں نے ٹوکا تو لگے کہنے مناسب نہیں کد　　ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند
تھی مرے پیش نظر وہ مس تہذیب پسند　　کبھی وہسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری ایک زغند　　پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا قید میں بند
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

Whisky ایک انگریزی شراب۔

کوئی کہتا ہے رکھو صاحب سے میل　　کہ آخر کی گھر میں رہے ریل پیل
کسی کی صدا ہے کہ ہند و بھلے　　مری انجمن بھی اسی رُخ چلے
کسی سمت کونسل کی ہے دل میں چوٹ　　عوض لٹھ کے آپس میں چلتے ہیں ووٹ
کسی سر میں ہے لیڈری کی ہوس　　کوئی شہد اسپیچ کی ہے مگس
کوئی شوق تحقیق میں غرق ہے　　کوئی راہ تقلید میں برق ہے

کسی کو ہے مضمون نگاری کی دُھن — کوئی چندہ دینے کو سمجھا ہے پُن
کسی کو عمارت بنانے کا شوق — کسی کو نمود و نمائش کا ذوق
کسی کو کوئی ٹوک سکتا نہیں — سڑک کو کوئی روک سکتا نہیں
جدھر بحر ہستی بہاے ہمیں — خدا سے دعا ہے کہ سب خوش رہیں
مگر شیخ سعدی کی ہے ایک بات — مسلمان کو ہے فرض ادھر التفات

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

دیکھئے تمام کی سیر کرکے کس آسانی سے منزل مقصود اور مرکز اصلی پر آگئے ہیں۔

اجسام کے علوم کا کرتے ہیں خود عمل — اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس
ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے ہیں واہ واہ — میں نے تو کر دیا تیرا رتبہ بلند تر
از صحن خانہ تا بہ لب بام از ان من — وز بام خانہ تا بہ ثریا از ان تو
خود فن حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر — میرے لئے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل
اظہار ناخوشی پر وہ فرماتے ہیں کہ دیکھ — تیرا ہی مشغلہ ہے بہت صاف و بے ضرر

واں اشتر ضعیف و لگد زن از ان من
دیں گربہ مصاحب بابا از ان تو

یہ نظم Blank Verse میں یعنی بلا قافیہ لکھی گئی ہے۔

جو اڈورڈ نے چھوڑا شاہی کا چارج — ہوئے جلوہ آرا شہنشا جارج
خوشی ان کی ہے اور اُن کا الم — دو دل ہو رہی ہے زبان قلم

کیا حسن تعلیل ہے۔

لحد بھی ہے اور مسند جاہ بھی — مبارک سلامت بھی ہے آہ بھی
بڑے شور ایوان دولت میں ہیں — وہ تربت میں ہیں اور یہ حیرت میں ہیں
بگڑتا ہے دنیا میں جو گھر بنا — مسلسل ہے رفتا موج فنا

کس قدر ڈھلا ہوا مصرعہ ہے۔

خوشی کی بھی لیکن ہے بہم نمود — بلا ہے تو نعمت کا بھی ہے ورود
ہمیں است آئین چرخ کہن — چہ خوش گفت سعدی شیریں سخن

یکے را چو پایاں رسد دور عہد
جواں دولتے سر بر آرد زمہد

انور سے کہا میں نے کہ خاموش ہو کیوں تم — تقریر نہ تحریر نہ غصہ نہ خوشامد
بابو کے نہ دمساز نہ یاروں کے ہم آواز — ماہی میں نہ ممتاز نہ اشتر میں سر آمد (اکبر)
کہنے لگے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے — "کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد (سعدی)
اگر ہیں بھی باقی کچھ اب دردمند — تو لپس پھینکتے ہیں وہ لفظی کمند
بہ یک لکچر آواز ہرہ بلند — بہ یک بزم مقدار چندہ دوچند
کہاں اب وہ دل اور طبع بلند — جنھیں کہہ گئے سعدی ارجمند

"بیک نعرہ کوہ ہے ز جا بر کنند
بیک نالہ ملکے بہم بر زنند

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی — من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ — من ترا "باجی" بگویم تو مرا باجی بگو

لفظوں کے ذرا سے تبدیل کر دینے سے کیا عمدہ نقشہ کھینچ دیا ہے۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ ادھر نہ ادھر — زیادہ حد سے دئے سب نے پانوں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمینڈ بھی چھو نہیں سکتے — ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک — ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلےٰ و فرقت لیلےٰ

یہ تسبیح و تکبیر و حمد و دعا — ہے نور دل بندگان خدا

یہ پلٹن کے گورے ہر اتوار کو سجاتے ہیں گرجا کے در بار کو
اگر یہ کہو ہیں وہ بالکل وحوش تو دیکھو کہ عابد ہیں حضرت لیٹوش
جب ایڈورڈ ہفتم ہوئے تھے علیل تو کی قوم نے یاد رب جلیل
کمی کی نہ اسٹیٹ نے خرچ میں دعائیں ہوئیں دھوم سے چرچ میں
وہ جنرل کہ دبتی تھی جن سے زمیں ہیں گرجا میں راکع مع الراکعین
ہوئے جنگ سے زار اندیشہ ناک گرے سجدے میں پیش اللہ پاک

سر بادشاہان گردن فراز
بدرگاہ او بر زمین نیاز

بتان خود فروش آخر فرستادند ایں بلہا طلب کردند زر چندانکہ خوں افتاد در دلہا
نشاط طبع برہم شد شکست آں رنگ محفلہا الا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل وے افتاد مشکلہا

ادھر بے علم دیں ہے نور ایماں قلب سے زائل ادھر کالج کا بیڑا پار کرنے پر ہیں دل مائل
ادھر ہے نوکری دشوار جکڑ میں ہے ہر سائل شب تاریک بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساراں ساحلہا

نہ قید شرع باقی ہے نہ آزادی کی ہے کچھ حد نہیں کچھ گفتگو اس بات میں یہ نیک ہے یا بد
بزرگوں کا بھی فتوے ہے کہ پڑھ قانون سرسیّد بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

سیّد در اصل سیِّد ہے، حرکت قافیہ میں اساتذہ کو اختلاف ہے مگر اکبر نے ضرورت سے اور بالعمد استعمال کیا ہے

ہوئی جو مجھ سے یہ فرمایش بہت طناز کہ فن شعر میں تو آج ہے بہت ممتاز
لگا دے اس پہ کوئی مصرعہ حسین و نفیس "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز
کہا یہ میں نے کہ ہے قید حسن و خوبی کی تو سن یہ شعر نشاط آور و نگاہ نواز
پہن لے سایہ مری جان اُتار کر پشواز زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز
اہل یورپ کے ساتھ یورپ میں چکھی سیّد نے ایک دن کاری

خانساماں نے کان میں یہ کہا — آپ تو علم سے نہیں عاری
پڑھئے کوئی دعاے اکل طعام — دین سے بھی رہے وفاداری
تب یہ اشعار حضرت سعدی — ہوئے ان کی زبان پر جاری
اے کریمے کہ از خزانۂ غیب — گبر وترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

محض لطف تضمین کی غرض سے یہ کہانی گڑھی گئی ہے ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

نگرانی مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی — تند[1] موج لب ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی
بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی — بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

کرتی ہے خلق کو بیلائے لبرٹی[2] مفتوں — ہند کے دل کو لبھالیتا ہے بل[3] کا یہ فسوں
لاجپت[4] بھی ہوئے شاید کہ اسیر ومحزوں — پاے کوباں[5] کوئی زنداں میں بنا ہے مجنوں
آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

پیشتر اس سے طبایع کے نہ تھے یہ پہلو — کہیں اشنان[6] کی تھی لہر کہیں موج وضو
اے مس سیمتن و ماہ جبین و گلرو — تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

[1] سخت تیز [2] ارادے [3] بل۔ پتلی گھر۔ ایک زبردست انگریزی فلسفی [4] لالا لاجپت راے شیر پنجاب۔ [5] پاؤں کوٹنے پا پیٹنے والا [6] نہانا۔ غسل۔ سیاست والے جو چاہیں وہ معنی پیدا کریں ورنہ کوئی خاص پہلو مراد نہیں ہے۔

تاریخ گوئی

دھرم پور آج کیوں اس درجہ وقف حسرت و غم ہے — یہ کیا باعث کہ برپا ہر طرف اک شور ماتم ہے
کنور عبدالعزیز اک نوجواں ماں باپ کا پیارا — گل باغ ریاست اور ہر اک کی آنکھ کا تارا
اسے دور فلک نے ناگہاں تیر اجل مارا — کسی کا بس نہیں اللہ کی مرضی میں کیا چارا

اگر تاریخ رحلت تم کو لکھنی ہے صفائی سے
رہو ساکت ملا دو صبر کو داغ جدائی سے

۲۹۲ ۱۰۲۳ ۱۳۱۵ھ

حضرت اکبر نے تاریخیں بہت زیادہ نہیں کہیں مگر جتنی کہی ہیں نہایت عمدہ ہیں۔

آں نونہال خوبی ماہ دو ہفتہ من — در نو بہار عمرش رفت از قضائے ہستی
پیمانۂ مے غم سرشار و بیہشم کرد — رفتم سر مزارش در بے خودی و مستی
آہے ز دل کشیدم گفتم کہ اے مہ من — با ایں کمال و رفعت حیف است میل پستی
آخر چہ شد کہ رفتی در رونق گلستاں — در موسم بہاراں رنگ چمن شکستی
ناگہ ندائے از غیب آمد بگوش جانم — کاے بے خبر زا یماں اے محو بت پرستی
آں را کہ شعلہ خوانی واں را کہ برق دانی — آں جملہ بود رنگ نقش طلسم ہستی
عبرت کشود چشمم حیرت بہ ہوشم آورد — در سینہ دفن کردم جوش و خروش مستی

تاریخ فوت گفتم در صنعت عجیبے
بوٹا بروں شد اکبر از گرد باغ ہستی

۴۰۹ ۲۰۹ ۲۰۹ ۱۲۹۳ء

دیکھئے کتنی اچھوتی صنعت میں تاریخ کہی ہے اور پھر رعایات لفظی کا خیال بھی رکھا ہے۔

شبلی ہی اُٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس — شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اوداس
ڈھونڈھا جو دل نے مادۂ سال انتقال — پھرنے لگا نگاہ میں یار سخن شناس

۱۳۳۲ ہجری

تاریخیں کہتے میں ہاتف غیبی اور سروش غیب کی امداد کے بغیر شاعر بہت کم مصرعہ تاریخ کہتے تھے اکبر کی اکثر تاریخیں اس رسم سے بے نیاز ہیں

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظروں میں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوشگوئی یہ ذوق معرفت — یہ طریق راستی خودداری بے تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے — باخدا تھے اہل دل سے صاحب اسرار تھے
مادر مخدومہ اقبال جنت کو گئیں — چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو — نعمت عظمےٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو

اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے (مسٹر محمد اقبال)
سال رحلت کا بیاں منظور اسے فی الحال ہے

واقعی مخدومہ ملت تھیں وہ نیکو صفات — رحلت مخدومہ سے پیدا ہے تاریخ وفات
۱۳ ھ ۳۲

اس تاریخ سے ایک نہایت عمدہ پہلو اکبر کے کیریکٹر کا ظاہر ہوتا ہے، حق گوئی اور نکتہ سنجی کے علاوہ صفائی باطنی اور اعتراف کمال معاصرین میں ان کو کبھی کوئی باک نہ تھا۔

فخر ملت تھے مہدی مرحوم — کیوں نہ غم ان کا ہو ہر اک دل کو
سال رحلت کا مادہ اکبر — مومن پاک بے نظیر لکھو
۱۳ ھ ۳۱

رئیس جائس ضلع رائے بریلی وکیل الہ آباد۔

تعلیم

رنگ چہرہ کا تو کالج نے بھی رکھا قائم　　رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

ہماری موجودہ طرز تعلیم میں مذہب روحانیت تزکیہ نفس وغیرہ کے نصاب کی بہت کمی ہے۔

علوم دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے　　زبان گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

یہ پاس اور وہ پاس نہ موجد یہ اہل زر　　اخبار میں جو چھپ گئے ارماں نکل گیا

ہماری تعلیم اور فراغ تعلیم کے بعد غربت کی کیسی اچھی تصویر ہے پھر صنعت و حرفت کی ترغیب بھی ہے

کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو　　میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

Spencer اور Mill دونوں یورپ کے زبردست فلسفی گذرے ہیں۔

انجن آیا نکل گیا زن سے　　سن لیا نام آگ پانی کا

علم پورا ہمیں سکھائیں اگر　　تب کریں شکر مہربانی کا

ٹاٹا کمپنی کو جو دقتیں تشہیر کار، نظم فروخت وغیرہ میں ہوتی ہیں ان کو کون نہیں جانتا اس کے علاوہ ہم کو صنعتی اور حکمی تعلیم نا مکمل ملتی ہے۔

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے　　جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر　　گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

مضامین متعلقہ ہندوستان حصہ اول ملاحظہ فرمایئے۔

ان مدعیوں کا طرز عمل اکبر یہ شہادت دیتا ہے　　پڑھنے کو کتابیں پڑھ لی ہیں سمجھے یہ مگر کچھ خاک نہیں

میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس شعر کی تطبیق بہت سے سند یافتہ حضرات پر ہوتی ہے۔

فلسفہ کی نود باطن کر نہیں سکتیں　　کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

پیچیدہ دلیلیں مسائل کے لئے جاتے ہیں انگلینڈ　　زلفوں میں الجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے　　مگر یونہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

دیکھئے کمی تعلیم مذہب کو کس عمدگی سے دکھایا ہے آب زمزم کے چند گھونٹ خم شراب میں ڈال دئے جائیں تو بیکار ہیں۔

ایسی منطق سے تو دیوانگی بہتر اکبر — کہ جو خالق کی طرف دل کو جھکا ہی نہ سکے
فیضِ تعلیم سے اب اس کی سمجھ ہی نہ رہی — دل تو بڑھ جاتا تھا اجداد کے افسانے سے
بہت آسان ہے تشریح منطق کے نتیجوں کی — بہت مشکل ہے لیکن فرق کرنا حق و باطل میں

واقعی یہ صلاحیت صرف علم پر نہیں بہت کچھ عمل پر موقوف ہے۔

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں — عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

غیر ملکوں میں جاکر اعلیٰ تعلیم و اعلیٰ فنون حاصل کرنے کی کتنی موثر تحریک ہے۔

علم و حکمت میں ہو اگر خواہش فہیم — سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ایم
شادی نہ کر اپنی قبل تحصیل علوم — بت ہو کہ پری ہو خواہ وہ ہو کوئی میم

Fame شہرت۔عزت Aim ۔نصب العین۔

تکمیلِ درس کے لئے شادی کر لینے سے حقیقتاً بہت سی رُکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

خدا علیگڑھ کے مدرسہ کو تمام امراض سے شفا دے — بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے
کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال عزت سے بڑھ رہے ہیں — شوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے
ہر اک ان میں کا بیشک ایسا کہ آپ اسے چاہتے ہیں جیسا — دکھائے محفل میں قد رعنا جو آپ آئیں تو سر جھکا دے
فقیر مانگے تو صاف کہدیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا — قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے
بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ — تمام قوت ہے صرف خواندن نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے
نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالسی[1] ہے — الکٹرک لائٹ[2] اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے
لطیف و خوش وضع چست و چالاک صاف و پاکیزہ شاد و خرم — طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے
نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و درد مندی — یہ کہکے لیتے ہیں سب سے پہلے ہمیں جو تم دو تمھیں خدا دے
انھیں اسی بات پر یقیں ہے کہ بس یہی اصل کار دیں ہے — اسی سے ہوگا فروغ قومی اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکان منزل کے سب مکیں ہیں انھیں ابھی تجربے نہیں ہیں — خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں — ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے

---

[1] Policy مصلحت [2] Eleetric Light برقی روشنی۔

فریب دے کر نکالے مطلب سکھائے تحقیر دین و مذہب　　مٹا دے آخر کو وضع ملت نمود ذاتی کو گو بڑھا دے

یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم و حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

فیض کالج سے جوانی رہ گئی بالائے طاق　　امتحاں پیش نظر اور عاشقی بالائے طاق
وہ چراغوں سے ہیں جلتے ایسے ہیں روشن ضمیر　　کہتے ہیں رکھئے پرانی روشنی بالائے طاق۔

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل　　تمہارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

سائنس کا اکتشاف ہے کہ آفتاب میں بہت سے داغ پڑے ہوئے ہیں۔

ظاہر ہیں اگرچہ راز سربستہ ہے　　مضمون لطیف و خوب و برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علیگڈھ کالج　　گلدان میں مسلموں کے گلدستہ ہے
غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا　　محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی　　کالج میں آکے کانوکیشن کو دیکھئے

Convocation = جلسہ تقسیم اسناد۔

لیموں کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے　　اب کاغذی ترقی فیشن کو دیکھئے

ہلکے چھلکے والا لیمو۔

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رک نہیں سکتی　　کسی سے مشرق مغرب کی سازش رک نہیں سکتی
وہ نزلہ رک نہیں سکتا یہ پچشں رک نہیں سکتی　　بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رک نہیں سکتی

مذاق قوم بیگانہ تھو اللہ اکبر سے
یہ نقش جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

دست فلک سے ہند کی خلقت بہت پٹی　　جو کچھ تھی اس کی عظمت و وقعت وہ سب مٹی
اس کی دوا قناعت و نیکی ہے بس فقط　　ہاں مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا　　قومی خصلت کا سر سے اٹھا سایہ
کہتے تھے ولد کو لوگ سر لابیہ[1]　　سٹر للماسٹر کا اب وقت آیا

---

[1] الولد سر لابیہ بیٹا وہی قدم بقدم ہو جو باپ کے (انیس)

طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا — ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا
سعادت روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں — کہ کالج میں کوئی اس بات کا ماہر نہیں ہوتا
وسعت ہے در علم میں ہے راہ عمل بند — ہے صاف سڑک پانوں پہ لیکن ہے شکنجہ

علم بے عمل بیکار ہے۔

کالج نے بٹھا دیا ہے مانند شجر — کچھ پھول پھلے تھے اس نے پھلنے نہ دیا

فلک نے۔

طفل مکتب کہ سخنہا بزباں می گوید — شکوہ کم کن کہ چنیں گفت وچناں می گوید
طبع او فونوگراف است وسر دوش سبقش — انچہ بستند بر ونقش ہماں می گویند
درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم"

Phonograph ایک انگریزی باجا ہے جو کوک دینے سے آپ سے آپ بجتا ہے۔

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں — مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کے فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل وتمیز — اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں
اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں — جو اہل نظر ہیں اس سے شرمندہ ہیں
حکام کی ہے یہ صرف عیسے نفسی — اعضا کالج کے کچھ اگر زندہ ہیں
خواہاں نوکری نہ رہیں طالبان علم — قائم ہوئی ہے رائے یہ اہل شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی — عہدوں سے آرہی ہے صدا دور دور کی

واقعات عالم شاہد ہیں کہ اب بیس بیس کی غیر مستقل ملازمت کے لئے صدہا ایم۔اے۔بی۔اے چکر کھاتے رہتے ہیں۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہوں
ذی علم ومتقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم — اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہوں

اُستاد جی، مکار شریر بد وضع

مناسب ہے نئی تعلیم نسواں — یہی راہ آپ اب بے ترّدو کرلیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات — میاں بدلے تو بیوی کیوں نہ بدلیں

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دوائے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

آج مغرب کے عمدہ رسائل دیکھئے باکمال معلمین اکبر کی رائے سے متفق ہیں۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے وہ لیبزی[1] اور ناچنے کو ریڈی[2]
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

سعدی علیہ

یکے ذی علم در اسکول روزے — گلے خوشبوے در حمام روزے
فتاد از جانب پبلک بدستم — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی — بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ پیش اعتقادات تو پستم — کہ از بوے دلاویز تو مستم
بگفتا مسلم مقبول بودم — بگفتا من گل ناچیز بودم
وے یک عمر با ملحد نشستم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال نیچری درمن اثر کرد — جمال ہمنشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں شیخم کہ ہستم — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

حافظ شیراز کا کیا پوچھنا تھے خوش بیاں — ان کا یہ مطلع ہے ابتک انجمن میں برزباں
"دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیر ما — چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما"
حضرت اکبر بھی لیکن اس زمانے میں ہیں فرد — ان کا یہ مطلع کوئی پڑھتا تھا کل باآہ سرد
دوش از صحن حرم آمد بہ کالج قوم ما — دیدنی گردیدہ است اکنوں صلوٰۃ وصوم ما

میرے عزیز ہیں شیعہ میں کس طرح یہ کہوں — کہ میں ہوں خوش جو ہوئی ان کی درسگاہ[3] جدا
دلی دعا ہے مگر یہ کہ رکن قوم رہیں — گریجویٹ وہ ہوں سب کے ساتھ خواہ جدا
بنائے کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا — وہی ہے منزل مقصود گو ہے راہ جدا
برائے دولت و آنر[4] ہے ایک ہی مرکز — نہیں ہے اب بھی طریق حصول جاہ جدا

---

[1] سست Lady [2] تیار چست Ready [3] شیعہ کالج لکھنؤ کی طرف اشارہ ہے۔ [4] آنر۔ عزت

یہ دونوں سایہ الطاف مغربی میں ہیں
نہیں ہے فضل الٰہی سے بادشاہ جدا

جو نسخہ تھا رزولیشن کا ہے ادھر بھی وہی
نہ کوئی حصن جدا ہے نہ ہے سپاہ جدا

یہ دونوں اب بھی بدستور پیر بھائی ہیں
نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ جدا

ٹرین ایک ہے پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہیں
کہ اپنا بیگ سنبھالیں ملے پناہ جدا

وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج
نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جدا

شب وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت
جنھیں ہے ہجر وہ کر لیں گے اپنی آہ جدا

عجب نہیں جو بلندی و اتحاد بڑھے
دکھائے رنگ جو دنیا کا اشتباہ جدا

ہزار دور ہوں اپنے جو ہیں وہ اپنے ہیں
کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جدا

مگن ہیں ٹیچر و انجینیر رہے ذاکر
وہ کر ہی لیں گے کسی طور سے نباہ جدا

ثواب نیک خیالی بھی پائے گا اکبر
سوسائٹی میں بزرگوں کی واہ واہ جدا

انساں یا بہت سے دلوں کو ملا سکے
یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے

ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے
اس چٹائی پہ نمازیں پڑھیں حسب دستور

چھوڑیئے آپ یہ ہنگامۂ تعلیم جدید
کاٹ ہی دے گا کسی طرح خداوند غفور

بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انسان ہے ناتمام

بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام

تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسب حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام

سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنا ہے مدرسہ کی کر خدا کا نام

صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

---

[1] شیعہ سنی [2] تنبیہ کرنا [3] بے خود۔ مسرور [4] استاد Teacher [5] ماہر Engineer
[6] ذاکر۔ ذکر حسین کرنے والے۔ مجلس پڑھنے والے [7] مدنی محفلیں Society [8] نطرت Nature

دکھلا دیا زمانہ کو زور دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احتشام
سرمایہ میں کمی تھی سہارا کوئی نہ تھا
سید کا دل تھا در پئے تکمیل انتظام
آخر اُٹھا سفر کو وہ مرد خجستہ پے
احباب چند ساتھ تھے ذی علم و خوش کلام
قسمت کی رہبری سے ملی منزل مراد
فرماں روائے ملک دکن کو کیا سلام
حالت دکھائی اور ضرورت بیاں کی
خوبی سے التماس کیا قوم کا پیام
رحم آگیا حضور کو حالت پہ قوم کی
پھر کیا تھا۔ موج زن ہوا دریائے فیض عام
ماہانہ دو ہزار کیا اک ہزار سے
امید سے زیادہ عطا تھی یہ لاکلام
کیا وقت پر ہوئی ہے کہ بے احتیاج فکر
تاریخ اپنی آپ ہے فیاضی نظام ۱۸۹۲ء

میں نے اس نظم کو تاریخ گوئی کے سلسلہ سے اس واسطے جدا کر لیا ہے کہ تاریخ محض برائے بیت ہے اصل تو سید صاحب کی تعلیمی کارگذاریوں کا اعتراف مدنظر ہے۔ ایک عام غلط فہمی لوگوں میں یہ ہے کہ اکبر سید صاحب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں مگر غور سے دیکھئے تو یہ فرضی خیال حقیقت سے بہت دور ہے ان کے اکثر شعر آپ کو سید کی تعریف میں اور ان کی خدمات کے اعتراف میں ملیں گے۔ کہیں کہیں طعن بھی ہے مگر ذات سید پر نہیں بعض مسائل میں حد سے زیادتی پر ہے یا غلط معنی سمجھنے والے تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنے ہیں۔

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے
دنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے
عزت کا ہے نہ اوج نہ نیکی کی موج ہے
حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے
اس طرز تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن
لاحول باپ کی ہے تو ماؤں کی نوج ہے
مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

Church کلیسا انگریزوں کا معبد

یہی سبب ہے اب ان کی باتوں پہ کان دھرتے نہیں ہیں لڑکے
کھنچا نہ دوست مولوی سے نہ تھا یہاں کوئی کان ایسا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے
خزانہ بن گیا یورپ کی[2] داستوں کا
تعلیم اونچے درجہ کی ہوتی نہیں نصیب
پھر گھر میں بیٹھ کر بجز اے بی[1] کے کیا کریں

[1] حرف تہجی [2] تخاطب۔ ڈاکٹری وغیرہ کی سندوں کے لئے باہر کی یونیورسٹیوں کی احتیاج آج بھی باقی ہے۔

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو — کس کو سونپیں تمھیں اللہ نگہبان رہے

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں — بزا خفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

یہ اتنی ستر پوشی تیری اے شرقی غنیمت ہے — دیے جا چندہ بس تعلیم کی غرقی غنیمت ہے

یہ اتنی گوشمالی طفل مکتب کی نہیں اچھی — زباں آتی ہے اس کو سچ ہے لیکن کان جاتا ہے

ماسٹر ہیں پر نوع میں لڑکوں کی شامت دیکھئے — اُن کا فوٹو[1] لیتے ہیں پڑھتے نہیں یسین ہائے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

وضع وروش اطفال کی ہے قوم پر بار گراں — رسموں کا شکوہ اک طرف مذہب کا رونا اک طرف

کہتے ہیں لڑکے بھی مگر کالج سے فرصت ہے کہاں — یہ ساری باتیں اک طرف اور پاس ہونا اک طرف

تعلیم دختران سے یہ امید ہے ضرور — ناچے وہی خوشی سے خود اپنی برات میں

بعض جگہ اکبر اظہار رائے میں حدود سے باہر ہو جاتے ہیں۔

کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب — دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

Fail ناکامیاب۔ Pass کامیاب۔

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے — رہیے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

یہ ان کا کورس[2] کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے — مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں سے دعا کہئے

آئے دن نصاب زیادہ اور قابلیت کم ہوتی جاتی ہے۔

دل کو جنبش نہیں چلتی ہیں زبانیں بے سود — بے عمل علم کی تکرار سے کیا ہوتا ہے

ہزار آرائشیں صدقے ہیں اس کی سادہ وضعی پر — نہیں محتاج فیشن علم نے جس کو سنوارا ہے

توپ سر کی پروفیسر پہونچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

اک علم تو ہے بت بننے کا اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اک علم کی سب دیتے ہیں سند اس علم میں ماہر کون کرے
جب علم ہی عاشق دنیا ہو پھر کون بتائے راہ خدا
جب خضر اقامت[3] پہ ہوں فدا تائید مسافر کون کرے

---

[1] عکسی تصویر [2] Course نصاب [3] ٹھہر جانا۔

شکر ہے سنی و شیعہ کا ارادہ نیک ہے — طرزِ طاعت دو سہی ترکیب کالج ایک ہے
گھر میں گو یہ فرق ظاہر ہو کہ حلوا یا پلاو — خوانِ مغرب پر مگر دونوں کے آگے کیک[1] ہے

علیگڈھ کالج اور شیعہ کالج کی طرف اشارہ ہے غالباً یہ شعر ۱۹۱۳ء میں کہا گیا ہے جب شیعہ کالج کی تجویز آل انڈیا شیعہ کانفرنس میں طے ہو چکی تھی۔

ہیں مست اس مزے میں جو ہم نے چکھ لیا ہے — صراف کی نظر نے ہم کو پرکھ لیا ہے
اغیار کے عمل کو ہوں گے کچھ اور میداں — ہم کو تو اب فلک نے کالج پہ رکھ لیا ہے
نہ بھول شہرِ خموشاں کا نقشہ اے کالج — خیال رکھ کہ یہی ہسٹری کی بستی ہے
کل واقعاتِ دہر کہاں ہسٹری میں ہیں — فوٹو ہے صرف سطحِ پیشِ نگاہ کا
وہ بھی فقط خیالِ مصنف بہ قیدِ خود — کیا بن سکے چراغ صداقت کی راہ کا

اکبر کی وسعتِ نظری اور ذوقِ تحقیق پر عش عش ہوتا ہے۔ عام طور پر آج کل کی ۹۰ فیصدی تاریخیں[2] انھیں آلائشوں سے لبریز ہوتی ہیں۔

(تعلیم نسواں ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے)

تعلیم عورتوں کو بھی دینا ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے — اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے
ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندوبست — چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت — جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت — ہو وہ طریق جس سے ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علومِ ضروری کی عالمہ — شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
مذہب کے جو اصول ہوں اس کو بتائے جائیں — باقاعدہ طریقِ پرستش سکھائے جائیں
اوہام جو غلط ہیں وہ دل سے مٹائے جائیں — سچے خدا کے نام کے دل میں بٹھائے جائیں
عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے — اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے
تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام میں — خالق پہ لو لگائے گی وہ اپنے کام میں

---

[1] Cake کیک = انڈے کی انگریزی مٹھائی [2] تاریخ عالم

خیرات ہی سے ہوگی غرض خاص و عام میں
اس کو سکھایا جائے یہ واضح کلام میں

اچھا برا جو کچھ ہے خدا ہی کے ہاتھ ہے
نیکی اگر کرے گی تو فطرت کے ساتھ ہے

تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے
دیوار پر نشاں تو ہیں واہیات سے

یہ کیا زیادہ گن نہ سکے پانچ سات سے
لازم ہے کام لے وہ قلم اور دوات سے

گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جوڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

کھانا پکانا جب نہیں آتا تو کیا مزا
جوہر ہے عورتوں کے لئے یہ بہت بڑا

لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا
مطبخ سے رکھنا چاہئے لیڈی کو سلسلا

وقت آ پڑے تو گاڑھے گزی میں بھی عذر کیا
گھر کے لئے طعام پزی میں بھی عذر کیا

سینا پرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر
درزی کی چوریوں سے حفاظت کی ہو نظر

عورت کے دل میں شوق ہے اس بات کا اگر
کپڑوں سے بچے جاتے ہیں گل کی طرح سنور

کسب معاش کو بھی یہ فن ہے کبھی مفید
اک شغل بھی ہے دل کے بہلنے کی بھی امید

سب سے زیادہ فکر ہے صحت کی لازمی
صحت نہیں درست تو بیکار زندگی

کھانے بھی بے ضرر ہوں صفا ہو لباس بھی
آفت ہے ہو جو گھر کی صفائی میں کچھ کمی

تعلیم کی طرف ابھی اور اک قدم بڑھیں
صحت کے حفظ کے جو قواعد ہوں وہ پڑھیں

پبلک میں کیا ضرور کہ جاکر تنی رہو
تقلید مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو

اس شعر کے بعد سے طرز تخاطب بدل گیا ہے اسلئے اب براہ راست عورتوں سے مخاطب ہے۔

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
اُن کی طلب کی حرص میں سارا جہان ہے

اکبر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے
دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب
"آج" اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا "کل" خراب

اعتدال پسندی جوہر عمل ہے۔ آج = زمانہ حال۔ کل = زمانہ مستقبل۔

کالج واسکول کی بجتی ہے ہر سو تومڑی　　　چارو ّنے آٹھ ہیں اور خاکس معنی لومڑی

نزول وحی مغرب نوجوانوں پر ہے اے اکبر　　　زبانیں کالجوں کی کھل گئیں اب آپ چپ رہئے

ماسٹر کی بحث اگر مانیں نتیجہ ہے یہی　　　اب ہیں اچھے جانور پہلے بُرے انسان تھے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

آج کل وطن پرست اور قابل حضرات کے انھیں شکایتی طویل مضامیں سے فضائے ہند گونج رہی ہے۔

تصوف

خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ　　تو ذرہ ذرہ عالم ہے آشنا میرا

خداشناسی کے بعد واقعی عالم شناسی نہایت معمولی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا بنتا تھا منصور اس لئے مشکل یہ پیش آئی　　نہ کھنچتا دار پر ثابت اگر ہوتا خدا ہونا

بننے اور ہونے میں کتنا عظیم الشان فرق ہے

دلیل خود بیں سے پوچھتی ہے کہ ہم مسلم مگر خدا کیا　　دل اس کے عاشق سے کہہ رہا ہے کاش کے ہوتے یا سوا کیا

اللہ و غیر اللہ کے نازک مسئلہ کو عاشقانہ رنگ میں کس عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔

جو تمہارے لب جاں بخش کا شیدا ہوگا　　اُٹھ بھی جائے گا جہاں سے تو مسیحا ہوگا

جیسے حضرت عیسےٰ۔

غنچہ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا　　میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

سرشاری کا نیا اثر ملاحظہ فرمائیے۔

اک عکس ناتمام پہ عالم کو وجد ہے　　کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

صنعت اور صانع کا امتیاز دکھایا ہے۔

عالم فطرت پہ ہے میری نظر بھی اے حکیم　　فرق یہ ہے کہ تجھ کو عقل آئی مجھے حال آگیا

حال بھی عقل سے کم نہیں عارف ہی کو سچے طور پر حال آسکتا ہے۔

انتشار اہل معنے فیض سے خالی نہیں　　بوے خوش پھیلی اگر غنچہ پریشاں ہوگیا

فریب عقل ظاہر بیں ہے یہ سب ورنہ اے اکبر　　ہمیں فانی ہمیں باقی ہمیں پنہاں ہمیں پیدا

ہر شخص اس شعر کے معنی اور لطف بقدر عقل و ادراک لے سکتا ہے عجیب عالمگیر بات ہے۔

ہوش بھی بار ہے طبیعت پر　　کیا کہوں حال ناتوانی کا

آتا ہے وجد مجھ کو ہر دین کی ادا پر　　مسجد میں ناچتا ہوں ناقوس کی صدا پر

رواداری کا بہترین سبق اور بے خودی و معرفت کا دلچسپ ترین درس ہے۔

رند عالی مقام ہے اکبر　　بو ہے تقوے کی اور شراب کا رنگ

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مری ہستی ہے خود شاہد وجود ذات باری کی　　دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

ثبوت خالق میں بہترین شعر ہے۔ یورپ کے فلاسفہ متقدمین و متاخرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ خود اپنے وجود کے علم سے انسان بے خبر نہیں ہو سکتا۔

مقام بیخودی ہیں آرزو کیا عرض مطلب کیا　　وہاں یہ دل نہیں ہوتا ہے یہ عالم نہیں ہوتا

پھر کیا عالم ہوتا ہے یہ تو وہی جانے جس پر گذری ہو۔

ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلی پائی　　دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

فدا سو جان سے ہوتا ہوں پروانوں کی ہمت پر　　چلے جاتے ہیں لیکن شمع سے لپٹے ہی جاتے ہیں

دل شکستہ ہوں مگر دل میں خدا کا نور ہے　　یہ وہ ویرانہ روشن جس میں شمع طور ہے

سمجھے وہی اس کو جو ہو دیوانہ کسی کا　　اکبر یہ غزل ہے مری افسانہ کسی کا

پہنچی ہو نگہ عالم مستی میں فلک پر　　ہم سمجھے مہ نو کو بھی پیمانہ کسی کا

فطرت کا قاعدہ ہے کہ جیسے جذبات ناظر ہوتے ہیں ویسی ہی چیزیں اس کو نظر آتی ہیں۔

نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں　　بلبل کی طرح گل بھی ہے دیوانہ کسی کا

گل کو دیوانہ کہہ کر محبوب گل کی لطافت و عظمت کتنے لطیف پیرایہ میں دکھائی ہے۔

اہل دل کو ذکر قمری سے یہ آتی ہے صدا　　باغ دل میں چاہئے سرو قد و لجوے دوست

قمری ایک مشہور چڑیا جو سرو کی عاشق ہے ذکر قمری صوفیوں کے ایک طریقہ ذکر کا نام ہے۔

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے　　رنگ چمن فنا سے گھبراتا ہے

کہتی ہے نسیم آکے راز فطرت　　سنتے ہی پیام دوست کھل جاتا ہے

دیکھئے بند رہنے اور کھلنے کی وجہ کتنی لطیف و نازک بیان کی ہے۔

یہ بزم ساقی عجب جگہ ہے کہ روح بیخود پڑی ہوئی ہے　　حواس منطق کی عقل گم ہے دلیل حیراں کھڑی ہوئی ہے

فلسفیوں کا ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ

تواں در بلاغت بسحباں رسید　　نہ در کنہ بے چوں سبحاں رسید

موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آگئی — نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا
افسانہ بہار وزبان نسیم واہ — گل جامہ چاک کرتے ہیں اس داستان پر
جو دیکھا غور سے یہ بات ثابت ہوگئی آخر — وہی ظاہر وہی باطن وہی اوّل وہی آخر
طلب ہے حق کی تو مل آکے ہم سے مستوں سے — نہیں ہے میکدہ خالی خدا پرستوں سے — ہم آیسے
شان دماغ عشق کے جلوے سے یہ بڑھی — رکھتا ہے ہوش بھی قدم اپنے سنبھال کے
مستی نشو و نمائے فصل گل کا جوش ہے — ہے ہوا میں فیض ساقی ہر کلی مئنوش ہے
بزم میں ایمائے چشم ساقی مئنوش ہے — وہ بہک جانے کے خطرہ میں ہے جس کو ہوش ہے
جس کے آنکھیں ہیں وہ ہے دیوانہ چشم آفریں — عالم عرفاں میں جو ذی ہوش ہے بیہوش ہے
ایام شباب اور موسم گل تقضے کی یہاں کیا ہستی ہے — ہر عضو بدن ہے لذت جو ہر قطرہ خوں میں مستی ہے

ترنم میں در و بست الفاظ سے نہایت درجہ جوش واثر پیدا ہوگیا ہے۔

نہ بہار جمی نہ خزاں ہی رہی کسی اہل نظر نے یہ خوب کہا — یہ کرشمۂ شان ظہور ہیں سب کبھی خاک اڑی کبھی پھول کھلا

حقیقتاً ان مظاہر فطرت سے بھی فہم والوں کی آنکھ کو بڑی مدد ملتی ہے۔

حال دل میں سنا نہیں سکتا — لفظ معنے کو پا نہیں سکتا
عشق نازک مزاج ہے بے حد — عقل کا بوجھ اُٹھا نہیں سکتا
ہوش عارف کی ہے یہی پہچان — کہ خودی میں سما نہیں سکتا
پونچھ سکتا ہے ہمنشیں آنسو — داغ دل کو مٹا نہیں سکتا

دکھ درد نہیں کہ بانٹ لیجئے + دکھ راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے (نسیم)

مجھ کو حیرت ہے اس کی قدرت پر — علم اس کو گھٹا نہیں سکتا

بعض فلاسفہ کا اعتقاد ہے کہ انتہائے علم ابتدائے حیرت ہے۔

کسی سے پوچھتا میں کیوں تصوف کس کو کہتے ہیں — خود اپنے دل کو دیکھا اور سمجھا اس کو کہتے ہیں

اس سے بہتر تصوف کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

چشم ابراہیم و دور انجم و شمس و قمر — اس کو کہتے ہیں نظر اور عقل کا یہ کام ہے

اگرچہ تکلیف نزع میں ہوں سکون خاطر بھی کم نہیں ہے — کسی[1] سے ملنے کی ہیں امیدیں کسی[2] سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

جو حرا[3] کے جاننے والے تھے صوفی ہو گئے — داستان بدر[4] والے شیعہ سنی ہو گئے

ورنہ حقیقتاً سب ایک ہیں۔

خلوت ناز میں کیا شان خود آرائی ہے — حسن خود عالم حیرت میں تماشائی ہے

الف بے تے ہی کو پڑھ کر میں سمجھا — الف اللہ کا اور ماسوا بت

ا ب ت کا وصل کس قدر لطف افزا ہے۔

پوچھے کوئی اگر تعصب کیا — کہہ دو اکبر کہ لفظ بے معنی

پوچھے کوئی اگر شریعت کیا — کہہ دو اکبر کہ لفظ با معنی

پوچھے کوئی اگر تصوف کیا — کہہ دو اکبر کہ معنی بے لفظ

تعصب۔ شریعت اور تصوف کی ایسی جامع اور ایسی سہل تعریف دوسرے الفاظ میں ناممکن اور لطف یہ ہے کہ جبر و مقابلہ کی طرح محض "لفظ" اور "با" اور "معنی" کے اُلٹ پھیر سے ساری حالتیں پیدا کی گئی ہیں۔

---

[1] خدا سے [2] کسی چیز شخص سے [3] حرا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے واقعات پہلے مختلف آسمانی مخلوق کی پرستش پھر خالق کی پرستش کا حال۔ کلام مجید میں مفصل حالات ہیں [4] بدر۔ ایک اسلامی لڑائی۔ ہر تاریخ اسلامی میں مل سکتی ہے۔

تمدن

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھی / تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں / تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہمسر کر نہیں سکتیں

مکیں کو دیکھ کر اکبر میں جھکتا ہوں کسی در پر / نظر اپنی مرید طاق و گنبد ہو نہیں سکتی

ظاہر پرستیوں سے بے نیاز رہنا چاہیئے۔

رشوت ہے گلوئے نیکنامی کا چھرا / عیاشی ہے بدی کے پہیئے کا دھرا

ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری / گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

چار مصرعوں میں چار چیزوں سے اجتناب کرنے کی ہدایت ہے خوشامد اور گستاخی کا موازنہ بھی ہے اور قافیہ ایسے دلچسپ ہیں کہ اثر تو ہوتا ہے مگر نصیحت نہیں معلوم ہوتی۔

آزادی دین کا گرفتار اچھا / شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا

ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلت بد / واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

اس میں بھی وہی رنگ ہے مگر کہیں کوئی یہ معنی نہ لگائے کہ خوشامد اور مکر اچھی چیزیں ہیں ہرگز نہیں غرض تمام بری ہے۔ مکاری کی خصلت بد ہے۔

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور / کہتا نہیں تم سے میں کہ اس سے ہو نفور

سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن / اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

جیسا میں اس سے پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں اکبر صاحب نہایت فیاضی سے سرسید کی خدمات قومی و تعلیمی کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔

کہدوں کہ میں خوش ہوں رکھوں گر آپ کو خوش / بجلی چمکاؤں اور کروں بھاپ کو خوش

سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے / ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو / باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر / اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

صرف نقل سے آدمی معزز ہونے کے بجائے ذلیل ہوتا ہے۔

شیطاں سے دل کو ربط ہو جاتا ہے　　دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی　　اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

حریص کو مال کی چاٹ ہر لمحہ رہتی ہے۔ مغرور کو اپنی بڑائی کا خیال ایک منٹ بھی چین نہیں لینے دیتا۔

شکم ہوتا تو میں اس عہد میں پھولا ہوا رہتا　　سراپا دل بنا ہوں اس سبب سے کشتۂ غم ہوں

بے حیا اور خود غرض فربہ خواہ مخواہ مرد آدمی ہو جاتا ہے۔

کتنے ہی بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں　　کافی ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں سے اچھے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ ہم جس سے اچھے ہیں وہ کس پایہ کا ہے اور ہم کتنوں سے برے ہیں۔

علمی ترقیوں سے زباں تو چمک گئی　　لیکن عمل فریب و دغا ہی کے ساتھ ہیں

سن لیجئے بس یہ چند الفاظ　　کہنا مجھ کو نہیں ہے اب کچھ
ہر اک کو ہے صبر کی ضرورت　　کوئی بھی نہیں جو پائے سب کچھ

'سب' کی طلب انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں　ع

'انسان یہی بس غور کرے اس کا کل میں عرا کیا حصہ ہے'

کینہ و پیکار میں بھی یوں تو ہے اک حظ نفس　　زیست کا اصلی مزا لیکن محبت ہی میں ہے
تقلید غذا میں ہو پیپرمنٹ یہی ہے　　گر ضبط ہوس سلف گورنمنٹ یہی ہے

پیپرمنٹ = بچوں کی انگریزی مٹھائی اور ایک لذیذ سفوف۔ سلف گورنمنٹ = حکومت خود اختیاری۔

پہچان بزرگی کی ہے یہی دل خوف خدا کی زد میں رہے　　اندیشہ بہت گستاخ نہ ہو اور وہم ادب کی حد میں رہے
روح کا ہے امتحاں اور زندگی کا کورس ہے　　ہے مبارک وہ سمجھ قرآن جس کا کورس ہے

کورس = نصاب ؛ کورس = سرچشمہ۔

کیا وہ درست ہو مری نظموں کے فورس سے　　فرصت کہاں ہے قوم کو کالج کے کورس سے

فورس = اثر۔ دباؤ۔

مر جائیں مگر رکھیں گے ثابت قدم اپنا　　ہے مرد میں جو دال کبھی گل نہیں سکتی

لفظ مرد کی دال بہت سخت ہے۔ مرد اپنی مردی کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔

اپنی محنت کو اپنا آنر[1] سمجھو — اپنے پانوں کو اپنا موٹر سمجھو
صحبت اچھی تو ہر جگہ ہے آرام — اپنے ہی بدن کو اپنا تم گھر سمجھو

اے بی بی شرم ہی کو تم سمجھو حسن — اور اپنے ہنر کو اپنا زیور سمجھو
بی بی میں جو طرز مغربی ہو تو کہو — احسان ہے یہ جو مجھکو شوہر سمجھو

عالم نے یہاں قبول ورد کو جانا — دیکھا دنیا کو نیک و بد کو جانا
عاقل وہ ہے کہ جس نے ہنگام عمل — اپنی قوت کو اپنی حد کو جانا

اس بت نے کہا کہ تو ہے بے عقل و خرد — کھول آنکھ زمانے کے موافق ہو جا
آخر میں کھلا کہ اس کا مطلب یہ تھا — اللہ کو چھوڑ مجھ پہ عاشق ہو جا

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹ[2] کی وہ گردشیں — خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادہ عشرت کے خم سے آپ — الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی — میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی

کوئی شعر بیچ میں رہ گیا ہے جس میں "آپ" کے لفظ سے تخاطب ہوا ہو۔

اللہ رے ارتقاے سگاں در حضور — کل تو سے تم ہوئے تھے ہوئے آج تم سے آپ
ہنس کر کہا انھوں نے الٹ بحث کا ورق — گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا — نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ — تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ

مالوی کا حال کچھ اور مولوی کا مول کچھ — کہتے ہیں بازار میں اکبر سے تو بھی بول کچھ
بولا وہ دنیا کا سودا تو فقط اک کھیل ہے — عمدگی ہے مال میں اور مول میں جیب میں ہے

حافظ

الا یا ایہا الساقی مکن تصنیف ناولہا — الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
دروغ آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا — کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا

---

[1] عزت Honour [2] دمدار ستارہ۔

لطافت کو نہ چھوڑے رنگ تیری شادی و غم کا — ہنسی آئے تو پھولوں کی جور و نا ہو تو شبنم کا

بد بو مست گھر نہ اے شرابی پھیلا — ہے تیرا دین نجاستوں کا تھیلا
ہر لحظہ طلب شراب کی ہے تجھ کو — ہر دم ترے منہ سے ہے نکلتا میلا[1]

ہم کو نہیں ان کی عیش و راحت پر رشک — بے غیرت و کودن اس پہ برساتے ہیں اشک
کافی ہے ہمیں عبادت حق کے لئے — ایک اونٹنی ایک پال پانی ایک مشک

رسول اور اکثر اصحاب صرف انھیں چیزوں پر قانع تھے۔

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
مزاج شریف ان میں باقی نہیں ہے — تو کیا منہ سے الحمد للہ نکلے

قاعدہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا ہے مزاج شریف تو دوسرا جواب دیتا ہے الحمد للہ۔

مارا فلک نشاند بہ پہلوے آں صنم — مدہوش لذتیم و ندانم دگر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر — کرزن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز جبرئیل — احمد چہ گفت و او چہ شنید و خدا چہ کرد

قائم ہی بوٹ اور موزا رکھئے — دل کو مشتاق مس ڈسوزا رکھئے
ان باتوں پہ معترض نہوگا کوئی — پڑھئے جو نماز اور روزا رکھئے

قافیوں کی سحر بھری لطافت میں نصیحت کا ایک دفتر موجود ہے۔

اے اکبر ہمارے دل کا تڑپانا نہیں آتا — کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا
بدن میں روح آجاتی ہے جب بے گوری رنگت کے — تو بے انگلش پڑھے روٹی بھی مل سکتی ہے نیٹو[2] کو

Native دیسی آدمی - اللہ ہر طور رزق دیتا ہی ہے۔

زمیں زیر قدم پا کر بشر نے پانوں پھیلائے — نہ رکھا یاد اس نے چرخ کا بالا ہے سر ہونا۔

انسانی فطرت ہے کہ ذرا سا آرام پایا اور غفلت میں کھوگئے اور اُن ڈراونی چیزوں سے بے خبر ہوگئے جو آلام کے ساتھ ہی ساتھ ہیں۔

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے — خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

---

[1] شراب ۔ [2] غلیظ۔

کچھ اس کا غم نہیں آفس میں ہو کہ دل میں رہے ۔ شکم کے ساتھ نہ پھیلے حدود دل میں رہے
قائل تقدیر یہ تھے قائل تدبیر وہ ۔ یہ قضا سے اور وہ اپنی حماقت سے مرے
نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکم رانی ۔ نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی
نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی ۔ یہی کہتی پھرتی ہے لڑکوں کی نانی
ہر اک شلغ میں پاس اب یہ ہوا ہے ۔ مرا لال کالج کا کاکاتوا ہے
قید ہر کروٹ پہ ہر بوسے پہ اک مضمون ہے ۔ عشق مس کیا ہے نرا قانون ہے

۲۸ جون ۰۸ء کے "لیڈر" انگریزی اخبار الہ آباد کے کسی پرچہ میں انگلستان کے ایک دلچسپ مقدمہ کا حال شائع ہوا ہے خلاصہ یہ ہے کہ میری صاحبہ نے شوہر پر دعویٰ دائر کیا کہ اس نے ایک بوسہ ان کے خلاف مرضی لے لیا شوہر صاحب پر جرمانہ ہوا انھوں نے کابینہ وزرا میں اپیل کی مگر وہ مسترد ہو گئی ۔

عقد سے کیا ہوں وہ خوش کہتی ہے بیوی ان کی ۔ بے نماز آئے تو کب ہاتھ لگانے دوں گی
میں مسلمان کی لڑکی ہوں مسلماں ہوں خود ۔ سامنے بھی انھیں واللہ نہ آنے دوں گی
ساس کہتی ہیں کہ پڑھواؤں گی سمجھا کے نماز ۔ ایسے مسٹر کو بھلا ہاتھ سے جانے دوں گی
یعنی ہرگز نہ جانے دوں گی ۔

علم پر گو غرور بے جا ہے ۔ جاہلوں سے ہے اجتناب روا

دنیا

خوب آتا ہے صاحب کو خود اک بات کا کرنا   اور بات پڑے جب تو مرا نام لگانا

وقت آئے ۔ موقع ہو۔

شیخ در گور و قوم در کالج   رنگ ہے دور آسمانی کا

جیسے مرنا نہ ہو وہ حشر تک کی فکر میں الجھے   بدلتی ہے اگر دنیا تو بدلے ہم سے کیا مطلب

مجھے ہمنشیں ملا کیا انھیں حال دل سنا کر   وہ کہ آئے ساری باتیں مرے دشمنوں سے جا کر

C. I. D. سی ۔ آئی ۔ ڈی کی طرف خفیف سا اشارہ ہے ورنہ کوئی تخصیص نہیں منافقوں کی باتیں

زندگانی کا مزا ملتا تھا جن کی بزم میں   ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتہ ملتا نہیں

تعجب نخوت اہل زمین پر مجھ کو آتا ہے   یہ اس پر کیوں اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کے گڑتے ہیں

مذہب چھڑایا عشوہ دنیا نے شیخ سے   دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اتر پڑے

کبھی ہے صبح عید اس میں کبھی شام محرم ہے   یہ عالم چشم بینا کے لئے عبرت کا عالم ہے

عروج ہستی فانی پہ کیا سرگرم عشرت ہوں   فروغ چند ساعت ہے یہاں مثل شرر اپنا

عالم ایجاد بھی اک عالم موہوم ہے   جتنی تعمیریں ہیں یاں کی سب ہیں وہ تعبیر خواب

دنیا کی تعمیرات کو خواب کی تعبیرات کہنا کتنی اچھوتی تشبیہ ہے۔

چشم نرگس سے کوئی حال چمن کا پوچھے   دیکھتے دیکھتے کیا کیا گل خنداں نہ رہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

پئے تسلیم سر جھکتا تھا سب کا جن کے ایواں میں   انھیں کی خاک اب پامال ہے گور غریباں میں

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد   افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد

دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی   عقبے کا تصور اور اللہ کی یاد

شباب عمر نے کھویا طمع نے دین لیا   فلک نے ہم سے بڑی دولتوں کو چھین لیا

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا + جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی۔

دنیا سے تعلق رکھنے میں ہرگز نہیں یہ تمہید بری   کیا خوب کہا ہے اکبر نے احسان اچھا امید بری

بنیادِ دین ہوائے دنیا نے منہدم کی | طوفان نے شجر کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا
آماجگاہ تیر حوادث ہوں رات دن | پُتلا بنا ہوا ہوں غم روزگار کا
محرومی کا شکوہ بھول گئے یکتائی پہ اپنے فخر ہوا | پیش دردولت میرے سوا جب کوئی گدا باقی رہا
کہاں ہیں۔ جم و کسریٰ۔ کدھر ہے۔ وہ بزم انکی | فنا کا تسلسل ہے۔ کسی کو نہیں رہتا
غرور تھا۔ نمود تھی۔ ہٹو بچو کی تھی صدا | اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں
برباد و منتشر بھی ہو گے اس ہوا میں | کس زعم میں اُٹھے ہو تنکر تم اے بگولو
اسی لیے رہ گئی ہیں آنکھیں کہ مرنے مٹنے کا رنگ دیکھیں | سنوں وہ باتیں جو ہوش اُڑائیں اسی لئے ہیں یہ کان باقی
ہمیشہ پیش نظر ہیں وضو شکن منظر | اس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی

حقیقت یہ ہے کہ ترغیبات نفسانی سے بچنا بہت مشکل کام ہے۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی | نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی
کیسے کیسے زرنگار ایوان ملے ہیں خاک میں | ریزہ ریزہ اب بھی ویرانوں میں اطلس پوش ہے
اے صبا اس باغ میں ترا عمل ہے مشتبہ | ہنس دئے گل ہو کے غنچے یا پریشاں ہو گئے
مفتوں ہو گئے ہم اس بے بقا چمن کے | آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بن کے
جہان فانی کا حشر ہی کو خیال کر مستقل نتیجہ | یہاں تو پیہم یہی تردّد یہی تغیّر ہوا کرے گا

ہے دو روزہ قیام سرائے فنا نہ بہت کی خوشی نہ ہے کم کا گلا
یہ کہاں کا فسانہ سود و زیاں جو گیا وہ گیا جو ملا وہ ملا
جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اس قصر پہ کل رویا میں بہت
کوئی متنفس تھا نہ وہاں باہر بھی پھرا اندر بھی گیا

قتال جہاں معشوق جو تھے خالی ہیں پڑے مرقدان کے پایا مرنے والے لاکھوں تھے یار رونے والا کوئی نہیں (آرزو)

کل کی امیدوار ہے دنیا | عالم انتظار ہے دنیا
بے خبر رکھتی ہے حقیقت سے | ہوش پر میرے بار ہے دنیا

فردا سے قیامت سے مراد ہے۔

لہ نشانہ۔

چال دنیا کی تمھیں محسوس ہو دشوار ہے　　یہ زمیں چلتی ہے تیزی سے مگر ہلتی نہیں

یورپ کے زبردست فلسفی Berkeley بھی ایک معترض کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ زمین کی چال "معلوم" ہوتی ہے محسوس نہیں ہوتی۔

نئی ترکیب اب شیطاں کو سوجھی ہے اغوا کی　　خدا کی حمد کیجے ترک بس مجھ کو بُرا کہئے

محض بُری چیزوں کو بُرا کہنے سے یا بُری چیزوں سے بچ جانے سے انسان اچھا نہیں ہو سکتا۔ اچھے افعال ہی سے اچھائی پیدا ہو سکتی ہے۔

زبان

کرتا ہوں میں جو آہیں کہتے ہیں ہے یہ مہمل زبان یہ اعتراض ان کے دل کی زباں پر ہیں
زبان کی زبان پر اعتراضات ہو سکتے ہیں دل کی زبان پر اعتراض کرنا شعور کے خلاف ہے۔

نہ روح مذہب نہ قلب عارف نہ شاعرانہ زبان باقی زمیں ہماری بدل گئی ہے اگرچہ ہے آسمان باقی
صورت پہلے نہ دیکھی پڑھ لیا دیوان قیس شاعری آئی نہیں لیکن زباندان ہو گئے
جن کے دلوں میں سچا دردِ محبت نہیں ہے وہ حقیقی شاعر نہیں ہو سکتے۔

اُردو پہ یہ خدمت بر گڈ ہے بار خیر اب اس کام کو بھاشا کرے
انگریزی کے غلط سلط اور بے موقع الفاظ کا استعمال اُردو پر حقیقتاً بار ہے۔

ہیٹ ہی کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول دخل انگریزی پہ اُردو کی شکایت ہے فضول
وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے مگر اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کے مانک ہے
پدر = Father مانک = موافق۔ خیالات اور زبان میں کس قدر تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔

وسعت ہو زبان کی ادھر جھک متروک کو دیکھ کر تو مت رک
کس قدر عمدہ ہدایت ہے ورنہ زبان محدود ہوتے ہوتے ایک روز غائب ہو جائے گی۔

قوم کیسی کس کو اب اُردو زباں کی فکر ہے غم غلط کرنا ہے بس اور آب و نان کی فکر ہے
ایک پر اجماع اکثر کا بہت مشکل ہے اب سب ہیں مضطر اپنے منہ مٹھو میاں کی فکر ہے
اپنے منہ میاں مٹھو بننا خود اپنی تعریف آپ کرنا۔

ہو نہیں سکتی مرتب کوئی بزم سامعیں ہر زباں کو ایک تازہ داستاں کی فکر ہے
بتوں کی مدح سے کل شاعری اُردو کی مملو ہے شکست اُردو جو پائے گی تو میں سمجھوں گا بت ٹوٹا
بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامہ اعمال مرا ہندی میں کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات
ہندی کا رسم الخط اُردو سے یوں تو مشکل نہیں ہے مگر شکست ہندی شکست اُردو سے زیادہ دشوار فہم ہے

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں بحثوں کے لئے اخباروں میں مضموں تراشا کیوں نہ کریں
واقعی غریب اُردو پر بڑی مصیبت ہے ایک طرف عربی و فارسی کے الفاظ اس کثرت سے آتے ہیں کہ توبہ بھلی دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کی وہ بھرمار ہے کہ ساری فصاحت رفو چکر ہو گئی ہے۔

دل ہی باقی نہیں اے دوست مضامیں کیسے — آپ موتی کے طلبگار ہیں دریا بھی تو ہو

"جامہ ندارم دامن از کجا آرم"

اس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے — اس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے

لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب اہل و فعلُ — چرخا ہی چلا کرتا ہے اور سوت نہیں ہے

معنی کی گرہ کہاں کھلی ہے — الفاظ ہی کی دکان کھلی ہے

ہر واہ کی تہ میں ہے یہاں آہ — دم بند ہے اور زبان کھلی ہے

واہ کا 'د' جدا کر کے دیکھئے 'آہ' نظر آئے گی۔

ہم سے چھن کر ہو گئی بزم ترقی کے سپرد — سچ کہا مرزا نے اب اُردو بھی کورٹ ہو گئی

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اے فلک انگلش و جرمن ہو مبارک تجھ کو — ہم کو تو اُردو ہندی میں بسر کرنا ہے

جو لوگ اپنی مادری زبان سے ناآشنا محض ہوتے ہیں ان کے لئے یہ شعر تازیانۂ عبرت ہے

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی — بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

منطق کا ایک مغالطہ یہ ہے کہ بجائے دلیل لانے کے کسی بات کی صحت ثابت کرنے کے واسطے کسی بڑی ہستی کا حوالہ دیدے۔

کہاں اُردو و ہندی میں زر نقد — وہی اچھا ہے جو گنستا منی ہے

مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث — میاں ہمدم وچنستا منی ہے

چنتا منی کا قافیہ گنستا منی ڈھونڈھ لینا اکبر ہی کا کام ہے اور پھر اس طور پر سچ دیا ہے کہ آورد معلوم نہیں ہوتی۔

پپیہے سے کہتے ہیں اب "پی" کو چھوڑ — ضرورت ترقی کی ہے کیو پکار

Q کیو P پی کے بعد ہے ترقی کو رومن میں لکھئے تو Q کیو' سے لکھنا ہو گا۔

ترجمے والے کرتے ہیں محنت — پلیتے ہیں اپنی اُجرت

سینے ہو جاتے ہیں خالی — بھرتی جاتی ہے الماری

دل کا کورس تو ٹھہرا غربی — لب پہ اُردو ہو یا عربی

---

[a] روپیہ پیسا، Money

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں   اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امراء القیس بنیں   پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

ڈال دے جان معانی میں وہ اردو یہ ہے   کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے

دل چھوڑ کر زبان کے پہلو پہ آ پڑے   ہم لوگ شاعری سے بہت دور جا پڑے

سرحد پر باغیوں کو سکھ ماریں گے   گردن اُردو کی رام رکھ ماریں گے

دوسرے مصرعہ کے قافیہ کے لئے طبع آزمائی ہوئی تھی۔

قائم رہے البشر کا یہ پرچہ   ہم بھی مضموں کوئی لکھ ماریں گے

سچ کہتے ہیں حضرت کرامت اکبر   رخصت ہوئی فارسی تو اُردو بھی گئی

کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد۔ ظاہر ہے کہ اُردو میں فارسی کے الفاظ بہت زیادہ شامل ہیں

علم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی   تخلئے کی بات پبلک کے دلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اس بت سے لڑائی تھی زباں   یہ اثر اس کا ہوا اُردو سے ہندی لڑ گئی

معنے جنگ اُردو و ہندی   میں یہ سمجھا بہ عالم رندی   یعنی ہے اس میں لطف وصل بتاں   خوب مل کر لڑی زباں سے زباں

اُردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود   پھر کیا سبب جو اس سے انہیں انحراف ہے
یعنی اُردو ہے چیز انھیں کے مذاق کی   اُردو کی تین جزو یہی صاف صاف ہے   ایک دل

دل میں جو پڑ گئی ہے گرہ کھول ڈالئے   اک دم میں کل متاع سخن تول ڈالئے
ترکیب ہے ترقی اُردو کی بس یہ خوب   جو آپ بول سکتے ہوں سب بول ڈالئے

آیندہ اُردو زبان کا نمونہ

بابو جی کا وہ بت ہوا نوکر   غیر اس کو پیام دیتا ہے   بابو کہتے ہیں وہ نہ جائے گا   میرے اندر میں کام دیتا ہے

کہا جو میں نے کہ ان کی ادا انوکھی ہے   بتوں نے کہدیا اُردو میاں کی چوکھی ہے

قصۂ منصور سنکر بول اُٹھی وہ شوخ مس   کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو کیوں پھانسی دیا

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے   ویران آج کوچۂ بین السطور ہے
شبلی کا خامہ صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا   اب مدّ آہ و لوح دل ناصبور ہے

وہ درمیانی جگہ جو دو سطروں کے بیچ میں ہوتی ہے۔

زبان سنسکرت اس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے — کہ اچھا ہے مری الفت تمہارے دل میں رہتی ہے
میں خوش ہوں گی بلاشک تم اگر مجھ کو جلاؤ گے — مگر وسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے
جیوں گی میں کہ پھر تم کو ملاؤں دیوتاؤں سے — بھڑاؤ گے مجھی کو یا کہ دنیا کی بلاؤں سے
اگر شوق عبادت ہے تو میں موجود ہوں اب بھی — اگر دنیا کا سودا ہے تو میں کب اس سے راضی تھی

یہ کہتے تھے اک لالہ باوقار — کہ عربی حروف اب تو ہم پر ہیں بار
رُکی ہے انھیں سے ہماری نمود — یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال — ہٹے حاے حلّی رہیں رام لال

حرام اور حلال سے "ح" کو نکال ڈالئے رام لال رہ جائے گا۔

زمانہ

رنگ اُڑانا اہل یورپ کا تو ہے اکبر محال — مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

اکثر تقلیدیں نامکمل ہوتی ہیں اور پھر "چیتا اپنی کھال نہیں بدل سکتا۔"

ذرا تو پختہ شریفوں کو باغ دہر میں دیکھ — انھیں کا حال ہر اک سے زیادہ خستہ رہا

مجھ کو دم بھر بھی زمانے میں نہیں چین نصیب — مضطرب شیشہ ساعت میں ہوں بالو کی طرح

پرانے زمانہ کی گھڑی جس میں ریگ بھر دی جاتی تھی اور اس کے گرنے سے وقت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

عوض قرآن کے ہے اب ڈارون کا ذکر یاروں میں — جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

ڈارون کا ذکر پہلے مفصل آ چکا ہے۔

مذہب چھوڑ و ملت چھوڑ و صورت بدلو عمر گنواؤ — صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا جہلم اس کا — پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

اخبار و جرائد کی غیر ذمہ دارانہ روش کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔

ہم فلسفہ کو کہتے ہیں گمراہی کا باعث — وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے

قدم شوق بڑھے ان کی طرف کیا اکبر — دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے

ادھر ہم سے بھی باتیں آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی — ادھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

دو دلی اور دو رنگی اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہے۔

توجہ اپنی ہو کیا فن شاعری کی طرف — نظر ہر ایک کی جاتی ہے عیب ہی کی طرف

حسن کے دیکھنے والے اور تنقید کے اصلی معنی سمجھے والے کتنے ہیں۔

کامل کم ہیں اور اہل ارشاد بہت — ساحر کم ہیں ملیں گے صیاد بہت

ہے بزم سخن کا حال یہ اے اکبر — شاعر کم ہیں مگر ہیں استاد بہت

ہر شخص بجائے خود استاد بنا بیٹھا ہے۔

لفظوں کے چمن بھی اس میں کھل جاتے ہیں — بے ساختہ قافیے بھی مل جاتے ہیں

دل کو مطلق نہیں ترقی ہوتی — تعریف میں سر اگرچہ ہل جاتے ہیں

یہ اس شاعری کا ذکر ہے جس میں لفاظی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اوروں کی کہی ہوئی جو دہراتے ہیں — وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حسب حال مضموں نکال — انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

جب تک جدت تخیل نہو اور صلاحیت فکر نہو ترقی نہیں ہو سکتی۔

اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزہ — جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا

"آج تو چین سے گذرتی ہے + عاقبت کی خبر خدا جانے"

رہے نہ اہل بصیرت تو بے خرد چمکے — فروغ نفس ہوا عقل کے زوال کے بعد

کس قدر عمدہ دلیل پیش کی ہے۔

تہذیب کے خلاف ہے لائے جو راہ پر — اب شاعری وہ ہے جو اُبھارے گناہ پر

Self culture کا قابل مصنف لکھتا ہے اور رسکن ایسا مدبر کہتا ہے کہ آج کل کا ہر دلعزیز ادب نوجوان کے لئے نہایت مضر ہے۔

ہیں مشاغل محفل احباب کے ناگفتہ بہ — دم بخود بیٹھا ہے اکبر سا سخنداں ان دنوں
وفا بتوں میں نہیں ہے خدا کو پائیں کہاں — اسی فراق میں کٹتے ہیں دن کہ جائیں کہاں
بڑے جو ہیں وہ بے ثمر جو خورد ہیں وہ خیرہ سر — عطا نہیں۔ کرم نہیں۔ ادب نہیں۔ وفا نہیں

لف و نشر مرتب ہے۔

معترض ہو نہ مری عزلت و خاموشی پر — کیا کروں میں جو کوئی محرم اسرار نہیں
شور تحسین تو سخن پر ہے تمہارے اکبر — زر کی جھنکار بھی سنتے ہو کہیں واہ کے ساتھ
مخلصانہ جو نہو مدح تو کیا لطف آئے — چشم غماز کی گردش بھی ہے تحسین کے ساتھ
وہی انساں وہی آنکھیں وہی جینا وہی مرنا — کہیں اللہ و اکبر ہے کہیں ایجاد کا غل ہے
نگاہ ناز بتاں پر نثار دل کو کیا — زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی
دنیا میں امر حق کو کس طرح صاف کہئے — کرتا ہے دشمنی وہ جس کے خلاف کہئے
ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں — اُٹھے ہیں جو بگولے برباد ہوں کے تن کے

اس مضمون کو ایک جگہ اور کہہ چکے ہیں کہ بگولے خود اپنی ہوا میں برباد ہو جائیں گے۔

دست گلچیں پھر رہا ہے شاخ گل پر بے دریغ — کون سنتا ہے چمن میں عندلیب زار کی
ہر سر میں ہے یہ سودا دانم چرا نگویم — وہ کون ہے جو واعظ بن کر اٹھا نہیں ہے
بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس — موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

ملاحظہ ہو وہ نظم "سناؤں اک تمھیں فرضی لطیفہ"

مرے شکوؤں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم — کوئی یہ شیخ سے کہدے کہ سنئے قبلۂ عالم
جدھر صاحب ادھر دولت جدھر دولت ادھر چندہ — جدھر چندہ ادھر آنر جدھر آنر ادھر بندہ
نیست کس مصروف کار دیں بقلب مطمئن — یک فنا فی الآخر است و یک فنا فی الدارون
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

الحمد اللہ یہ حالت عداوت اور زمانے کا یہ انقلاب گویا ذکر خدا باعث عجب ہے اور نعوذ باللہ مستوجب تادیب

انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں — "الم ترکیف" بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانہ میں

ایک سورۂ قرآنی ہے جس میں قدرت یزدانی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

مریدان کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں موٹر پر — نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں
ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے — بی۔ اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

اکثر سند یافتہ حضرات کی مکمل حیات یہی ہوتی ہے۔

جیب سے مغروری زر بے تحاشا دیکھئے — جلوہ بازار مغرب کا تماشا دیکھئے
آنے والے نہ رہے انجمن دل کی طرف — کوئی کالج کی طرف ہے کوئی کونسل کی طرف

اصل تلفظ Council کاونسل ہے کونسل نہیں ہے۔

ہر حریف زباں نہیں ہے شمع اخلاص — جلنے والے بہت ہیں دلسوز ہیں کم
کیا عجب ہو گئے مجھ سے مرے دمساز جدا — دور فونو میں گلے سے ہوئی آواز جدا

فونوگراف = انگریزی باجا۔ Phonograph

وجد یاروں کو ہے اس بزم میں حیراں ہوں میں — سر سے آواز جدا راگ سے ہے ساز جدا
ہمارا بھی کوئی ہمدرد ہے اس وقت دنیا میں — پکارا ہر طرف منہ سے کسی کے ہم نہیں نکلا

بہت سے بچے ہوں اور پکاریں کہ یہ مٹھائی کون لے گا تو ہم ہم، کی صدا فضا میں گونج جائے گی اس عام مشاہدہ سے استقرا کیا ہے

آپ کے ہاتھوں میں میں ہاتھ نہیں دے سکتا　　داد دیتا ہوں مگر ساتھ نہیں دے سکتا

یہ مرض عالمگیر ہے۔

سر تراشا ان کا کاٹا ان کا پانوں　　وہ ہوئے ٹھنڈے گئے یہ بھی پگھل

شیخ کو یخ کر دیا مومن کو موم　　دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر (ش)، کاٹ دیجئے یخ رہ گئے یعنی برف سے ٹھنڈے ہو گئے۔ مومن کا پانوں یعنی (ن)، کاٹ دیجئے موم رہ گئے یعنی پگھل گئے۔

جہاں سوئی گھڑی کی ہوتی ہے وقت اس کو کہتے ہیں　　گئی چوری تو ہم سمجھے زمانہ اس کو کہتے ہیں

کس کو امید ہے اس کی کہ یہ اچھا ہوگا　　کون اس وقت میں کرتا ہے عیادت میری

جس وقت لوگ مریض کے شفا سے مایوس ہو جاتے ہیں ترک عیادت کر دیتے ہیں۔ عیادت بھی کس قدر لطیفہ ہے

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے　　پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

بدل گئی ہے ہوا ایسی کچھ زمانے کی　　دعائیں مانگتا ہوں ہوش میں نہ آنے کی

یہ قومی ترقی بھی ہے پریوں کا فسانہ　　کانوں سے سنا سب مگر آنکھوں سے نہ دیکھا

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا　　حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے　　شاہ ڈوڑڈ کی دہائی ہے

پرچہ رکھا جو اس نے میں یہ سمجھا　　پاکٹ میں یہ بیس روپے کا نوٹ گیا

گھر پر کھولا تو بس یہی لکھا تھا　　کیا شعر تھے واہ واہ میں لوٹ گیا

سچ کہا اکبر نے ہاتھا پائی کا ہے کیا علاج　　زور منطق سے تو ممکن ہے انھیں ساکت کریں

Argumentum ad baculum منطق کا ایک مغالطہ یہ ہے کہ دلیل نہ لا سکیں تو لاٹھی ڈنڈے سے حریف کو خاموش کر دیں۔

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بنک میں　　قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس نے

Deposit = جمع۔ Thanks = شکریہ۔

کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں　　اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر۔

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند　　کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں　　یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی　　سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی

نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقوے کی　　خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

ان کو کیا کام ہے مروت سے　　اپنے رُخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے

جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں　　ڈاکٹر فیس تو نہ چھوڑیں گے

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے　　تو بے چارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اُچھل آیا

بہت سے خود ساختہ لیڈر اسی قماش کے ہوتے ہیں۔

کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے　　کوئی پا رہا ہے کوئی کھو رہا ہے

کوئی تاک میں ہے کسی کو ہے غفلت　　کوئی جاگتا ہے کوئی سو رہا ہے

کہیں ناامیدی نے بجلی گرائی　　کوئی بیج امید کے بو رہا ہے

اسی سوچ میں میں تو رہتا ہوں اکبر　　یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے

سادہ سے سادہ الفاظ میں جذبات و خیالات کا ایک عالم نظر آتا ہے خصوصاً اس مصرعہ کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی "یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے"۔

اک بات ہم نے کہہ دی ورنہ یہ وقت وہ ہے　　تم بھی ہو زخمیوں میں ہم بھی ہیں بسملوں میں

حکم گردوں ہے کہ جلتے چھوڑ دو صوفیوں کی نشست　　یا پریس میں جاؤ یا اسکول میں

صاحب سلامت اب بھی میری شیخ جی سے ہے　　لیکن چھٹے چھ ماہے وہی راہ باٹ میں

دو محاورے 'چھٹے چھ ماہے' شاذ و نادر اور 'راہ باٹ' کس قدر خوبی سے نظم ہوئے ہیں۔

چین کے ساتھ ہم اس وقت بھی رہ سکتے ہیں　　شرط یہ ہے کہ فقط پیٹ ہو اور آنکھ نہ ہو

بصارت سے آدمی واقعات دنیا کو دیکھ کر اثر پزیری کو مجبور ہو جاتا ہے۔

دیوار شکستہ نے ترقی کی دعا کی　　گردوں کی عنایت سے سڑک بن گئی کٹ کے

میرے نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا　　یہ تو کہئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

کہاں کا گیان اور دھیان کیسا خدا کہاں کا کہاں کا وشنو
عمل کے بدلے اسی کا غل ہے بہیں وبشنو ہیں وبشنو

وشنو اور بشنو کا قافیہ لسان العصر کے سوا کس کو سوجھ سکتا تھا۔

صدائے فونوگراف بشنو بہیں تماشائے لمپ برقی
ز سینہ و دل مجو تجلی خموش کن شمع ہائے شرقی
بھائیو گیہوں کا آٹا ڈھائی آنہ سیر[1] ہے
پھر عجب کیا ابن آدم زندگی سے سیر[2] ہے

[1] وزن [2] آسودہ۔

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی
تعلیم اس کی اچھی جو اپنے گھر میں خوش ہو
مذہب اسی کا اچھا جس کو پولس نہ پکڑے
نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور جھرمٹ ہے
وہاں سینے میں قرآں تھا یہاں سینے میں بسکٹ ہے
طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے
جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چوہے

چوہوں پر طاعون کا اثر بہت جلد ہو جاتا ہے اور وبا کے جراثیم مرے ہوئے چوہے سے بہت جلد منتشر ہو کر فضا میں پھیل جاتے ہیں۔

حمد

غرور انھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب اُن کا ہے اور خدا میرا

صفات حق تعالےٰ فہم منکر میں نہیں آتے
وہ کہتا ہے کہ گویا کچھ نہ ہونا ہے خدا ہونا

تصور جب اس کا بندھا تو پھر نظر میں کیا رہا
نہ بحث ایں و آں رہی نہ شور ماسوا رہا

آئے گی تجھ کو نظر صانع قدرت کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ آئینہ فطرت کے سوا

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اُٹھی بانگ اذاں ہو کر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے میں
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر

زبان برگ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سر سبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

بہار آئی ہے اک آئینہ معنی نشاں ہو کر
چمن میں بوئے گل پھیلی ہے تیری داستاں ہو کر

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبر
انساں کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہر تن میں جبکہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

بیگانہ سرور سے ہے وہ دل جو تیرے لئے غمناک نہیں
سرمہ وہ بصر افروز نہیں جس میں ترے در کی خاک نہیں

سالک کو دم تیغ ہے قطع رہ توحید
دو ہو گیا اک آن میں چوکا جو ذرا بھی

انھیں نے عطا کی تھی جان حزیں
ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی

(غالب) جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ٭ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آئینہ رکھ دے بہار باغ غفلت ہو چکی
دل سنوار اپنا جوانی خود آرائی ہو چکی

بیخودی کی دیکھ لذت کرکے ترک آرزو
ہو چکی حد ہوس مشق تمنا ہو چکی

حسن مطلق کے تصور سے بھی لے دو ایک جام
روئے زیبا ہو چکا زلف چلیپا ہو چکی

میں زباں پہ لاؤں کیونکر وہ حدیث حسن مطلق
کہ نہ بار لفظ اُٹھائے گی نزاکت معانی

اے صانع ازل تیری قدرت کے میں نثار　　کیا صورتیں بنائی ہیں مشت غبار سے

کہ ہر صورت کلیجہ سے لگا لینے کے قابل ہے۔

تمہاری بحثوں سے میرے شبہے خدا کی ہستی سے کم نہ ہوتے　　مگر یہ بات آ گئی سمجھ میں خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ خود اپنی ہستی ہستی خالق کی شاہد ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا　　بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

ذہن میرا وہ قیامت کہ دو عالم پہ محیط　　آپ ایسے کہ مرے ذہن میں آ ہی نہ سکے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

زبانوں کو نہیں کھلنے کی طاقت بزم میں تیری　　نگاہوں کو نہیں اُٹھنے کا یارا تیری محفل میں

ہو گیا بدر ہلال اس کا سبب روشن ہے　　روز گھستا تھا ترے در پہ جبیں تھوڑی سی

کیا جذبۂ عشق نے مرے اثر رہی غیرت حسن پہ ان کی نظر
پس پردہ صدا تو سنائی مجھے مگر اپنا جمال دکھا نہ سکے

معراج کی تصویر حبیب و محبوب کی محفل کا نقشہ کس انداز سے کھینچا ہے۔

آپ کو پردہ نشینی ہی جو رہتی ہے پسند　　مجھ کو کیوں مفت میں دیوانہ بنا رکھا ہے

آپ کے شہرۂ رحمت نے جو ڈھایا ہے غضب　　ایک عالم کو گنہگار بنا رکھا ہے

ترے پرتو سے اے جان جہاں ظلمت میں نور آیا　　ترے فیض تجلی سے یہ ذروں میں شعور آیا

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا　　جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

خدا کی اس سے بڑی تعریف میں نے آج تک نہ دیکھی نہ سُنی۔

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر　　یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

ہر ذرّہ چمکتا ہے انوار الٰہی سے　　ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

اللہ کا حال کچھ نہ پوچھو　　دیکھا نہیں نام رکھ لیا ہے

جاری طریق فضل و عطا سب کے ساتھ ہے　　دیکھو جو غور سے تو خدا سب کے ساتھ ہے

تنویر چاہتا ہے گر آتش درون کی　　ہوا اس کا محو جس نے مٹی میں روح پھونکی

نہیں سائنس واقف کار دیں سے　　خدا باہر ہے حد دوربیں سے

اثبات خدا کو منطقی اُٹھ نہ سکا — خاک حیرت سے ذہن ہی نہ اُٹھ سکا
اللہ رے نزاکت وجود باری — ثابت ہونے کا بار بھی نہ اُٹھ سکا

پیارا ہے فقط اللہ کا نام آرام اسی سے روح کو ہے — اور یوں تو حوادث بے حد ہیں دنیا میں بہت افسانے ہیں
بہ رہا ہے لاکھوں ہی موجوں میں یہ بحر فنا — درد کے قابل فقط یا حیّ یا قیوم ہے

حیّ اور قیوم جو ہمیشہ باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی ذہنی دھوم ہے — ہست میں شبہ نہیں ہے چیست لامعلوم ہے
اس تغیر پر بھی ذہنوں میں ہے قائم کوئی چیز — اور وہ کیا ہے فقط یا حیّ یا قیوم ہے
اظہار اس معنی نازک کا الفاظ کے حد سے باہر ہے — ہر پھر کے سمجھ ہے گرد اس کے جو حد خرد سے باہر ہے

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے کا خدا کرے گا

(۱) حشر کی امیدیں ہیں (۲) بہت سی امیدیں ہیں۔

اگرچہ ہے درد و غم سے مضطر یہی ہے ورد زبان اکبر
یہ درد جس نے دیا ہے ہم کو وہی ہماری دوا کرے گا

میں کیا کہوں اسے اور کیا کروں گلا اُس کا — مجھے ہنوز پتہ ہی نہیں ملا اُس کا

خدا ہی نے مین بنایا مجھ کو خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

میں نام سعی کا اپنی خدا نہ رکھوں گا — جو بن پڑے گا مگر وہ اٹھا نہ رکھوں گا

شکل تسکین مرے دل کو مرے اللہ دکھا — راہیں سب بند ہوئیں اپنی طرف راہ دکھا
چمکے وہ مہر کہ گم ہوں یہ چراغ اوہام — نور عرفاں سے ہو جلوہ وہ شب ماہ دکھا
آنکھ کو صورت فانی نے کیا ہے پرخوں — چشم باطن کو مرے معنی دلخواہ دکھا

ہوش اُڑا دیتا ہے ان خاک کے پتلوں کا جمال — خود وہ کیا ہوگا انھیں ہوش میں لانے والا

ہر دم خیال رکھے حق کا اگر ہے طالب — ہر سانس کھینچتی ہے جان آفریں کی جانب

نہ پوچھو کیا اثر اس مصرعہ اکبر کا ہے ہم پر — ہر اک کے علم کا ہے خاتمہ واللہ اعلم پر

خدا بہترین جاننے والا ہے۔ مجتہدین وفقیہ عام طور پر ختم تحریر کے بعد لکھتے ہیں واللہ اعلم۔

کیونکر دلیل دیکھ سکے اس جمال کو — جس کا خیال برق گراتا ہے ہوش پر

یہ جتنے ذرے جہان فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بے خبر ہیں

تدبیر کی کوئی حد نہ رہی اور بالآخر کہنا ہی پڑا — اللہ کی مرضی سب کچھ ہے بندے کی تمنا کچھ بھی نہیں

انگریزی کا ایک مقولہ ہے Man proposes و God disposes

انسان تمنائیں کرتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔

میں جس کے خانہ قدرت کا نقش حیرت افزا ہوں — وہی جانے کہ وہ کیا ہے وہی جانے کہ میں کیا ہوں
کیا نور تھا نگاہ جناب خلیل میں — شمس و قمر بھی کچھ نہیں انجم بھی کچھ نہیں
خدا پرست کو کافی ہے مثل ابراہیم — زوال شمس و قمر صبح و شام عالم میں
خدا سے غافل اور اس پر یہ نعمت دینا — اسی کی شان ہے احساں ناسپاس کے ساتھ
اسی کے انتظام و حکم سے موسم بدلتے ہیں — وہی ہے وقت پر جس نے ہواؤں کو اُبھارا ہے
زمیں پر سبزہ و گل کی نمودیں کیسی پیاری ہیں — فلک پر چاند سورج کا بھی کیا دلکش نظارا[1] ہے
کوئی ذرہ نہیں عالم میں اس کے علم سے باہر — جو مرضی اس کی ہے دخل اس میں دے یہ کس کو یارا[2] ہے
وہی دُنیا میں ہے اس زندگی و موت کا خالق — ہر اک کو اپنی مرضی سے جلایا اور مارا ہے

ان اللہ علےٰ کل شئے قدیر کی منظوم تفسیر ہے۔

صفحہ ہستی پہ آخر کس قلم کی ہے کشش — نقش مٹتے ہی رہے لیکن اُبھرتے ہی رہے
خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے — خدا کیا ہے؛ خدا ہے اور کیا ہے
بڑھاتے کیوں ہو تم لفظوں کو آگے — بساط ذہن پر یہ جور کیا ہے

اس باغ میں یہ نگاہ اکبر — دل کو بے حد ابھارتی ہے — ہے کس کے فراق میں پپیہا — کوئل کس کو پکارتی ہے

پپیہا۔ پی کہاں پکارتا ہے کون "پی"؟ کوئل "کو" کی کوک مارتی ہے کون "کو"

---

[1] دکھاوٹیں [2] طاقت۔

شاہد بزم ازل کے فیض کا کیا پوچھنا — خاک نے اتنی ترقی کی کہ آدم ہو گئی

خدا کہاں ہے؟ جواب اس کا۔ ہر مقام میں ہے — نہ سمجھے کوئی تو کہد و خود اپنے نام میں ہے

"خود اپنے" کے شروع کے چار حرف مل کر "خود آ ہوے"۔

آنکھ محروم سہی لب پہ ترا نام تو ہے — تیری ہستی کا یقیں قاطع اوہام تو ہے

شگفتہ کس قدر بیلا ہے کتنی مست جوہی ہے — تیرا ہی رنگ ہے گلشن میں خوشبوؤں میں تو ہی ہے

کیا جلوے ہیں اس کے پیشِ نظر سبحان اللہ سبحان اللہ — یہ ارض و سما یہ شمس و قمر سبحان اللہ سبحان اللہ

ہر آن کا ہے اک رنگ نیا ہر رنگ کی ہے اک شان جدا — وحدت کا شجر کثرت کے ثمر سبحان اللہ سبحان اللہ

یہ ابر رواں یہ برق تپاں یہ پرتو انجم نور فشاں — یہ پردہ شب یہ حسن سحر سبحان اللہ سبحان اللہ

یہ زمزمہ ہائے مرغ چمن یہ نشو و نمائے سرو و سمن — یہ سبزہ و گل یہ سنبل تر سبحان اللہ سبحان اللہ

اس درجہ ترقی خاک کو دی وہ ہوش میں آ کر شوق بنی — اس شوق کا خود منظور نظر سبحان اللہ سبحان اللہ

بس جائے گی اس میں سانس تری ہو جائے گا تو پاکیزہ نفس — دن رات کہا کر اے اکبر سبحان اللہ سبحان اللہ

خدا کا نام روشن ہے خدا کا نام پیارا ہے — دلوں کو اس سے قوت ہے زبانوں کو سہارا ہے

خدا ہی ہے زمین و آسماں کا خالق و مالک — اسی کی قدرت و صنعت نے عالم کو سنوارا ہے

تماشا اس کی قدرت کا ہے بر و بحر میں ہر دم — ادھر موجیں ہوا کی ہیں ادھر پانی کا دھارا ہے

اسی کے حکم سے ہے رات دن کی یہ کمی بیشی — اسی کے حکم کا تابع فلک پر ہر ستارا ہے

اسی کے حکم سے پھل اور غلہ کی ہے افزائش — زمیں پر بدلیوں سے اس نے پانی کو اتارا ہے

وہی ہنسائے وہی رلائے وہی جگائے وہی سلائے

وہی بگاڑے وہی سنوارے وہی نکالے وہی بلائے

محض تقسیم الفاظ سے ہر ٹکڑا ایک مضمون بن گیا ہے۔

اسی سے خوش رہ اسی کا غم کر اسی کو دیکھا و اسی میں گم ہو

دعا اسی سے ثنا اسی کی جو گر تو چپ ہو سنبھل جو قم ہو

قم = اُٹھ کھڑا ہو۔

جہان فانی کے کل کوائف اسی کے قدرت کے ہیں لطائف　　اسی کی رحمت پہ کوئی غافل اس کی عظمت سے کوئی خائف
دلوں کا مالک نظر کا حاکم سمجھ کا صانع خرد کا بانی　　جمال اسی کا جلال اسی کا اسی کو زیبا ہے لن ترانی

حضرت موسیٰ سے خدائے برتر نے تمنائے زیارت کے جواب میں پوچھا تھا۔

سمجھی ہوئی باتوں نے پریشان کیا ہے　　مشتاق ہوں اس کا جو سمجھ میں نہیں آتا
قائل ہمہ اوست کا ہے اکبر　　محسوس مگر ہمہ نہیں ہے

حق گوئی

بس اصل کارِ دیں تو صرف تسبیح و قناعت ہے
عوام الناس باہم جنگ کرتے ہیں زوائد پر

اہلِ مذہب میں زیادہ تر ہے بس لفظی نزاع
ایک ہی مالک جہاں کا ہے تو پھر کیسی نزاع

علم اگر ہوتا زیادہ اور ہوتی حرص کم
صلح ہوتی بیشتر لوگوں میں کم ہوتی نزاع

منطق بھی تو اک چیز ہے اے قبلہ و کعبہ
دے سکتی ہے کام آپ کی واللہ کہاں تک

ضرورت یہ ہے کہ تبلیغ میں علم کلام اور منطق و فلسفہ سے بھی مدد لی جائے محض اقسام اور حدیث پر دلیلیں مبنی نہوں۔

خوب تر ہم سے ہیں ان کے دل میں اخلاقی اصول
گو نہیں ہے دینِ ابراہیم ان کے ہاتھ میں

ہم کو سایہ پر جنوں وہ دھوپ میں مصروفِ کار
مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

مس اور سیم کو سایہ اور دھوپ سے بلحاظ رنگ تشبیہ دی گئی ہے۔ مشرق و مغرب کی سستی اور چابکی دکھائی گئی ہے۔ اخلاقی جد و جہد کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے۔

شیخ صاحب کا تعصب ہے جو فرماتے ہیں
اونٹ موجود ہے پھر ریل پہ کیوں چڑھتے ہو

یہ سوال اُن کا ہے البتہ بہت با معنی
کہ سمجھ بوجھ کے قرآن بھی کبھی پڑھتے ہو

سید سے علیگڈھ میں یہ جا کر کوئی کہدے
ہے مجھ کو طلب قوم کی قسمت سے زیادہ

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو
مذہبی درس الف بے ہو علیگڈھ تے ہو

یعنی پہلے مذہبی تعلیم ہونی چاہئے۔

سر میں سودا آخرت کا ہو یہی مقصود ہے
مغربی ٹوپی پہن یا مشرقی دستار باندھ

"کلاہ ترکی" والا اشعار اس کے ساتھ پڑھئے۔

بری تعلیم سے پیدا ہوں گو رائیں غلط لیکن
طبیعت فطرتاً ہے نیک تو بد ہو نہیں سکتی

خواہش زر میں نئی تہذیب کے پیرو بنے
وہ نہ ہاتھ آ مگر گنج معائب ہو گئے

مسلمانوں کی خوشحالی کی بیشک دھن ہے سید کو
مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے

وہ عشق کیا جو نہ ہو ہادی طریق کمال
جو عقل کو نہ بڑھائے وہ شاعری کیا ہے

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود — کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے

جسم تو خاک میں مل جاتے ہوئے دیکھتے ہیں — روح کیا جانے کدھر جاتی ہے کیا ہوتی ہے

وجد میں لاتے ہیں مجھ کو بلبلوں کے زمزمے — آپ کے نزدیک با معنی صدا ہو یا نہ ہو

امید شفا خدا سے رکھو — کیوں ترک کرو دوا کئے جاؤ

اس لئے کہ تقدیر کے لئے بھی اسباب تدبیر ضروری ہیں۔

دل کشا بادۂ صافی کا کسے ذوق نہیں — باطن افروز کوئی پیر خرابات تو ہو

طبع پر عبرت کی بدلی ایک دن چھا جائے گی — شوخی برق فنا ان کو بھی تڑپا جائے گی

دل نئے ہیں اور تمنائیں ابھی کم عمر ہیں — رفتہ رفتہ نوجوانوں کو سمجھ آ جائے گی

ہزار سائنس رنگ لائے ہزار قانون ہم بنائیں — خدا کی قدرت یہی رہے گی ہماری حیرت یہی رہے گی

کیا کہیے ہے کبر شکن قدرت خدا — ہے پوچھنے کی بات مگر کچھ نہ پوچھئے

ذرہ ہائے خاک کس ترکیب سے جکڑے گئے — جینے مرنے کے تماشے کے لئے پکڑے گئے

چل گئی موسےٰ کی لاٹھی رہ گیا جادو کا کھیل — ساحروں کے سانپ کو مارا خدا کی مار نے

ملاحظہ ہو "التاریخ الکنسیہ" حضرت موسےٰ کا عصا اژدہا بنکر تمام ساحروں کے اژدہوں کو نگل گیا

وہی قانون فطرت ہے جسے تقدیر کہتے ہیں — جسے قسمت سمجھتے ہیں وہ تدبیروں کا حاصل ہے

منزل گور تک پہنچنا ہے — خواہ چھکڑا ہو خواہ موٹر ہو

حکومت اس کی اسی کی مرضی اسی کے سب کام اور دھندے
کہاں کے انگلش کہاں کے نیٹو خدا کی دنیا خدا کے بندے

انگریز = English

خدا کے واسطے دنیائے دوں سے منہ جو موڑے ہیں — وہی ہیں مستند انساں مگر افسوس تھوڑے ہیں

فلک دیتا ہمیں کچھ اوج رخ کرتے جو پستی کا — خیالوں کی بلندی نے بٹھا رکھا ہے پستی پر

نام یوں پستی میں بالا تر ہمارا ہو گیا * جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا (ذوق)

نہیں آزاد جو اپنے سے تعلق کرے قطع — ہے وہ آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو

چیست دنیا از خدا غافل بدن * نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ہو اگر ہمت عالی دل آگاہ کے ساتھ
غیر ممکن ہے محبت نہ ہو اللہ کے ساتھ

شیخ ہوں شہر میں اور کیمپ میں سید ہوں یہ کیا
جس میں مل جل کے رہیں سب وہی بستی اچھی

کہاں کا شرقی کہاں کا غربی تمام دکھ سکھ ہے یہ مساوی
یہاں بھی اک بامراد خوش ہے وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے

خدا سے تم دل ملاؤ اپنا زباں کو پھر ملاؤ دل سے
تو دیکھ لینا کہ پر اثر ہے زباں سے جو نکل رہا ہے

جنھوں نے طاعت میں جان دی ہے انھیں کے حصہ میں زندگی ہے
مقدموں کی ہوں لاکھ شکلیں یہی نتیجہ نکل رہا ہے

مقدمے Premises

یورپ میں جو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی
لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی

ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ
دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ

ان کی تجارت ہمہ گیر ہے اور ان کی ترقی کا بہت بڑا راز ہے کاش ہندوستانی بھائی اب بھی چونکیں۔

Pear's Soap ایک صابن کا نام ہے۔

ملک پر تاثیر چشم ووٹ طاری ہو گئی
مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہو گئی

ممبری پر جنگ ہو اس میں گو کا کیا قصور
ملک میں بدنام ناحق یہ بچاری ہو گئی

دور گردوں نے ابھارا دیر کو سچ ہے مگر
یہ نہ کہئے حضرت سید نے پھر کیا کر لیا

اُن نگاہوں سے کہ جو تھیں خوگر طوف حرم
آفریں کہئے کہ بت خانے کو اپنا کر لیا

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق
نیچر تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق

لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات
مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

East is East and West is West and never the twain shall meet.

بیٹھا رہا میں صبح سے اس در پہ شام تک
افسوس ہے ہوا نہ میسر سلام تک

بہ چشم غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت
وہ اپنچیں دیا کرتی ہے اور وہ جان دیتا ہے

وہ پھنستی ہے قفس میں اور اس کا نام روشن ہے
ہو ابر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے

جب اپنے ہاتھ میں لی غیر نے عنان سمند
تو پھر سوار سے اکبر پیادہ پا اچھا

نادرشاہ نے جب دہلی فتح کی لوگوں نے ہاتھی سواری کے لئے پیش کیا ہاتھی پر بیٹھنے کے بعد اس نے کہا "عنانش مرا بدہ" لوگوں نے حقیقت بتائی فوراً ہاتھی سے کود گیا

واہ اے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا — یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوز جگر کیا کہنا — ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

قوم کا اوج ہو منظور خدا خواہ نہو
غیر ممکن ہے کہ دنیا میں تری واہ نہو

السعی و منی والاتمام من اللہ۔ میرا فرض محض کوشش کرنا ہے کاموں کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ہر قدم اُس کا شہید لغزش مستانہ تھا — سر میں تھا سید کے قرآں زیر پا مے خانہ تھا
سر سید کو فلک نے تتنے نہ دیا — تہذیب کو پھر دوبارہ جمنے نہ دیا
ملت کے شکست میں مدد دی کامل — بننے لگی جب قوم تو بننے نہ دیا
پاینر کے صفحہ اول میں جس کا ذکر ہو — میں ولی سمجھوں جو اس کو عاقبت کی فکر ہو
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر — انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ — ہم خدا ہیں
بحر عرفاں کے لئے ہے کشتی دل لازمی — سود منداس راہ میں الفاظ کا پل ہو چکا

کبھی نہیں ہو سکتا۔

خدا کی یاد میں محویت دل بادشاہی ہے — مگر آساں نہیں ہے ساری دنیا کا بھلا دینا
آفتاب اوج سعادت کا ہے وہ روشن نفس — نور طاعت جس سے ظاہر ہو دم آثار صبح
جوش اُس کو کہتے ہیں کہ جو پیری میں بھی رہے — تقوے وہ ہے کہ جس کا اثر ہے جوان پر
جس کو خدا کی شرم ہے وہ ہے بزرگ دیں — دنیا کی جس کو شرم ہے مرد شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں اُس کو کیا کہوں — فطرت میں وہ ذلیل ہے دل کا کثیف ہے

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد — اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم — کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ — ہو کے خود مجبور اب اس راز کو کرتا ہوں فاش
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو — قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش
جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو — سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش
لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز طریق — بال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم پہ خم
ایشیا کے شیشہ تقوے کو کردو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہوگیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش، جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

اس کی چتوں سحر آگیں اُس کی باتیں دل رُبا
چال اس کی فتنہ خیز اس کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغ آتش رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بار بار آتا ہے میرے دل میں اکبر یہ خیال
حضرت سید سے جاکر عرض کرتا کوئی کاش

درمیان قصر دریا تختہ بندم کردہٗ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش (حافظ)

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر (وفات سر سید مرحوم)
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہجوم بلبل ہوا چمن میں کیا جو گل نے جمال پیدا
کمی نہیں قدرداں کی اکبر کرے تو کوئی کمال پیدا

صوم ہے ایمان سے ایمان رخصت صوم گم
قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

فلک پر شان و عظمت سے ستارے جگمگاتے ہیں
خدا کے سلطنت کی جو بلی ہر شب مناتے ہیں

یہی نظارہ ہم کو محو رکھتا ہے صدا اکبر
فرشتے بے ٹکٹ یہ منظر اعظم دکھاتے ہیں

جشن صد سالہ۔

اس بات میں ہے ایک رمز نہاں اس قافیہ میں چالاکی ہے
جب آہ و بکا ذکر نہ ہو تو وہ مجلس بیباکی ہے

بے باکی ہے بغیر رونے والے کے۔ جوشیوں کے نقطہ نظر سے بیکار ہے۔
بیباکی :۔ ایسی مجلس گر یہ گستاخی اور بیباکی مترادف ہے۔

خدا کے باب میں منطق کو پھر یہ کیوں تگاپو ہے   جہاں عشوے میں فطرت کے فقط اک عالم ہو ہے
اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا   خدا کا کام ہے لطف و کرم کرنا شفا دینا

ایک حدیث میں ہے کہ ہر دوا مریض کے گلے سے اترتے وقت پوچھتی ہے کہ کیا اثر کروں۔

صاحب الفاظ کو دفتر سے بھی سیری نہیں   صاحب معنی کو صرف اک لفظ کافی ہو گیا

عاقلاں را اشارۂ کافیست۔

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا   غور جب ہم نے کیا سائنس کو دنیا پایا
راز ہستی کا کوئی آج تلک پا نہ سکا   پا گیا کچھ تو کسی غیر کو سمجھا نہ سکا

بشر کو زندگی میں غفلت امید فردا ہے   مگر دم بھر بھی اپنے قصد سے وہ جی نہیں سکتا

جب مرنا جینا کسی کے اختیار کی بات نہیں تو پھر کل کے جھمیلوں کی فکر کیوں ہو۔

آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد   لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو قیر میں
خوب مصرعہ ہے مگر کس کی زباں سے ہو ادا   یا رہوں اعزاز سے دنیا میں یا میں کیوں رہوں

ذلت کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

اک ہی موج قضا میں غفلتیں بہ جائیں گی   سرکشوں کی گردنیں اپنی جگہ رہ جائیں گی
ساقی بزم فنا کا لب پہ کپ آنے تو دو   کبر کی اڑ جائے گی قلعی وہ تپ آنے تو دو
بدن کو کچھ سمجھ سکتے ہو نشتر اور شعاعوں سے   مگر آساں نہیں تشریح استعداد روحانی

Bisecting, disecting and X'rays

نہ پوچھو مجھ سے اکبر حالت سائنس و مذہب کو   وہاں ابجد پہ ہنگامہ ہے یاں ضغط پہ بیہوشی

جہاں سائنس کی انتہا ہوتی ہے مذہب کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے پھر بھی سائنس میں ذرا سی بات پر مباحثے ہیں اور مذہب کی آخری منزل پر بھی بے خبری ہے۔

جمال صورت و معنی میں بحث رد و کد کیسی   گل و بلبل کے حق میں کیا شہادت اور سند کیسی
نہ دعوے کی ضرورت ہے نہ کوئی روک سکتا ہے   کسی میں فطرتی جوہر جو ہو وہ خود چمکتا ہے
برگد کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے   مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

حالات حاضرہ

جب نکیرین آئے مری قبر پر بہر سوال
میں نے یہ چاہا کہ لکھوادوں اُنھیں سب اپنا حال
ہاتھ پاکٹ میں جو ڈالا مجھ کو حیرت ہوگئی
یعنی جو تھی نوٹ بک وہ اس سفر میں کھوگئی
کہہ دیا میں نے کہ میں اب ہر طرح معذور ہوں
رہ گئی دنیا میں میری نوٹ بک مجبور ہوں
ہیں حضرت ساحر آج اک حصن کمال
ہے مخزن حکمت و خرداں کا خیال

سر علی محمد صاحب راجہ محمود آباد۔

اشعار اکبر کے کیوں نہوں یاداں کو
راجہ کے گھر میں موتیوں کا کیا کال (محاورہ ہے)

تھا دل حسرت[1] بھرا ارمان میں
ہم نے لکھ بھیجا انھیں موہان میں
بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم
ہاتھ میں لو اب تجارت کا علم
ہوچکی غیروں سے خوشی کی بہار
بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار
کام کو اٹھو چڑھاؤ آستیں
لایضیع اللہ اجر[2] المحسنین

[1] سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ [2] اللہ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا

پسنجر کی آمد رہی در کنار
ہوا ڈاک گاڑی میں بھی انتشار
جو لی ریل والوں نے راہ فرار
ٹریفک کا ہے بند سب کار بار
کئی دن سے سوتی ہے ای آئی آر
یہ سچ کہہ گیا شاعر نامدار

بیک گردش چشم نیلوفری
نہ انجن بماند نہ انجینری

(پہلی اسٹرائک شاہ میں)

ہوگیا ہے الہلال اما جگاہ تیر غرب
اس نئے دور فلک کی چاند ماری دیکھیئے

ابوالکلام آزاد کا مشہور رسالہ الہلال حکومت نے کچھ دنوں کے لئے بند کر دیا تھا۔

ضبطی پرچہ توحید ہوئی غیر یہ ہے
قل ہو اللہ احد ضبط نہیں خیر یہ ہے
نور ایماں کی ضرورت نہیں سمجھا سائنس
وجہ خاموشی شمع حرم و دیر یہ ہے
مغربی پارک میں چکر کے سوا کچھ بھی نہیں
دل رنگیں کی ہوا کھاؤ بڑی سیر یہ ہے

ان فکر سفر کابل و جاپان و چین کجا — ان خوض و التفات پئے کار دیں کجا
ان پاسی و آں نگہ دور بین کجا — ان خاتم جمید کجا ان نگین کجا

در دل گزار بیم بجائے امید شد
گوئی خلا بماند و خلافت شہید شد

بہت لوگ یہ کہتے ہیں

مجھ پہ ہے تقلید واجب ہند کے دربار کی — رائے میری ہے وہی جو رائے ہے سرکار کی

کوئی انقلاب زمانہ کی یوں شکایت کرتا ہے

شاہ و سلطان سے رعایا کی مروت نہ رہی — پاس ملت نہ رہا دین کی عزت نہ رہی
وہ عقیدے نہ رہے اور وہ حکومت نہ رہی — دل کا مرکز نہ رہا ہاتھ کی طاقت نہ رہی

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

اور میں یوں کہتا ہوں

کیا بحث ہے ایران سے اور ترک و عرب سے — اس وقت تجھے قطع نظر چاہئے سب سے
یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے — رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے
تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے — خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے
نکلا بآب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے[1] — اللہ اس کو گولڈ[2] بھی دے اور پرل[3] بھی
خواہش ہے اب یہ بعض محبان قوم کی — نکلے کسی طرف سے یونہی اولڈ گرل[4] بھی

[1] Old Boy طلبائے قدیم = بوڑھا لڑکا۔ ایک رسالہ کا نام [2] Gold سونا [3] Pearl = موتی۔

[4] Old Girl = بوڑھی لڑکی

قدم انگریز کلکتہ سے دہلی میں جو دھرتے ہیں — تجارب خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسی کرتے ہیں
کشت دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے — دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

رونے سے دل کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ ٹیکس کی بھر مار ہو رہی ہے دونوں باتیں کس مزے سے بیان کر دی ہیں۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب　　اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

اجازت نامہ - یہ شعر گورنر صاحب (ٹیلر) کو سنایا گیا تھا انھوں نے بہت پسند کیا۔

جنگ ٹرکی اور اٹلی کے متعلق رائیں

کوئی کہتا ہے

دکھائے گی نیا اب رنگ ٹرکی　　تھو گی مبتلائے جنگ ٹرکی

وہاں بھی آگئیں مغرب کی لہریں　　ہوئی اب ہمکنار گنگ ٹرکی

بہت خود رائے تھے سلطان سابق　　رہا کرتی تھی ان سے تنگ ٹرکی

ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن　　ترقی اب کرے گی ینگ ٹرکی

سلطان عبدالمجید کی معزولی پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

بعض یہ کہتے ہیں

بدلی وہ ہوا وہ سنبل و گل رخصت　　ساقی رخصت وہ ساغر و مل رخصت

اب دل میں ہیں دوستان ٹرکی شاداں　　لو ہو گئے پانیر کے عبدل رخصت

لیکن بعض یہ فرماتے ہیں

یلدیز سد راہ مخالف کنوں نماند　　اندیشہ حریف بحال زبوں نماند

آں تیغ عقل داں نگہ پرفسوں نماند　　سودا بجوش آمد واں رنگ خوں نماند

چوں رخت خود بہ بست دبروں از مقام شد

عبدالحمید گفت کہ ترکی تمام شد

کوئی یورش نہیں ہے ہر طرح سے خیر سلا ہے　　نہ سرگرمی پولس کی ہے نہ جاری مارشلا ہے

یہ کلکتہ کی شوخی اور یہ ڈھاکہ کی اوا سنجی　　وہ اک فرشی کبڈی ہے یہ یفظی گیند بلا ہے

یہ دیسی ورزشیں ہیں مغربی جمناسٹک ہے وہ　　نئے سن کی طنابیں ہیں کرسمس کا جھلا ہے

موکل چھٹے ان کے پنجے سے سب　　تو بس قوم مرحوم کے سر ہوئے

پپیہے پکارا کئے پی کہاں　　مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

لہ کانگریس لہ کانفرنس لہ پلیڈر = وکیل - لیڈر = رہنما۔ "پی" نکال دیجئے لیڈر رہ جائے

کامیابی کا سدلیشی پر ہر اک در ابستہ ہے — چو پنج طوطارام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا — آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

مزا ہے اسپیچ میں ڈنر میں خبر بھی چھپتی ہے پانیر میں
فلک کی گردش کے ساتھ ہی ساتھ کام یاروں کا چل رہا ہے

کہاں کا نام مجھے ہے نشان سے بھی گریز — مبارک آپ ہی کو خواہش خطاب رہے

عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر — کیا تعجب ہے جو نکلا ہے بہیمبو نمبر

جو بنگالی ہیں وہ ثابت ہوئے ہیں اس قدر ثقل — بحمد اللہ کہ غربی پیٹ میں میں خوب پچتا ہوں

رات افسوس سے کہتے تھے یہ بمبئی بھائی — ہم سے ناحق ہیں الگ کانفرنسی بھائی

ساحل نظر آتا ہے نہ مچھلی ہے نہ بمبئی — کیا لہریں لیا کرتے ہیں یہ کانفرنسی

تھا امن کسی قدر سو وہ دن بھی چلے — ظاہر کی سمت اہل باطن بھی چلے

مجلس پہ ہوا اضافہ کانفرنس — مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی ابتدا پر یہ شعر کہے گئے تھے، اپنے اختلاف کو کس پہلو سے ادا کیا ہے۔
"چلے" کا ہر جگہ نیا لطف ہے۔

شیعہ اور سنی میں جنگ اک دھوم دھامی ہو گئی — چار یار اور پنجتن کی نیکنامی ہو گئی

کیا شرف بخشیں گی ہم کو عرش پر یہ کاوشیں — جب زمیں پر تم کو غیر کی غلامی ہو گئی

ایک قرآن ایک قبلہ ایک اللہ اک رسول — بدنصیبی ہے کہ تفریق دوامی ہو گئی

مومنان امن جو کو دیر کی سوجھے گی اب — جب حرم کے صحن میں بدانتظامی ہو گئی

اشتعال آتش افسردہ اس طوفان میں — پختہ طبعوں سے الٰہی کیوں یہ خامی ہو گئی

جس نے کھولی بہر صلح و آشتی اپنی زباں — پیش حق مقبول اس کی خوش کلامی ہو گئی

صلح و آشتی کا بالواسطہ پیغام نہایت لطیف ہے کبھی تو ترحم دلائی ہے کبھی حقیقت جتائی ہے کبھی نتیجہ بد کا اظہار ہے کبھی تعجب کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے۔

اکبر کو جس عالم میں ہوں خوش ہونا چاہئے کہ پیش مخلوق بھی ان کی خوش کلامی مقبول ہو گئی۔

ممدوح خاص و عام ہیں لالہ نہال چند — دران کے فیض کا کبھی رہتا نہیں ہے بند
حکام کے حضور میں کرتے ہیں التماس — قانون سے جو ہوتا ہے کچھ شبہ و گزند
تقریر رنٹ بل کی جو کی ملک بول اُٹھا — ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند
۱۹۰۱ء

لہ قانون لگان۔

تھا باعث الم مرض جانگزائے قوم — مدت سے سن رہے تھے علیگڈھ میں ہائے قوم
آخر اودھ نے کالج طبی بنا کیا — شکر خدا کہ ہو گئی پیدا دوائے قوم

طبیہ کالج دہلی۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے جس کی بنیاد ڈالی۔

دیکھ کاریگری حضرت سید اے شیخ — دے گئی لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

(صفی) اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے ۔ اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

ملکی ترقیوں میں دوالے نکالئے — پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکالئے
کافی ہے بہر شغل کلیسائے فکر زرق — اب دل سے مسجد اور شوالے نکالئے
زاہد کی طبع دیکھ کے اس بت کو کچ گئی — وہ کیا تمام ملک میں اک دھوم مچ گئی
اکبر ہی تھا کہ دین میں دل کو چھپا لیا — وہ بھی کہاں بچا یہ کہو جان بچ گئی
میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال — بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا — ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

لہ لڑائی ہو گئی۔ خوب بکا۔

ساتھ ان کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا — بندر کی طرح اونٹ اوچھل ہی نہیں سکتا
کچھ بھی نہیں جانتے وہ چندے کے سوا — اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا
گلچیں ہیں بہت نہیں ہے بلبل کوئی — اس نکتہ کو کون سمجھے بندے کے سوا
محتاج در وکیل و مختار ہیں آپ — سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ
آوارہ ہیں منتشر ہیں مانند غبار — معلوم ہوا مجھے زمیندار ہیں آپ
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار — طپش قلب کو بنگال ایجیٹیشن سمجھو

لہ جوش

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے
ہر سمت سے بیسیوں رسالے نکلے

افسوس کہ مفلسی نے چھاپہ مارا
آخر احباب کے دوالے نکلے

لو نکلنا پڑا سڑک کے ساتھ
آج تو میرا گھر بھی نپتا ہے

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے
ترقی کے ہیجے کیا کیجئے

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظم ملت بی۔ اے میں صرف روٹی

لیکن جناب لیڈر سن کر یہ بات بولے
بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی

اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے
کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی

کچھ غرض اور ہے احباب نہ اس شک میں رہیں
بس یہ ہے شوق کہ پبلک کی جھکا جھک میں رہیں

نغمۂ مرغ سحر سے نہیں انجن کو غرض
پیٹ انگاروں سے بھر دیجئے بھک بھک میں رہیں

یہ لیڈر خود ہی مضطر ہیں مگر عشوے دکھاتے ہیں
جو شخصی زندگی ہے اس کو یہ قومی بتاتے ہیں

بجز الفاظ کے حاوی نہیں کلی پہ کام ان کے
یہ خود جزئی ہیں لیکن گیت کلی کا سناتے ہیں

کونسلوں میں سوال کرنے لگے
قومی طاقت نے جب جواب دیا

تنگ دنیا سے دل اس دور فلک میں آگیا
بس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آگیا

ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی
قوم کی حالت میں کچھ اس سے جلا ہو یا نہ ہو

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

کیا زور طبع ہو کہ نہیں کوئی ہمزباں
کیا نکتہ سنجیاں ہوں کوئی نکتہ داں نہیں

قحط الرجال کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

سختی ایام کا دیکھو اثر
گلبدن کی جا پہ سنگی ہوگئی

کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر چندہ لیجئے طومار رہنے دیجئے

روندتے پھرتے ہیں وہ مجمع اغیار کے ساتھ
خوب توقیر مزار شہدا ہوتی ہے

جو زمیں کوچہ قاتل میں نکلتی ہے نئی
وقف وہ بہر مزار شہدا ہوتی ہے

چھوڑ دہلی لکھنؤ سے بھی نہ کچھ امید کر
نظم میں بھی وعظ آزادی کی اب تائید کر

صاف ہے روشن ہے اور ہے صاحب سوز و گداز
شاعری میں بس زبان شمع کی تقلید کر

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم ۔۔۔ گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زبان نہیں ہے شمع اخلاص ۔۔۔ جلنے والے بہت ہیں دلسوز ہیں کم

چغلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں ۔۔۔ ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ ۔۔۔ ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

سید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا ۔۔۔ چرچا ہے جابجا ترے حال تباہ کا
تجھ سے ہے ترک صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج ۔۔۔ کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج ۔۔۔ راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر ۔۔۔ گذرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی ۔۔۔ کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نوخیز دلفریب گل اندام نازنیں ۔۔۔ عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُکئے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسیں ۔۔۔ "ول مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا"
اس وقت قبلہ آپ کو جھک کر کروں سلام ۔۔۔ پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ بنگلہ و بسکٹ کی دھن بندھے ۔۔۔ سودا جناب کو بھی ہو ہٹ کی کلاہ کا
ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب ۔۔۔ سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

اس نظم کا پورا لطف جب ہے کہ سودا کی مسلسل غزل اسی کے ساتھ ساتھ پڑھئے جس کا مطلع یہ ہے۔
"دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا"

بابو ہمیں نگل گئے اس عہد میں تو خیر ۔۔۔ رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

بطن ماہی میں ہوئے یونس جو بند + خار خار غم سے تھا دل دردمند (انیس)

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے ۔۔۔ ہمارے لخت دل ہیں آپ کا مال تجارت ہے

ایک ایڈیٹر صاحب کو لکھا گیا تھا کنایۃً اس کا ذکر بھی ہے کہ مصنف کی دلسوزی کی تلافی کسی طور پر نہیں کی جاتی۔

سادگی

یہ ادائیں یہ لگاوٹ یہ بلا کی چتون — میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہو

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے — کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

اگرچہ مغرب سے ساز دل ہے مرا آہنگ مشرقی ہوں — اگر بیا نو ہے انجمن میں محل خلوت میں ہیں بھی ہے

ہمارا خنجر بھی بد نما ہے اوران کی سوئی بھی ہے وہ آفت — کہ صاف بھی ہے چمک بھی رکھتی ہے گول بھی ہے مہین بھی ہے

برق کا جلوہ نظر آیا ہے مجھ کو خواب میں — قرب ان سے ہوگا الٹی ہے اگر تعبیر خواب

زہاد خشک حسن بیاں سے ہیں بے نصیب — آنکھیں خدا نے دی ہیں مگر دیکھتے نہیں

سو جان سے محو رخ جاناں ہیں تو ہم ہیں — اس آئینہ خانہ میں جو حیراں ہیں تو ہم ہیں

اے برق تڑپنے میں ہمیں ہیں ترے ساتھی — اے ابر ترے ساتھ جو گریاں ہیں تو ہم ہیں

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا + ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

یہاں بھی آرام پائیے گا کہاں اب اس وقت جائیے گا
اندھیرا چھایا ہے ابر طاری ہے مینہ برستا ہے وقت شب ہے
کسی کی قسمت میں زہر غم ہے کسی کو حاصل مئے طرب ہے
وہی بگاڑے وہی بنائے اسی کی قدرت کا کھیل سب ہے

تعز من تشاء و تذل من تشاء

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے — اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے

بنام منشی نثار حسین مہتمم "گلدستہ پیام یار" لکھنؤ

ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں — پختہ اگرچہ ہوں بیس تو دس خام بھیجئے — حسن طلب

معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس — سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے

معلوم ہوتا ہے کہ بات چیت کر رہے ہیں۔

ایسا نہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں — تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

مناسب ہے یہی دل پر جو کچھ گذرے اُسے سہنا — نہ کچھ قصہ نہ کچھ جھگڑا نہ کچھ سننا نہ کچھ کہنا
پکالیں بیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جولانا — ہماری کیا کبھی صاحب نہ مسٹر ہیں نہ مولانا
فضل ہوا اللہ کا ہوں جمع سارے سالیاں — وہ اچھالیں بال یہ چمکائیں اپنی بالیاں

بمقام جونپور بنگلہ سید عشرت حسین سلمہٗ۔

لمپ کی ہو جگمگاہٹ اور بجے فونوگراف — عشرتی جھوما کریں بچے بجائیں تالیاں
گھر رہے آباد سمدھی اور سمدھن خوش رہیں — ڈومنی انعام پائے گائے پیاری گالیاں

پیاری مراثن - پیاری اچھی

ڈھیر ہو پھولوں کا گلدستے بنائیں باغباں — پیڑ پھل دیتے رہیں مالی لگائیں ڈالیاں
سونے چاندی کی بہیں موجیں دلھن کے ہاتھ سے — لیں بلائیں اور دعائیں دیں انھیں گھر والیاں
غل مچائیں کھیل میں بچے رہے بنگلہ میں دھوم — میہمانوں کے لئے پکوان کی ہوں تھالیاں
جھانک کر دیکھیں تو جج صاحب کا دل بھی ہو نہال — کمرے کی دیوار میں دو اک بنی ہوں جالیاں

خود مصنف۔

میں تری مست نظر کا ہوں دعاگو ساقی — صدقہ آنکھوں کا کوئی جام ملے گا کہ نہیں
طالبعلموں کو تولے جاؤ کمیٹی میں نہ تم — کہیں ایسا نہو یہ قوم پہ عاشق ہو جائیں
تقاضا اضطراب شوق کا بڑھتا ہی جاتا ہے — یہ پارہ شیشہ دل میں مرے چڑھتا ہی جاتا ہے
حسرت سے دیکھتا ہوں ہر صاحب خرد کو — اس کی زباں کدھر ہے اور اس کا دل کدھر ہے
نا ملائم کیوں کہو اور کیوں سنو — بات یہ ہے چپ کرو یا چپ رہو

سیاست

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

رہنا کسی سے دب کر ہے امن کو ضروری
پھر کوئی فرقہ ہیبت انگیز ہے تو پھر کیا

کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکیں گے
گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

مے خانۂ رفارم کی چکنی زمین پر
واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

پہنچنا داد کو مظلوم کی مشکل ہی ہوتا ہے
کبھی قاضی نہیں ملتے کبھی قاتل نہیں ملتا

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنماد و جیم ان کے ہاتھ میں

پریشاں ہوش کو کرتے ہیں ٹکڑے دل کے کرتے ہیں
مگر عاقل بھی ہیں کرتے ہیں جو کچھ مل کے کرتے ہیں

آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو
ناک رکھتے ہو تو تیغ تیز سے ڈرتے رہو

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں
حماقت حاکموں سے ہے توقع گرمجوشی کی

اکبر کچھ آرہے ہو نظر بند بند سے
آخر ضرر ہوا تمھیں ناصح کی پند سے

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجئے
آپ اپنی عزت دربار رہنے دیجئے

ظالمانہ مشوروں میں میں نہیں ہوں گا شریک
غیر ہی کو محرم اسرار رہنے دیجئے

مل کے باہم کیجئے اغیار سے بحث و جدال
بے نتیجہ باہمی تکرار رہنے دیجئے

ٹیمز میں ممکن نہیں نظارہ موج فرات
ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجئے

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

سی شغال و گرگ سے جنبش ہوئی اگر
نافہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے

البتہ زندگانی شخصی کا ہے وجود
قانون میں ہر اک کے لئے زندہ باش ہے

پیمانہ ہائے ساختۂ شاہ وقت پر
محدود طالبین کی فکر معاش ہے

بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جز و غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

کرتے ہیں بتدریج وہ ظلموں میں اضافہ
مجھ پر اگر ان کا ہے کچھ احسان یہی ہے

مقوّی کو بد نہ کہئے ترغیب ہے یہ — کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہدیا تھا اک دن — اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

کمیٹیوں سے نہو گا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہو گی — خیال ملت نہو گا جب تک مفید ہرگز یہ بک نہو گی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی نانک — غذا نہو گی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک

مقوی دوا = Tonic

اگرچہ پالٹیکل بحث میں ہوئے ہیں شریک — جناب پنڈت جی چند و بابو آشوتوش
مگر ہمیں تو ہے بالکل سکوت اس مد میں — سمجھا گئے ہیں یہ مضمون سید ذی ہوش
رموز مملکت خویش خسرواں دانند — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
طبع[1] سمجھی کہ بلندی میں بڑھی جاتی ہے — زلف[2] خوش ہے کہ یہ پھانسی پہ چڑھی جاتی ہے
وہ ہے نافہم یہ عیار محل ہے نازک — اہل بینش میں یہ اک نظم پڑھی جاتی ہے

[1] قوم [2] چرخ۔

کانفرنس احباب سے پُر ہے — جو صف ہے وہ سلک دُر ہے
سب کو یاد استاد کا گُر ہے — دلکش ہر اسپیچ کا سُر ہے
قومی ترقی کی رادھا پیاری — بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری — چندے کی تحصیل ہے جاری
لائی ہیں سکھیاں بھر کر جھولی — خوب کھلی ہے برج میں ہولی
رنگ میں ڈوبی ہے سب کی چولی — سب نے زباں اس گیت پہ کھولی
شیخ کو الفت ہو گئی مس کی — خوب پئے اب شوق سے وسکی
اگلی دُنیا دھر سے کھسکی — بیٹھا کون ہے شرم ہے کس کی
جمع ہیں ممبر بھولے بھالے — جاڑوں کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے — چندہ دے کر پھنسنے والے
دیکھ کے اک باضابطہ بھپکی — دنیا آپ کی جانب لپکی
آپ نے سب کی دولت ہپ کی — بزم جمالی خالی گپ کی

دیکھتا ہے اک عمر سے بندا — بس یہی باتیں اور یہی پھندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا — لاؤ چندا لاؤ چندا
سید کا جو عہد و مشن تھا — اس سکے کا ٹھیک چلن تھا
حسب ضرورت طرز سخن تھا — وقت وہ اور تھا اور ہی سن تھا
گرمیوں میں بچوں کو تھکانا — شہروں شہروں بھیک منگانا
اور اس پر یہ بات بتانا — مفلس لڑکوں کا ہوگا ٹھکانا
آپ کہیں معیوب نہیں ہے — ہم کو تو مرغوب نہیں ہے
عمدہ یہ اسلوب نہیں ہے — ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے
تڑپوگے جتنا جال کے اندر — جال گھسے گا کھال کے اندر
کیا ہوا تیس ہی سال کے اندر — غور کرو اس حال کے اندر
کام بہت ہیں توکل و ذاتی — ان کی فکر تو کی نہیں جاتی
مفت میں بچوں کو کرکے براتی — قوم کی گاتے ہیں بھائی وفاتی

جس کا کھائیں اُس کا گائیں۔

یہ بے معنی مجلس کیسی — یہ ناحق کی گھس گھس کیسی
یہ بے حکم کی آفس کیسی — بات یہ "سٹرم ٹو پیس" کیسی
کونسل میں شریک ہوگا کل ملک — اب تھینکس کا باندھ دے گا پل ملک
اونچا سنتی ہے کیا گورنمنٹ — کیوں کرتا ہے اتنا شور و غل ملک
گائیں ناحق تھرک رہی ہیں — ویران نہ کریں گے جان بل ملک
ہوتی ہے روش جو سلطنت کی — جاتا ہے اسی طرف کو ڈھل ملک
زندہ جس سے ہے بزم قومی — وہ کون ہے حرف محسن الملک
غنچے کی طرح سمٹ کے ابھرو — اس وقت کھلے گا مثل گل ملک
چرچے ہیں نہ مذہب کے نہ وہ قصہ دل ہے — پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل ہے مضمون
اس عہد میں مائل بسوئے الحاد جو دل ہے — اس کی تو گورنمنٹ ہی رسپانسبل ہے ذمہ دار

اونٹ نے گایوں کے ضد پر شیر کو ساجھی کیا — پھر تو میڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
جس پہ رکھا چاہتے ہو باقی اپنی دسترس — منہ میں ہاتھی کے کبھی اے بھائی وہ گنا نہ دو
صاحب سے اذن لیکے کروں گا میں عشق چشم — لیسنس ہے ضرور ہرن کے شکار کو

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے — کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی — نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

یہ بھی جغرافیائی مسلہ ہے کہ جب ایشیا میں رات رہتی ہے تو یورپ میں دن رہتا ہے۔

فلک چلے ظالمانہ چالیں مچائے اندھیر جتنا چاہے
زمانہ لے ہی گا کوئی کروٹ نصیب بیکس کا سو چکے گا

ہے تگا پو اس قدر مرکز مگر کوئی نہیں — فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں
کہتی ہیں آہیں کریں گے تیری دل کا ہم ریفارم — سب مگر شہرت طلب ہیں با اثر کوئی نہیں (اصلاح)
سوچ تجھ کو ہے اگر آئندہ پالیٹکس کی — لے نتائج سے مدد اور ہسٹری میں فال دیکھ
ان کا تیر پالسی اور شیخ وبابو کا گریز — خوب ہی لطف شکار روبہ و خرگوش ہے

انھیں کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی
سنے جو اس کو اسے تحیر جو اس کو برتے اسے تردد
ہماری نیکی اور ان کی برکت عمل ہمارا نجات ان کی

قوم سے اس کی گاڑھی کمائی — آپ نے فقرہ دے کے اڑائی
اور وہ یوں بے سود گنوائی — شاہ لندن تیری دہائی
دوڑاؤ تدبیر کے ریشے — قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے — تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے
مذہب کی تعلیم زبانی — طوطا مینا کی ہے کہانی
ملا خود جو نہ ہو حقانی — پھر تو مکتب ہے شیطانی

الفاظ رٹ لینے سے کچھ کام نہیں چلتا۔

نہ نرے اونٹ ہو نہ ہو بلڈاگ
نہ تو مٹی ہی ہو نہ ہو تم آگ

چال ہے اعتدال کی اچھی
ساز حکمت کا جوڑ ہے یہ راگ

متضاد گئے جو دو طرف سے دو تار
کیا جانئے کس کو اس نے اچھا سمجھا

لیکن اس بات کا سمجھنا تو ہے سہل
سرکار نے کس کو اُن میں سچا سمجھا

ایک دوسرے کے خلاف (ٹرکی کے متعلق) ۔

مصحف مسلم نے کھولنا چھوڑ دیا
بنئے نے ٹھیک تولنا چھوڑ دیا

حاکم نے کہا نہ بولو ان سے ہرگز
ہم نے بھی سبب بولنا چھوڑ دیا

مرے نزدیک یہ پنجاب کا بلوا بھی برا
ساتھ ہے اس کے علیگڑھ کا یہ جلوا بھی برا

آپ اظہار وفا کیجئے تمکین کے ساتھ
لیٹ جانا بھی برا ناز کا جلوا بھی برا

ڈیلی گیٹوں نے بہت شعلے میں جو کی ہے صلاح
بعد عمدہ کھانے کے ایسی ڈکاریں ہیں مباح

گفتم ایران را سر جنگ نماند
ان مروی و آن ہوا و آن رنگ نماند

آغا خندید و گفت رنجے دگر است
کامروز برائے ساغرم بنگ نماند

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

لڑیں کیوں ہندوں سے ہم ہیں یہاں کے آپ بنیے ہیں
ہماری بھی دعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو

مگر ہاں شیخ جی کی پالسی سے ہم نہیں واقف
اسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

اَن = اناج - غلہ ۔

وہ نیو قوم کی ہے نہ پشتہ نہ بھیت ہے
بگڑے ہیں جو بن رہے ہیں یہ دنیا کی ریت ہے

ہنگامہ طرب نہیں یہ شورش رفارم
رنج و محن کا ساز ہے چکی کا گیت ہے

موجودہ ترقی سے خوشی کیوں نہ ہو پیدا
امید کے انجن کا بھپارا بھی بہت ہے

خوش ہیں قلمی وعدوں پہ جو ڈوب رہے ہیں
ان کے لئے تنکے کا سہارا بھی بہت ہے

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے ۔ رفارم کی پہلی قسط پر خوش ہونے والوں کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

ہمیں گھیرے ہوئے ہیں ہر طرف اصلاح کی موجیں
مگر یہ حس نہیں ہے ڈوبتے ہیں یا ابھرتے ہیں

مرا یہ شعر اکبر ایک دفتر ہے معانی کا
کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تو سب کچھ کہ گذرتے ہیں

دلکش بہت ہے افعی گیسوے اختلاف — کونسل سے کیوں کہوں کہ تیری بِل میں کچھ نہیں
بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشیں برٹش راج — کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازہ عدالت کو — کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ حسّو کے — کہ شیخ سدّو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے
محل صل علے ڈاک و تار کی ہے روش — اگرچہ دل میں نہاں عظمت رسول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن — کہ جس کو دیکھ کے حیراں چشم غول بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہروؤں کے لئے — نظر نواز ہے پتی حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو حرج کیا ہے اگر ساتھ ڈیم فول بھی ہے — نالایق بیوقوف

رزولیوشن[1] کی یورش ہے مگر اس کا اثر غائب — پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

کام اس ملک میں ہو سلف گورنمنٹ سے کیا — زہر کو ہضم کرے کوئی پپرمنٹ سے کیا

ادھر خیال نہیں مصلحان نیشن[2] کا — کہ فرط ضعف نہیں وقت اپریشن[3] کا

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض — سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا
بہر خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع — صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے — مگر اس بزم میں یہ سچ ہے کہ جی ہاں ہے بہت

شیخ آنر کے لئے آئے ہیں میدان کے بیچ — ووٹ[4] ہاتھوں میں ہے اسپیچ[5] قلمدان کے بیچ
وہی قسمت وہی قانون اور اس پر یہ بھیڑ — اے خدا عقل ہے حیران تری شان کے بیچ

تو وضع پہ اپنی قائم رہ فطرت کی مگر تحقیر نہ کر — دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر
گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے — رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ در تاثیر نہ کر
باطن میں ابھر کر ضبط فغاں لے اپنی نظر سے کار زباں — دل جوش میں لا فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر
تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے — ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

---

[1] تجویز [2] قوم = Nation [3] نشتر = Operation [4] راے = Vote [5] تقریر = Speech

گو رہتے ہیں ممبری فانی پر شاد   لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی   عاقل ہیں مکرمی بھوانی پرشاد

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو   ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہموطنو
اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد   آسماں تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ   کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ[1]   ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

پولیس خفیہ پئے انسداد جرم ہے ٹھیک   نہ چاہیئے کہ وہ ہو انسداد گپ کے لئے

عزت کی تو شناخت نہیں ہے مگر مجھے   لذت ضرور ملتی ہے کونسل کی سیٹ سے

رہ اصلاح میں گو تیز گامی خوب ہے لیکن   قدم کو لغزشیں جب ہوں ٹھہر جانا ہی بہتر ہے

قصیدے سے یہ چلتا ہے نہ یہ دوہے سے چلتا ہے   سمجھ لو خوب کار سلطنت لوہے سے چلتا ہے

تیزیاں کرتے ہیں قانون بدلنے والے   زحمتیں سہتے ہیں قانون پہ چلنے والے

خوشامد ہے بے جا دنائت[2] ہے چغلی   دل و دین کی بیشک تباہی یہی ہے
فسادات کے تم نہ حامی ہو ہرگز   گورنمنٹ کی خیر خواہی یہی ہے

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی[3] کا   لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں   ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری[4] میں   اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

وصل کا اس بت خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں   صرف بوسے میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

شاہی و حکومت کی بھی اصل ہے بیوٹی[5]   ہر طور سے انسان سمجھ لے اسے ڈیوٹی[6]
حاکم میں اگر ناز ہے اور عیش پرستی   حاکم میں اگر بادۂ نخوت کی ہے مستی
کتنا ہی زبردست و بلند اس کا ہو پایا   ہرگز نہ کہیں گے اسے اللہ کا سایا

---

۱ تقریر ۲ کپٹ رکھنا ۳ مصلحت ۔ Policy ۴ تاریخ History ۵ حسن Beauty ۶ فرض Duty

حاکم کو ضروری ہے مذاہب کی اعانت   اللہ کی ہو جس سے پرستش نہ فراغت
یہ ملک نہ فطرت کا ہے شیدا نہ خدا کا   داوا کا کہیں بت ہے کہیں رسم کا خاکا
جو شرک میں ڈوبا ہے نہ پھولے نہ پھلے گا   غیروں ہی کی امداد سے کام اس کا چلے گا
انھیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے   انھیں کا گانوں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر
جو جس کے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا   یاروں کے لئے عہدے چڑیوں کے لئے پھندے

سنوارے خود آپ ہی نے پتلے اور ان میں کنجی لگائی غزنی
لگے وہ جب وہ ناچنے اُچھلنے کسی کو پھینکا کسی کو ٹپکا

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت   ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک
مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال   دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب   بعد اس کے رفارم[1] کا کریں دل میں خیال
پابند اگر چہ اپنی خواہش کے رہو   لائل سبجکٹ[2] تم برٹش[3] کے رہو
قانون سے فائدہ اُٹھاتا ہے اگر   حامی نہ کسی خراب سازش کے رہو
ہنگامہ یہ ووٹ کا فقط ہے   مطلوب ہر اک سے دستخط ہے
منشی کہ کلرک[4] یا زمیندار   لازم ہے کلٹری کا دیدار
ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل   ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر   جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر
شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے   آخر کیا شئے یہ ممبری ہے
نیٹو ہے غیر ہی کا محتاج   کونسل تو ہے ان کی جن کا ہے راج
کہتے جاتے ہیں یا الٰہی   سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں   اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
در اصل یہ دین ہے نہ دنیا   پنجرے میں پھدک رہے ہیں منیا
اسکیم[5] کا جھولنا وہ جھولیں   لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

---

[1] اصلاح Reform: [2] وفادار رعیت Loyal Subject [3] برطانیہ British
[4] محرر Clerk [5] تجویز لائحہ۔ Scheme

بھائی صاحب تو یہاں فکرِ مساوات میں ہیں　　شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں

بعضوں کا خیال ہے کہ اس شعر میں نیئر احمد صاحب مدیر کشاف و مدیر سابق مساوات اور ظہور احمد صاحب بیرسٹر کی طرف اشارہ ہے مگر حقیقتاً کوئی خاص ہستی مقصود نہیں ہے۔

قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں　　صرف آنر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف　　اک ہمیں اس رزولیوشن کی خرافات میں ہیں
ہوش میں رہ کے کرو دور نقائص اپنے　　مغربی لوگ تو مست اپنے کمالات میں ہیں

شوخی

کبھی لرزتا ہوں کفر سے میں کبھی ہوں قربان بھولے پن پر ۔۔۔ خدا کے دیتا ہوں واسطے جب تو پوچھتا ہے وہ بت خدا کیا؟

دل بھی کانپا ہونٹھ بھی تھرائے تڑپا بھی خوب ۔۔۔ شیخ کو لیکن تری محفل میں پینا ہی پڑا

کیسی نماز بال میں ناچو جناب شیخ ۔۔۔ تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

مری تقریر کا اس بت پہ کچھ قابو نہیں چلتا ۔۔۔ جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

خود اپنی ریش میں الجھے ہوئے ہیں حضرت واعظ ۔۔۔ بھلا ان کو بتوں کے گیسوے پرخم سے کیا مطلب

مری تمھاری نہیں نبھے گی سدھارتا ہوں میں ابھی یہاں سے ۔۔۔ سلام صاحب سلام صاحب سلام صاحب سلام صاحب

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ ✦ بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

مری زردی رخ کا ذکر ہے لبہائے جاناں پر ۔۔۔ ذرہ دیکھو کہ حلوے میں پڑا ہوں زعفراں ہو کر

مری نسبت یہ فرماتے ہیں واعظ بدگماں ہو کر ۔۔۔ قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

کس قدر حار تھے سید کے وہ اجزاے رفارم ۔۔۔ علما دے رہے ہیں قوم کو تبرید ہنوز

افلاک تو ثابت ہوئے اس عہد میں معدوم ۔۔۔ اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک

پائی ہے تم نے چاند سی صورت ۔۔۔ آسمانی رہے نقاب کا رنگ

تمھیں جو دیکھ لے پھر کیا وہ محو حور جنت ہو ۔۔۔ قیامت گو کہ برحق ہے مگر تم بھی قیامت ہو

ڈاڑھی یہ بھی واعظ کے ہے تلووں پہ بھی ان کے ۔۔۔ چالاک مرے ہاتھوں کی صورت ہے حنا بھی

تمھارے وعظ میں تاثیر تو ہے حضرت واعظ ۔۔۔ اثر لیکن نگاہ ناز کا بھی کم نہیں ہوتا

جب کہتا ہوں ان سے کہ مرے دل میں ہے حسرت ۔۔۔ کس ناز سے کہتے ہیں کہ حسرت میں بھی کچھ ہے

پوچھتا ہے جب کوئی ان سے کیسے ہے تم سے عشق ۔۔۔ دیکھتے ہیں پیار سے شرما کے اکبر کی طرف (عمر ۲۲ سال)

سمجھے جو کوئی برا یہ مضمون نہیں ۔۔۔ کوئی پہلو خلاف قانون نہیں

ہر چند کہ یہ مزے پہ چکھاتا ہے بہت ۔۔۔ شیطان کا کوئی شخص ممنون نہیں

مجھ پہ کرتا ہے اعتراض حریف ۔۔۔ دل میں آیا مرے یہ شعر لطیف

دفتر اعتراض سوختہ بہ ۔۔۔ دھن او بہ چندہ دوختہ بہ

دہن سگ به لقمه دوخته به

عمدہ مچھلی مسلم و خام ملی
تحفہ پایا مراد خدام ملی

ممنوں کریم کیوں نہوں اے اکبر
وہ دام میں للّٰہ مجھ کو بے دام ملی

محمد کریم صاحب تحصیلدار میجا ۲۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء

اک دوست ہمارے ہیں تپ اُن کو شدید آئی
جھیلا کئے بیماری مدت میں شفا پائی

لاہور کے جلسے میں شرکت کو ہیں اب جاتے
حالانکہ ابھی قوت پانوں میں نہیں پاتے

میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت
وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوۃ

یہ میری غلط بندش وہ ان کی غلط فہمی
میں حد سے بڑھا شاعر وہ حد سے سوا وہمی

جو دل میں آتی ہے اسے واعظو نہیں رُکتی
سکوت خوب ہے لیکن تمھیں نے کیوں نہ کیا

میں نے کہا جو اس سے ٹھکرا کے چل نہ ظالم
حیرت میں آکے بولا کیا آپ جی رہے ہیں

حسن کے باب میں اکبر کی سند ٹھیک نہیں
یہ تو ہر اک بت کمسن کو پری کہتے ہیں

جب کہتا ہوں مرتا ہوں مری جاں میں تم پر
فرماتے ہیں مرتے ہو تو مر کیوں نہیں جاتے

یعنی مرگ کا بہانہ ہے۔ مرجاؤ تو بہتر ہے۔

وہ نیند میں ہیں شہر میں پھرنے لگے پہرے
پوچھے کوئی اکبر سے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکا تو نہیں ملا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمان نظر اس دم اک برق تجلی ہے

کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر
تھیں فقط چھریاں ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں

مغربی دھول کا سر میں نہ پہنچتا تھا اثر
اس قدر بات بہت خوب تھی عمامے میں

پھیر سکتی نہیں تقوے سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

نوں تنباکو میں ہے کیوں میم سے لکھتے ہیں لوگ
مدتوں تک میں نہیں سمجھا تھا اس مضموں کو

آج لٹریری لطیفہ یہ سنا اک دوست سے
میم نے ماہی کے نگلا حضرت ذوالنوں کو

لیا صبح شب وصل اُس کا بوسہ میں نے یہ سچ ہے — اسی پر بول اُٹھی وہ شوخ مِس یہ فائنل ٹچ ہے

Final = آخری | تصویر کی تکمیل میں جب خد و خال درست کئے جاتے ہیں تو آخری رنگ آمیزیوں کی ہلکی جنبش اور موقلم
Touch = چھونا | کے نشانات کو final touch کہتے ہیں۔

تو حشر کا منکر ہے جو اے فتنۂ دوراں — کہتا ہے کہ نیچر میں پتہ اس کا کہاں ہے — فطرت

انگریزی لفظ محض مخاطب کی مادہ پرستی ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

نیچر ہی سے ابھرا ہے ترا قامت رعنا — نیچر ہی میں واللہ قیامت بھی نہاں ہے

یہ تو زینت ہے کہ پہنے ہیں جڑاؤ بالے — یہ قیامت ہے کہ اللہ مرے کان کی خیر

مٹی کو آ گیا ہے روحوں کا پھانس لینا — سب کے گلے پڑا ہے دن رات سانس لینا
ہوش و خرد کا نزلہ تکلیف دے رہا ہے — جائز سمجھ لیا ہے یاروں نے پھانس لینا

بت مشرق نہیں محتاج سامان — کمر ہی جب نہیں کیسا کمر بند

آپ کی ہرگز نہیں کے آگے کیا بس ہے مرا — لیکن اتنا تو ذرا سن لوں کہ آخر کیوں نہیں

پڑ جائیں آ بھی آبلے اکبر کے بدن میں — پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل مئی جون

تمہاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھ کو — سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے چور آہستہ آہستہ

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر — ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو کیا آتا ہے

نیچر ہی کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبر — تم دیکھتے ہو پھل میں کوئی چھوت نہیں ہے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا — سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

لائے تو خنجر بکف ہیں ڈر کے مارے مر گیا — ان کی ورزش رہ گئی مری شہادت رہ گئی

نجد کے نغمے کہاں ان ٹھمریوں کے سامنے — دیس کو جس نے بھلایا وہی کھماج ہے

دیس = وطن - دیس = ایک راگ ہے۔

مجھ کو رنج شکست شیشۂ دل — اُن کو غصہ کہ چور کر نہ سکے

امتحانوں سے ہوئے طے بحث جبر و اختیار — (ناکامیاب) فیل جب ہو جائے مختاری میں تب مجبور ہے

نیٹو یت پر کیا ہم نے جو اظہار ملال — سن کے صاحب نے کہا "سچ ہے مگر ہم کیا کریں"

چاہتا ہوں صرف ایک بوسہ دہان تنگ کا — خواہشیں اس سے زیادہ اب کوئی کیا کم کرے

ہم ڈنر خواہی و ہم آروغ صاف   ایں خیال است و محال است و گزاف

آروغ = ڈکار - گزاف = بڑا بول -

اس بت کے لب و رخ کا لیا بوسہ پس از عقد   مجھ شاعر مشرق کا ہنی موون یہی ہے

شہد = Honey } ہنی مون وہ زمانہ ہے جو ولایتی دولھا دولھن شادی کے بعد سیاحی میں صرف کرتے ہیں
چاند = Moon } اور اُس کی میعاد دو ماہ سے دس ماہ تک حسب حیثیت مختلف ہوا کرتی ہے -

اُسے اقرار اغوا ہے یہ اغوا کو چھپاتے ہیں   علیہ اللعن ہے شیطاں لیکن ان سے اچھا ہے

بہت مبہم تمہارا مصرعہ ثانی ہے اے اکبر   اشارہ ہے کدھر شیطان آخر کن سے اچھا ہے

گول مول   آخر آپ ہی بتائیے

سایہ مدت ہوئی غبارہ بنا   پائچوں میں ابھی بھی بھری ہے ہوا

طعن وطنز

کیا ہوا شمع حرم تو نے بجھائی اے دوست — دیر کے شعلہ زبانوں نے تجھے داد تو دی
ڈنر کا مجھ کو نہیں ہے چسکا وگرنہ ہے کارڈ میں تو لکھا — شراب ہوگی کباب ہوں گے حضور عالی جناب ہوں گے
سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم — بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے
کیا خوب پڑھ رہے تھے مصرعہ منت صاحب — بھنڈار تو ہے خالی بھاری مگر بھرم ہے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے — لیکن خرید ہو جو علیگڈھ کے بھاؤ سے
میں نے اکبر سا بھی وہمی نہیں دیکھا کوئی — کہتا ہے ان کی کمر مجھ کو نظر آتی ہے
تقدیس ماسٹر کی نہ لیڈر کا فاتحہ — یعنی نہ نور دل ہے نہ شمع مزار ہے
وہ مخبر رقیب ہے میں ہوں شہید عشق — یہ اپنی اپنی ہمت وغیرت کی بات ہے
جاپان روس سے نہیں کچھ واسطہ ہمیں — چرخے کی یاں تو بحث ہے تبت کی بات ہے
مغربی تہذیب میں کس کو میں سمجھوں مستند — اس تماشا گاہ میں جو ہے وہ صاحبزادہ ہے

لوگ اپنے لڑکے کو صاحبزادہ کہتے ہیں۔ صاحب زادہ کے لغوی معنی "صاحب یعنی انگریز کا لڑکا" ہوے۔

سخن سازی کی چالوں میں تو خامہ اں کا شاطر ہے — مگر جو حالت اصلی ہے وہ پبلک پہ ظاہر ہے
صوت ہزار طائر بدلحن نے سنی — کہنے لگا کہ بھاڑ میں بلبل کی چونچ جاے
اس نے کہا مقابلہ کا کب تھا یاں خیال — یہ تو وہی مثل ہوئی "کانا ہو کھو پنچ جاے"
زر قوم سے لے کے ایسا سامان کرو — جس سے کہ تمہاری بزم بن جاے بہشت
حلوے مانڈے سے کام رکھو بھائی — مردہ دوزخ میں جاے یا پاے بہشت

مثل ہے "اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے مردہ چاہے دوزخ میں جاے چاہے بہشت میں"

دعوے بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو — طول شب فراق کو بھی ناپ دیجیے
طاعون و تپ و کھٹمل مچھر سب کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے — لمبے کی روانی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف
آج وہ ہنستے ہیں میرے جبہ و شلوار پر — ایک دن ان کو فلک بندھواے دھوتی تو سہی
اپنی اسکولی بہن پر ناز ہے ان کو بہت — کمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی

اپنی دھن میں ابرو کی کچھ نہیں پروا نہیں — نذر معجون ترقی ہو یہ موتی تو سہی
نزاکت پر ستم ان کا یہ جوڑا اس قدر بھاری — ڈوپٹہ ہے مصیبت پائچہ مشکل سے اُٹھتا ہے
حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں — پئے تکریم مہماں بن سنور کے بی بیاں آئیں
طریق مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں — دلوں میں ولولے اُٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں
امنگیں طبع میں ہیں شوق آرایش کا بلوہ ہے — کھلیں گے گل تو دیکھوگے ابھی کلیوں کا جلوہ ہے
کرتے کیا ان سے بھیٹ خالی — کر آئے ہم اپنی ٹینٹ خالی
عیش کا بھی ذوق بیداری کی شہرت کا بھی شوق — آپ موزک ہال میں قرآن گایا کیجئے
تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر — یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدم بنے کیونکر
کسی کو بھی کسی سے کچھ نہیں اس بات میں جھگڑا — کرو تم دھیان پرمیشر کا دل کو اس کا درشن ہو
مگر مشکل تو یہ ہے نام سب لیتے ہیں مذہب کا — غرض لیکن یہ ہوتی ہے جنتھا ہوا اور بھوجن ہو
یوسف کو یہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی
وعظ الحاد کہو واہ نہیں ہے نہ سہی — تم سلامت رہو اللہ نہیں ہے نہ سہی
شب غفلت میں نہ ہو روز ازل کا پرتو — لیپ بجلی کا تو ہے ماہ نہیں ہے نہ سہی
ہے گدام آپ کا مسجد کی ضرورت کیا ہے — پیٹ تو ہے دل آگاہ نہیں ہے نہ سہی
ہے پرس پایے قلم کے لئے موجود اے دوست — سر کو سجدے سے اگر راہ نہیں ہے نہ سہی
سردس میں میں داخل نہیں ہوں قوم کا خادم — چندوں کی فقط اس سے ہے تنخواہ کہاں ہے
رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم — یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولے

سر محمد اقبال کی ایک مثنوی کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور عرصۂ انگلستان میں ان کی نظم بہت مقبول ہوئی۔

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جاں — خدمت قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی

ایک لیڈر صاحب دعوت سے واپس ہوے تو ہیضہ ہوا اور مر گئے۔

نہ سہی لطف لحم گھی ہی سہی — شیخ صاحب مہنت جی ہی سہی
زندگی کو ضرور ہے اک شغل — خیر بالفعل لیڈری ہی سہی

لیڈروں[1] کی دھوم ہے اور فالور[2] کوئی نہیں ‏ ‏ ‏ سب تو جنرل[3] ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

[1] رہبر = Leader - [2] چیلے Follower - [3] فوجی افسر = General

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز ‏ ‏ ‏ جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال ‏ ‏ ‏ خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے ‏ ‏ ‏ ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

وہ خرافات پر ہیں داو طلب ‏ ‏ ‏ واہ وا پر عجب مصیبت ہے

ظرافت

سرافرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹئے انکی　　اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہئے

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے　　شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے

شکم کی پیٹھ ٹھونکی نفس امارہ نے خوش ہو کر　　صدائے باطنی اُٹھی کہ یہ کمبخت کافر ہے

لسان تیغ کبھی سرخرو یہ ہو نہ سکی　　عجب نہیں کہ اسی سے تفنگ پر تف ہے

تفنگ توپ۔ تفنگ سے "نگ" نکال دیجئے تف باقی رہتا ہے جس کے معنی تھوک یا تھڑی کے ہیں۔

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی　　لیلےٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

شکم سے حضرت انسان نجات پا نہ سکے　　اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

اپنے پیٹ کی فکر میں ہیں۔

محو اضافہ وہ بت کھیوٹ پرست ہے　　کہتا ہے آخرت کا بھی بندوبست ہے

اپنے عیوب پر تو ذرا بھی نہیں نظر　　اوروں پہ اعتراض میں ہر وقت مست ہے

کیوں اپنے سر پہ زحمت بے سود لیجئے　　کونسل کے بدلے گھر میں اچھل کود لیجئے

کھاپی کے گھر میں بیٹھئے اور گائیے بھجن　　کاشی سے جل پراگ سے امرود لیجئے

ہو وضع اپنے دیس کی مال اپنے دیس کا　　بہتر ہے راہ منزل بہبود لیجئے

اک ادا سے کہا مسوں نے کم آن　　تیر کی مجھ میں اب روانی ہے

ادھر آ = Come on ۔ کمان = غلیل۔

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے　　قافیہ ان کا ملا تھا انت سے

قسمت اب بگڑی تو انمیں درد ہے　　اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے

خواب راحت کس کو کھانا کون کھائے　　رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے

درد کے آگے رہا منجن بھی گرد　　مصطگی بھی رہ گئی بار وئے زرد

حضرت اکبر الہ آبادی نے جو خاص نام اور مرتبہ دنیائے ضحافت وسخن میں حاصل کیا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ موصوف کا دلکش کلام ہند کے گوشہ گوشہ میں عزت و محبت کے ساتھ پہنچ چکا ہے

طرز بیان اس قدر سلیس اور عام فہم ہوتا ہے کہ عورتیں اور بچے بھی بقدر ذوق و ادراک محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ظرافت کے متعلق قرونِ وسطیٰ کے ایک زبردست فلسفی کا قول ہے "زندگی کے جتنے منٹ تفریح میں گذر جاتے ہیں وہ حیات میں شمار نہیں کئے جاتے"۔ دوسرے لفظوں میں اصل مفہوم یوں سمجھ لیجئے کہ جو وقت تفریح میں گذر جائے انسانی زندگی اسی قدر بڑھ جاتی ہے۔ طبی اعتبار سے بھی تفریح صحت کا جزو اعلیٰ ہے، یہی وجہ ہے کہ مہذب ملکوں میں جسم و دماغ کی تسکین و تفریح کے لئے تھیٹر۔ سینما۔ بال روم۔ کتب خانہ۔ کلب گھر۔ تاش۔ شطرنج۔ گیند بلا۔ ٹینس۔ ہاکی۔ گھوڑ دوڑ وغیرہ ہزاروں قسم کے کھیل رائج ہیں۔ حضرت اکبر کی عام قبولیت اس امر پر شاہد ہے کہ ظرافت کے پیرایہ میں خشک سے خشک مضامین نہایت دلچسپ و موثر بنائے جا سکتے ہیں۔ موصوف کے کلام کا خیر مقدم ہندوستان جیسے ملک میں بھی ہر جگہ اور ہر طبقہ میں کمال گرمجوشی سے کیا جاتا ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس بہتے ہوے دریا میں ہر مذاق اور ہر طبیعت کے موافق انمول موتیوں کا ڈھیر ہے۔ ظرافت کا لفظ بہ نفسہ نہایت جامع اور وسیع ہے۔ ظرافت کی بہترین تعریف جو زمانہ موجودہ و گذشتہ کے زبردست فلسفیوں نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے یہ ہے "ظرافت ایک لطیف اثر ہے جس سے انسانی دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔

ظرافت کے لئے (جیسا عام طور پر سمجھا جاتا ہے) ہنسی یا مسکراہٹ ضروری نہیں ہے یہ لطیف اثر اکثر الفاظ یا حرکات میں مضمر ہوتا ہے۔

ظرافت کی قسمیں جن سے اکبر کا کلام مالامال ہے کم از کم میرے احاطۂ شمار سے باہر ہیں بہر طور چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

رشوت ہے گلوے نیکنامی کا چھرا — عیاشی بھی ہے بدی کے پہئے کا دھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بری — گستاخ مگر خوشامدی سے بھی برا

یہ اخلاقی ظرافت ہے۔

چار مصرعوں میں ہندوستان کے چار طبقوں (راشی۔ عیاش۔ خوشامدی اور گستاخ) کی مکمل تصویریں موجود ہیں۔ چھرا اور دھرا صرف قافیہ کی غرض سے نہیں لائے گئے بلکہ خاص مفہوم کے حامل ہیں۔ اہل نظر و تجربہ خوب جانتے ہیں کہ راشی آدمی خواہ کیسے ہی معزز عہدہ پر ممتاز ہو

اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصہ میں حضرت معلم الملکوت کی طرح مشہور و نیکنام ضرور ہو جاتا ہے فارسی کے اکثر شعرائے رشوت کو خنجر طلائی، سے تشبیہہ دیا ہے دوسرے مصرعہ میں دائرہ بدی کے اندر عیاشی کا وہی مرتبہ دکھلایا گیا ہے جو اہمیت پہئے میں دھرے کی ہے۔ کیا اس امر سے کوئی عقل والا انکار کر سکتا ہے کہ عیاشی اور صدہا برائیوں کا ساتھ چولی دامن کا ہے سب سے پہلی بدی جو عیاشی کا ضمیمہ ہے قرض کی عادت ہے۔ نفس امارہ کی "بالک ہٹ" پوری کرنے کے لئے قرض دام کی لت ہو جاتی ہے جن کا آخر نتیجہ یہی ہے کہ اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ دوسری بدی شراب اور کسی منشی شے کا استعمال ہے۔ تیسری بدی خرابی صحت ہے جس کی بدولت عیاش کا کیسۂ زر ہمیشہ حکما اور اطبا کے لئے کھلا رہتا ہے مگر کب تک؟ بعض وقت مقدمہ بازی مارپیٹ اور قتل و غارت کا اصلی سبب یہی عیاشی ہے۔ بے محل خوشامد بُری ضرور ہے لیکن گستاخی سے کہیں اچھی ہے۔ گستاخی سے کوئی ضرورت رفع نہیں ہوتی مگر خوشامد سے ۵۰ فیصدی' کام چل جاتا ہے۔ اگر ان چاروں مصرعوں کو وسعت دی جائے اور اثرات و نتائج سے واقعات کے ساتھ بحث کی جائے تو چار مستقل کتابیں لکھی جا سکتی ہیں مگر علم و فضل کا بہترین مصرف یہی ہے کہ دریا کو کوزہ کے اندر بند کر دیا جائے۔ وہ تمام نصیحتیں جو ان چند لفظوں میں سامع کے حواس پر اثر ڈالتی ہیں اگر دنیا کی بیش بہا جواہر کے ساتھ تولی جائیں تو بھی انھیں کا پلہ بھاری رہے گا۔

چٹکیاں اک دوسرے کی وقت پڑتے بھی ہیں ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ ہیں لظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

یہ سیاسی ظرافت ہے۔

مگر معاشرتی پہلو لئے ہوئے۔ چوتھے مصرعہ میں شستگی بیان۔ لطف زبان۔ بندش محاورہ نشاط تشبیہ اور بلاغت کے علاوہ حسیات و جذبات کا ایک دریا لہریں لے رہا ہے۔ لڑنے اور ملنے کے مختلف مگر برابر کی لطیف کیفیتوں کا لطف انھیں کے دل سے پوچھئے۔ جو صاحب نظر ہیں پہلے مصرعہ کی چٹکی جڑنا' چٹکی کھانے سے زیادہ عمدہ ہے۔ محاورات میں تصرف بھی نہیں۔ پہلے اور دوسرے میں بعض وطن پرست حضرات کی دو خاص کمزوریوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں ہندو و مسلم کے اتحاد کی ضرورت اور اہمیت آزادی کے ساتھ دکھائی گئی ہے کہ

ہندو و مسلم ایک جسم کی دو آنکھیں، ایک آنکھ کی دو نگاہیں اور ایک نگاہ کی دو کیفیتیں ہیں۔ کیا کیفیت نگاہ سے، نگاہ آنکھ سے اور آنکھ جسم سے دور ہو سکتی ہے؟ کاش ہندو اور مسلمانوں میں تعصب کے بعض متوالے اس حقیقت کو سمجھ لیں اور غریب ہندستان کو۔ کلکتہ۔ سرحد۔ کانپور اور بمبئی کے ناگوار شر و فساد سے فرصت نصیب ہو جائے۔

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی   "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"
لیکن اخلاق نظر میں اس سے بہتر تو ہے وہ   "من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو"

یہ ادبی ظرافت ہے۔

اس رباعی کا صحیح اطلاق زیادہ تر رسائل و اخبار کی موجودہ دُنیا پر ہے جہاں کچھ ہستیاں ایسی نظر آئیں گی جو ادبی تنقید اور علمی تبصرہ سے قطع نظر کرتے ہوئے ذاتیات پر حملہ کرنے کے لئے ہر وقت قلم بکف رہتی ہیں اور اپنی بے حجاب تحریر میں اخلاق و تہذیب کے تمام پہلو فراموش کر دیتی ہیں بعض لوگ اپنی معیشت کا ذریعہ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ معاصرین کو گالیاں دی جائیں۔ مرحوم کی رباعی ایسے حضرات کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ اخبار کے ناظرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چوتھے مصرعہ والا مرض لیڈروں میں بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ   تا دم مرگ رہے یاد خدا جان کے ساتھ
میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی   سر ملانا تمہیں کیا فرض ہے شیطاں کے ساتھ

یہ مذہبی ظرافت ہے۔

ان مصرعوں میں استقلال و صداقت کے سبق دئے گئے ہیں۔ بعض لوگ محض ان مجبوریوں سے کہ زمانہ کا رنگ بدل گیا ہے غیروں کی روٹیوں پر پلتے ہیں اور صدق و صفا کے راستہ سے بھٹک کر بُروں کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی   خیال ملت نہ ہوگا جبتک مفید ہرگز یہ بک نہ ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی مانک   غذا نہ ہوگی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک

ایسے مریض جن کی غذا صرف اطباء کی مقوی ادویہ تک محدود ہو گئے دن چل سکتے ہیں دوائیں معاون و محرک ہیں جو فطرت کی زنگ خوردہ مشین کو صاف کر دیتی ہیں کبھی کوئی دوا کوئی نئی قوت

نہیں پیدا کر سکتی - یہی حال اصول کے درستگی کی ہے اگر بنیاد ٹھیک نہیں تو لکچروں کے قلعے اور ستیا گرہ کے محل سب بیکار ہیں۔

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی — دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی — کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

یہ اقتصادی ظرافت ہے۔

ہندوستان کے تجارت پیشہ طبقہ کو خاص طور پر نصیحت کی گئی ہے کہ مشترک سرمایہ و مشقت سے کارخانے جاری کر کے تمام منافع اور سہولیتیں قابو میں کر لی جائیں جو امریکہ اور جاپان۔ جرمن و انگلستان کو حاصل ہیں۔ انفرادی حیثیت سے تمام ترقیاں محدود ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان نعم فطری سے مالا مال ہے۔ جس قدر لوازم تجارت وصنعت (Raw Material) ہندوستان میں موجود ہے۔ دنیا کے کسی حصہ میں نہیں۔ اگر اصل المال اور محنت مشترک کر لی جائے تو قالین باقی تجارب انبہ وغیرہ سے کڑوروں روپے ایک دن میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

پاکیزگی نفس کی دشمن مے ہے — انسان کو خراب کرنے والی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیوٹ سکریٹری — مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

یہ اسلامی ظرافت ہے۔

"ہے" "ہے کی لفظی تکرار میں صدہا لطافتیں ملفوف ہیں۔ نشہ کی حالت۔ خمار کی کیفیت۔ عبرت کا سوز و گداز۔ منہ کا بگڑنا۔ تھو تھو کرنا سب ان دو لفظوں ہے۔ ترک مے کے لئے کیا اچھی دلیل لائی گئی ہے کہ بیگم صاحبہ شراب مسٹر شیطان کے کابینۂ وزراء کی خاص الخاص سکریٹری ہیں۔

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رک نہیں سکتی — کسی سے مغرب و مشرق کی سازش رک نہیں سکتی

تعلیمی ظرافت۔

وہ نزلہ رک نہیں سکتا یہ پیچش رک نہیں سکتی — بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رک نہیں سکتی
مذاق قوم بیگانہ نہ ہو اللہ اکبر سے
یہ نقش جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

تہمد پہ ہے شبہ و حقارت کی نظر — پتلون پہ غصہ و شرارت کی نظر
بہتر ہے یہی برہنہ پھرئے اکبر — شاید پڑ جائے ان کی رغبت کی نظر

اس قطعہ میں جو ابتذال ہے وہ ظاہر ہے مگر شاعر کی نظر سے مستقبل کے پردے اُٹھ جاتے ہیں وہ بہت دور تک دیکھتا ہے۔ آج جرمن۔ فرانس۔ انگلستان وغیرہ میں نہ صرف برہنہ ناچ ہوتے ہیں بلکہ مادر زاد برہنہ مرد عورت لڑکے لڑکیاں سب کے ناچ گھر، باغ، حوض، کلب، تفریح گاہیں بھی بنتی جا رہی ہیں۔

پائے در پتلون و دل در شعر از — چند روزے با ہمیں حالت بساز
سنتا ہوں محال ہے خدائی سے گریز — لیکن کہتا تھا مجھ سے کل اک انگریز
تم مانگ لو اپنے شاعروں سے گھوڑا — فطرت کے حدود سے زیادہ ہے وہ تیز
حقیقت میں میں بلبل ہوں مگر چارے کی خواہش میں — بنا ہوں ممبر کونسل یہاں مٹھو میاں ہو کر
بی شخانی بھی ہیں بڑی پُر جوش — کہتی ہیں شیخ سے بجوش و خروش
خواہ لنگی ہو خواہ ہو تہمد — در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش
آگے انجن کے دین ہے کیا چیز — بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

"بھینس کے آگے بین بجے اور بھینس کھڑی پگھرائے"

پتنے نے کہا سبک نشینی میری — ہے قابل داد اگر کریں آپ معاف
میں نے یہ کہا بجا ہے لیکن یہ نیش — ہے بارگران و تلخ تقصیر معاف
آگئی زلف مساں زلف بتاں پر غالب — پیچ ہوتے تھے بہم افعی و راسو کی طرح

سانپ اور نیولا۔

اکبر اس عہد میں لے صبر و تحمل سے جو کام — اس سے اچھا ہے کہ غصہ کرو بابو کی طرح
مچھروں نے بہت ستایا رات — میں نے کوسا کہ تم کو ہو طاعون
بولے اس کا ہمارا منبع ایک — کیوں وہ کرنے لگا ہمارا خون
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات — انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے
ہر چند کہ مجھ کو اعتقاد اب تک ہے — تاہم بلحاظ وقت دل میں شک ہے
بیٹھے تو بہت ہی سر جھکا کر ہیں حضور — کیا جانے مراقبہ ہے یا پینک ہے

میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہوگیا　　رہ گئے نغمے حدی خوانوں کے ایسی تان لی

جھکا ہے سر اپنا پائے بت پر زبان پر ہے گلا جفا کا　　میرے عمل میں ہے طرز سید غزل میں انداز لاچیت ہے

کہاں کے ہندو کہاں کے مسلم بھلائی ہیں سب نے اگلی ریتیں

عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ نہ گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت　　کبوتر اُڑ گئے انجن کی پین سے

شایق تحقیق کے یہ مضموں سن لیں　　انساں کی شکل جیسے میموں بنا

یا جامہ بھی یونہی ارتقاء سے بدلا　　سمٹا ابھرا غرض کہ پتلون بنا

بوزنے کو ارتقاء نے کر دیا انسان تو کیا　　انقلاب حرف نے مولی کو ولیم کر دیا

مولی کے حرفوں کو اُلٹئے ولیم ہو جائے گا۔ مولی کا لفظ مولے بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

ہوا پر دی جگہ اللہ نے عزبی مشینوں کو　　زمیں سے عجزہ انجینیری اب اُٹھ نہیں سکتا

موج نصیحت اک طرف دل کی روانی اک طرف　　کل شیخپورہ اک طرف میری جوانی اک طرف

جوانی کی مجبوریاں دکھائی گئی ہیں۔ شیخپورہ۔ بستی شیخپورہ ایسی بستی جہاں صرف شیخ ہی شیخ آباد ہوں۔

دربار سلطنت میں ہے کبر و خود پسندی　　مذہب میں دیکھتا ہوں جنگ اور گروہ بندی

رندی و عاشقی کا ہے شغل سب سے بہتر　　لمینڈ ہے اور وِھسکی بندہ ہے اور بندی

شربتی لیمو }
شراب }　یعنی کسی سے کچھ مطلب نہیں۔ اپنے رنگ میں مست ہیں۔ اپنے کام سے کام ہے۔ بندہ ہے اور بندی۔ میاں ہیں اور بیوی یا ہم ہیں اور معشوق۔

غلطی مجھ سے ضرور یہ ایک ہوئی　　پیدا وجہ نصیحت نیک ہوئی

لینا تھا لغت سے اور ہی لفظ کوئی　　مس کو جو لیا یہ مجھ سے مسٹیک ہوئی

Mistake = غلطی۔ مس دوشیزہ Miss لینا = Take دونوں ملنے سے جدت کی جان ہوگیا

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ✤ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی۔ تبدیلی الفاظ سے نئے معنی پیدا کئے ہیں اور نیچر و سائنس کے معاملات میں ہندوستان کی غربت دکھائی ہے۔

مجھ خستہ کی ہستی نہیں کچھ آپ کے آگے — بھرتے کی ہے کیا اصل مٹن چاپ کے آگے

ایک انگریزی کھانا ہے جس میں گوشت کو بھون کر سکھا کر نہایت سخت کر دیتے ہیں ۔ بھرتہ آلو کا بنتا ہے اور بہت خستہ ہوتا ہے۔

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے — اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

مشہور ہے کہ جو مکہ کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے وہ بہت جلد سیدھے رستہ پر آجاتا ہے۔

اکبر بھی قومی کام کو اُٹھے بشوق مغفرت — ہر ہائینس کے ہم عنان ہز ہولینس بھی ہو گئے

(شاہی خطاب His Highness عالیجاہا ۔ (جدت طبع His Holiness جناب یکہ و تنہا صاحب

کی ہے معدے نے کمیٹی پیٹ میں — بائی لاہر اک کے اندر ٹھیک ہے (قانون)

حضرت نزلہ ہیں صدر انجمن — دم بدم ان کی بھی اک تحریک ہے

جب کہا گیسو کا بوسہ دیجئے دل لیجئے — ہنس کے بولے آپ کو سودا ہے مسہل لیجئے

اس کی بیٹی نے اُٹھا رکھی ہے دنیا سر پہ — خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہوا

بنت عنب ۔ دختِ رز کی طرف اشارہ ہے۔

پارک میں ان کے دیا کرتا ہے اسپیچ وفا — زاغ ہو جائے گا اک دن آنریری عندلیب

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا — جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

مرے خطبے اثر ہیں اس نگاہ ناز کے آگے — وہاں ہے تار بجلی کا یہاں کاغذ کے گھوڑے ہیں

کچھ مزہ گیہوں کا کچھ حوا کے کہنے کا خیال — آپ ہی کہئے کہ اس موقع پہ آدم کیا کریں

بعد سید کے میں کالج کا کروں کیا درشن — اب محبت نہ رہی اس بت بے پیر کے ساتھ

عرب کی مدح بھی ہے شرق کی تحسین کے ساتھ — ہم پیانو بھی بجانے لگے اب بین کے ساتھ

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا — انس اس وجہ سے کم رکھتے ہیں یاسین کے ساتھ

یاسین نام یا سین سورہ یٰسین جو نزع کے وقت مرنے والے کو سنائی جاتی ہے۔

شوق طول و پیچ اس ظلمتکدہ میں ہے اگر — بات سن بنگال کی بنگالنوں کے بال دیکھ

بنگالیوں کی بات الجھی ہوئی ـــــ ہوتی ہے ان کے بال پاؤں تک لہراتے ہیں دو خصوصیات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔

شیخ دمساز پیالو ہو کے بھولے اپنی لے   گو سریلے ہو گئے لیکن بری گت ہو گئی

کیوں نہ لوں نام خدا اُس بت کی صورت دیکھ کر   لوگ کہتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کے مرنا چاہئے

دوپہر کو مرے گھر آئی مس رشکِ قمر   کہہ دیا میں نے کہ یہ نون کا موّن اچھا ہے

دوپہر کا چاند ۔

جب ضرورت ہوگی تقوی کی تو دیکھا جائے گا   اب تو بزم مغربی ہے اور نوشا نوش ہے

عرب کہتے تھے تم جس کو وہ کمسریٹ کا خچر تھا   جسے شایستگی سمجھے تھے آخر کرکری نکلی

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی   شب گناہ نماز سحر یہ خوب کہی

مدتوں قائم رہیں گی اب دلوں میں گرمیاں   میں نے فوٹو لے لیا اس نے نظر پہچان لی

باہم شب وصال غلط فہمیاں ہوئیں   مجھ کو پری کا شبہ ہوا اُن کو بھوت کا

عارض نہ ان کا گل ہے نہ دل میرا آئینہ   رنگین جھوٹھ وہ ہے اگر یہ ہے سادہ جھوٹھ

اپنی جبیں سے چین کے مالک ہو تم اگر   میں بھی ہوں شاہ روس کہ دل میرا زار ہے

چین = China چین شکن ۔ زار ۔ نحیف ۔ زار شاہ روس کا لقب ۔

تہذیب مغربی میں بوسہ تلک ہے معاف   اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

مجنوں کے پیاس کو بجھاتی   لیلے کچھ باولی نہیں تھی

باولی = نادان، پاگل ۔ باولی = بڑا کنواں ۔

شاخ میں پھل کا لگا رہنا ہے خامی کی دلیل   عقل پختہ ہو کے میرے سر سے زائل ہو گئی

بڑھا پاتا ہوں بنگالی کا درجہ ہر طرف صاحب   زمانے میں نیا یہ دور ہے ماہی مراتب کا

ماہی مراتب = عزت و عظمت (بنگالی کثرت سے مچھلی بھات کھاتے ہیں)۔

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم   اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

گولی = بندوق کی گولی ۔ گولی چورن کی ۔

سکۂ زر بابوے در دھوتی زر دار داشت   باوجوش نالہاے زار در اخبار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست   گفت مارا خوف فیس و ٹکس دریں کار داشت

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس   بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا لوٹس

آیندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر — فوراً داغوں گا اک ڈیفیمیشن سوٹ

ہتک عزت کا دعویٰ۔

شیطان کا سنا جو شیخ صاحب نے یہ قول — بولے کہ فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہول
میں خود ہوں بدل گیا زمانے کے ساتھ — پڑھتی ہے مجھی پہ اب تو دنیا لاحول

حضرت اکبر سے سن کر یہ لطیفہ بزم میں — سب ہنسے کچھ رہ گئے خون جگر کے پی کے گھونٹ
شیخ جی رفرف بنے پھرتے تھے پہلے چرخ پر — چشم بد دور اب بنے ہیں آپ کمسریٹ کے اونٹ

اکبر اگرچہ موسم باراں خوش است و خوب — لیکن چوں گوش و چشم دریں فصل وا کنید
مچھر دود کہ گوش بہ فریاد بندہ نیز — بھنگار سد کہ گوشہ چشمے بما کنید

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے — یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

جناب صفی نے [illegible] کی آل انڈیا شیعہ کانفرنس میں لخت جگر کے سلسلہ ضمیمہ میں الہ آباد کی عموماً اور خسرو باغ کی خصوصاً مدح سرائی کی ہے جس میں مبالغہ بھی ہے اس کے ساتھ اکبر کا یہ شعر پڑھنا چاہیئے۔

شیخ بھی ہیں دہر کے قائل بس اتنا فرق ہے — مجھ کو بوسہ چاہیئے اُن کو سموسہ چاہیئے

(بوسہ = جذبہ دلی۔ سموسہ = پیٹ کی خواہش)۔ ایک لطیفہ مشہور ہے۔ زیب النسا = (در پس پردہ) "چیزے می خواہی" مہمان: "سنبوسہ بیبن بیار"۔ یعنی بیبن کا سموسہ لاؤ۔ یا سنبوسہ میں سے سن نکال دیجئے تو بوسہ رہ جاتا ہے۔ بیبن کا سنبوسہ یعنی بوسہ لاؤ۔ زیب النساء (خفا ہو کر) از مطبخ ما در طلب (ا) میرے باورچی خانہ سے منگا لیجئے (ا) ماں کے باورچی خانہ سے منگائیے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ — می برد ہر جا کہ میز است و پلیٹ

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست ٭ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"۔ بعض زبردستی کے لیمو نچوڑ مصاحبین اور حاشیہ نویسوں کا مضحکہ ہے۔

درکار چندہ سیم و زر از جیب دور رفت — مال حضور بود بجائے حضور رفت

"مال حرام بود بجائے حرام رفت"

ہے دل روشن مثال دیوبند — اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
ہاں علی گڈھ کی بھی تم تشبیہ لو — اک معزز پیٹ بس اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز — گو کہ فکر آخرت ہے اصل چیز

نہ ہر کہ ووٹ بہ بیند و خست ممبری داند نہ ہر کہ بحث بیاموخت لیڈری داند
نہ ہر کہ ہیٹ بپوشید و کوٹ در بر کرد ادائے مغرب و آئین مسٹری داند

دربار ۱۹۱۱ء دہلی اک طرف لوکل مجالس اک طرف مرزا کا چم خم اک طرف بدھو کی گھس گھس اک طرف
راجہ میں ہندی فربہی موٹر کی طینت آتشی مرطوب و بارد اک طرف اور حار د یابس اک طرف

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار حکم حاکم سے ہوا تھا اجتماع انتشار
آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین پھول اور سبزہ چمک اور روشنی ریل اور تار
کیمپ و سین اور برق اور سٹرو لیم اور تار پین موٹر اور ایرو پلین اور جھمگھٹے اور اقتدار
مشرقی پتلوں میں تھی خدمتگزاری کی اُمنگ مغربی شکلوں سے شان خود پسندی آشکار
شوکت و اقبال کے مرکز حضور امپرر زینت و دولت کی دیوی ایمپرس عالی تبار
بحر ہستی لے رہا تھا بیدریغ انگڑائیاں ٹیمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہمکنار
انقلاب دہر کے رنگین نقشے پیش تھے تھی پئے اہل بصیرت باغ عبرت میں بہار
ذرے ویرانوں سے اُٹھتے تھے تماشا دیکھنے چشم حیرت بن گئی تھی گردش لیل و نہار
مصلحت آمیز ہر طرز و طریق انتظام حکمت آگیں ہر ادائے حاکمان نامدار
جامے سے باہر نگاہ ناز فتاحان ہند حد قانونی کے اندر آنریلوں کی قطار
خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا فکر ذاتی میں خیال قوم غائب فی المزار
نفس کے تابع ہوئے ایمان رخصت ہو گیا وہ زنانے میں گھسے مہمان رخصت ہو گیا

امتیاز خصوصیت مصطلحات، قوافی، تبدیلی پن، اشارات۔

پھرتی ہے ارض آفتاب کے گرد بندہ چکر میں ہے جناب کے گرد
شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں
ہنگامہ محشر کا تو مقصود ہے معلوم دہلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں
ہیں کلکٹر نزع میں سلے کھڑے ہیں وم بخود جب خدا ہی ہو گیا حاضر تو ناظر کیا کریں
سب پہ حاوی ہیں لعبتان فرنگ چپ ہیں بیگم بھی بت ہیں رانی بھی
بوڑھے ہنسی کو اپنی ثابت کریں تو کیوں کر جب دانت ہی نہیں ہے پھر کون چیز نکلے

ایک بعبت چلبیں کو لندن سے جو بیاہ کے لائے مفاعیلن — احباب نے تیر مطاعن سے ان کے دل کو مجروح کیا
باپ ان کے یہ بولے کشتی مری وا اعمد ڈبو دی ہائے غضب — اس لڑکے نے صحبت بد پاکر یہ کار ابن نوح کیا
تعلیم کو بھیجا تھا میں نے تزویج کی اس نے ٹھہرائی — ممدوح تو بننا بھول گیا بس اپنے تئیں منکوح کیا
لڑکے نے جواب میں عرض کیا اے قبلہ و کعبہ سنئے تو — یہ کون برائی ہیں نے کی جو فاتح کو مفتوح کیا

نوح کے بچوں نے (سوا ایک کے) سرکشی کی تھی تفصیل کے لئے کلام پاک ملاحظہ کیجئے" اگرچہ خود اپنے کو "بھی کہہ سکتے تھے مگر متروک کا استعمال کرکے ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے۔

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہوں جانتا — مدت تک امتحان دئے امتحان پر
جرمن فرنچ لیٹن وانگلش پہ ہے عبور — ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر
اک شوخ طبع مس نے دکھائی مجھے زبان — بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر
بولی رہو گے زیست کی لذت سے بے خبر — قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر
پھرے اک مولوی صاحب جو کل دربار دہلی سے — یہ پوچھا میں نے کچھ لائے بھی تم سرکار دہلی سے
وہ بولے ہنس کے اے اکبر کہوں کیا تجھ سے حال اپنا — اسی مطلع سے بس کرتا ہوں اظہار خیال اپنا

ادھر سرخی مے گلگوں کی تھی انڈے کی زردی تھی
ادھر ریش سپید اپنی تھی اور شدت کی سردی تھی

یہ نظم ایک لمبی تمہید و تحسین کے ساتھ ۷ مئی ۱۹۰۴ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھاپی گئی اگرچہ مرحوم نے پرائیوٹ خط لکھا تھا۔

آپ کا برتاؤ موسم کے موافق تھا ضرور — واقعی اس کے اثر سے دل بخوبی پک گیا
دعوتیں انعام اسپیچیں قواعد فوج کمپ — عزتیں خوشیاں امیدیں احتیاطیں اعتبار
پیش رو شاہی ہے پھر ہز ہائنس پھر اہل جاہ — بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار
مال گاڑی پر بھروسہ ہے جنہیں اے اکبر — ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا
آسماں کو تو غلط ثابت کیا سائنس نے — عرش باقی تھا سو وہ بھی مد شک میں آگیا
امید چشم مروت کہاں رہی باقی — ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا

بات کرنے کا آلہ۔

نگاہ گرم کرسمس میں بھی رہی ہم پر
ہمارے حق میں دسمبر بھی ماہ جون ہوا

دسمبر میں کرسمس ہوتا ہے اور سردی ہوتی ہے
ماہ جون میں سخت گرمی ہوتی ہے

چشم تر دیکھ کر وہ مس بولی
محکمہ ہے یہ آب پاشی کا

باقی نہیں وہ رنگ گلستان ہند میں
محنت کا اب ہے کام قلستان ہند میں

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہو

اگرچہ لوگوں نے لکھا ہے حال بعد وفات
مگر کوئی بھی نہیں کہہ سکا یقینی بات

جو ٹھیک بات ہے وہ ہم کو ہو گئی معلوم
ہمارے شعر کی دنیا میں مچ گئی ہے دھوم

بتائیں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

میں نے سحری کھانے پر لٹو کا تو وہ جھنجھلائے تھے
اور جناب واعظ نے چورن سے فقط افطار کیا

کیوں؟ اس لئے کہ سحری زیادہ کھانے سے پیٹ گڑبڑ ہو گیا تھا۔

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج
اب دم کی جگہ ملت نمدے کی جگہ کالج

"دم میں نمدا" ایک محاورہ ہے۔

کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوحہ رکا رہتا ہے کام
تنگ ہے وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور سے

میم نے شیخ کو ڈانٹا تو پکارے وہ غریب
دیکھئے توپ نے لاٹھی کو دبا رکھا ہے

ڈائری میں ہو گیا تھا اختلاف اندراج
لڑ گئے خفیہ پولیس سے کل کراماً کاتبیں

روزنامچہ = Diary

علوے نفس

کہو کرے گا حفاظت میری خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا

میری حقیقت ہستی یہ مشت خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

عطا ہوئی ہے اگر بصیرت تو ہے یہ حال مقام عبرت
خدا سے اتنا بعید ہونا خودی سے اتنا قریب ہونا

حضرت اقبال کی مثنوی اسرار خودی اور اکبر کے خطوط عزیز حسن نظامی کے نام ملاحظہ فرمائیے۔

اے برہمن ہمارا تیرا ہے ایک عالم
ہم خواب دیکھتے ہیں تو دیکھتا ہے سپنا

خانۂ تن کی خرابی کا میں کرتا رنج کیا
گوہر جاں پر فقط اک گرد کا انبار تھا

کفر و اسلام کی تفریق نہیں فطرت میں
یہ وہ نکتہ ہے جسے میں بھی بہ مشکل سمجھا

جہاں صورت کا ذرہ ذرہ جمال معنی کا آئینہ ہے
مگر انہیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

سر جھکا فکر میں بیٹھ اپنی حقیقت کھل جائے
حق نما کون ہے آئینہ زانو کی طرح

خموشی میں جمال شاہد معنی نظر آیا
عبث الجھے رہے لفظوں میں ہم محو بیاں ہو کر

واہ کیا جلوہ ہے پیش چشم ادراک بشر
شبہ بھی ہاں بھی نہیں بھی وہم بھی اللہ بھی

خدا کا گھر بنانا ہے تو نقشہ لے کسی دل کا
یہ دیواروں کی کیا تجویز ہے زاہد یہ چھت کیسی

کل کی تھی بیخودی میں دم بھر کی سیر دل کو
کس لطف کی ہوا ہے کیا باغ خوش فضا ہے

اپنی ہستی جو حجاب رخ جاناں نہ رہے
واں رہیں ہم کہ جہاں پھر کوئی ارمان نہ رہے

چشم معنی سے جو کی سیر طلسمات جہاں
پتا پتا مجھے اک گلشن شاداب ہوا

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار + ہر ورق دفتریست معرفت کردگار۔ (سعدی)

قطرے قطرے میں ہوئی وسعت دریا پیدا
ذرہ ذرہ صفت مہر جہاں تاب ہوا

جو اپنی زندگانی کو حباب آسا سمجھتے ہیں
نفس کی موج کو موج لب دریا سمجھتے ہیں

یہ مصرعہ چاہیئے لکھنا بیاض چشم وحدت میں
خدا کا عشق ہے عشق مجازی بھی حقیقت میں

اپنی زباں میں شمع یہ کہتی ہے راز دل　　روشن نفس نہیں نہ ہو جس میں گداز دل

"جب اُس کے جلے تو کس نہ بسے"۔ بھُنے ہوئے چنے کی سوندھی خوشبو سنکر امیر خسرو نے اپنے ساتھی سے کہا تھا "جب اس طرح جلے تو اس کی خوشبو تمام کیسے نہ پھیلے۔

مرے عشق کے سوز میں ہو نہ کمی اجل آئے تو ایسی جفا نہ کرے
مری جان کو جسم سے کر دے الگ مرے درد کو دل سے جدا نہ کرے

اگر دیکھو تو ہر گل ایک دفتر ہے معانی کا　　اگر سمجھو تو ہر پتی بیان راز کرتی ہے

ترا جلوہ زیب خیال ہے وہی وجد ہے وہی حال ہے　　تیری انجمن سے ہوں دور اگر مرا دل تو مجھ سے قریب ہے

اسے انجنوں کا خیال کیا جو ہو محو تاروں کی چال کا　　وہ نظر زمیں پہ کیوں جھکے کہ جو آسماں سے قریب ہے

کیا ہے مذہب ایک ملکی اور سوشل انتظام　　یہ نہیں پہچان ہرگز کافر و دیندار کی

صورت و الفاظ کا اکثر نہیں ہے اعتبار　　ہیں فقط یہ عادتیں رفتار کی گفتار کی

ہیں ہر اک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی　　یاد رکھ تو بات یہ اک محرم اسرار کی

آہ جو دل سے نکالی جائے گی　　کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

استفہام انکاریہ ہے۔ یعنی ہرگز خالی نہ جائے گی۔

من نگویم کہ دریں باغ پئے جنگ درآ　　آخرت پیش نظر دار و بہر رنگ درآ

پیدا ہوا دماغ میں جوش نشاط کیا　　ننھا سا پھول دیکھئے اس کی بساط کیا

صوفی کا مذہب مختصر سب سے کھرا سب سے جدا　　ہم تم کے جھگڑے لغو ہیں یا کچھ نہیں یا سب خدا

میں بھی ہوں بدل موئد آزادی کا　　لیکن ایک نکتہ سن لے اے پاک ضمیر

آزاد ہو اس لئے کہ اغیار ہوں قید　　مطلب یہ نہیں کہ خود ہو غیروں کے اسیر

عقدے بھی کھلے تجھ سے منظر بھی نظر آئے　　آنکھیں بھی کہیں کھولیں دل کو بھی کبھی دیکھا

دل ترا ہو کہ نہو ہو شر با راز کے ساتھ　　صوت سرمد تو ازل سے ہے اس ساز کے ساتھ

اے آفتاب خضر رہ معرفت ہے تو　　اتنے ستارے اور تری محفل میں کچھ نہیں

آفتاب کا نور ستاروں پر چھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ دن کو بھی موجود رہتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔

مٹا دے اپنی ہستی اشتیاق حسن باقی میں　　جو اے اکبر تجھے ذوق حیات جاودانی ہے

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو	حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی
بھائے جو نگاہ کو وہی رنگ اچھا	لائے جو راہ پر وہی ڈھنگ اچھا
قرآن و نماز سے اگر دل نہ ہو گرم	ہنگامہ رقص و مطرب و چنگ اچھا

ضمیر کی عظمت۔

نہ گئی دل سے مرے حسن پرستی نہ گئی	بجھ گیا خون مگر روح کی مستی نہ گئی
عکس دنیا کے مرقع کا پڑا آنکھوں میں	دل میں اُتری نہ کوئی شے تری صورت کے سوا
نہ یہ رنگ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا	یہ جنوں اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا
دل شکستہ میں رہتا ہے بادہ عرفاں	سنا ہے میں نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا
نہ مہر و مہ پر مری نظر ہے نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے	فروغ دل کے لئے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا
ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہوائے اکبر	اُڑا جو ذرہ عنصر وہ پھر زیر زمیں آیا
سمجھ میں مضرت ہے۔ مزا ہے۔ جو مستی ہو	خدا پر بھروسا کر، عبث ہے۔ غم فردا
ز شور عالم ایجاد بے خبر ہستم	کہ حیرت است نگاہ من است و روے ہست

از ہستی ایں عالم چیزے نہ خبر دارم + قلب من و یاد تو چشم من و روے تو۔

نعمت سمجھ بلا کو بے لذت تماشا	آخر یہ مخزن اشک اے چشم نم کہاں تک
ہے روزلیوشن[1] بس اک تفسیر رب العالمین	کاش[2] اس نکتہ سے واقف ہوں مسلمان ان دنوں
من علیہا فان ہی پر ختم ہے قول فلسفٹ[3]	کیوں عبث برپا ہے اتنا شور طفلاں ان دنوں

[1] مسئلہ ارتقاء عالم۔ [2] وہ بہت سے عالموں کا رب ہے۔ [3] تنازع للبقا Struggle for existenee

یارب ایسا کوئی بتخانہ عطا کر جس میں	ایسی گذرے کہ تصور بھی گنہگار نہ ہو
ذوق عرفاں جو نہو بادہ پرستی اچھی	ہوش اگر دین سے غافل ہو تو مستی اچھی
دنیا میں یہی مست اثر نغمۂ کن ہے	پردیس میں ہے روح مگر دیس کی دھن ہے
عدو فلک بھی رہا گردش زمیں بھی رہی	مگر وہ در بھی رہا اور مری جبیں بھی رہی
نظر میں آیۃ ایاک نستعین بھی رہی	صنم کے پانوں پہ لیکن مری جبیں بھی رہی
اسی کو ہم تو سمجھتے ہیں مستند اکبر	جسے مشاغل دنیا میں فکر دیں بھی رہی

جہاں درشن تمہارے ہوں وہیں دھونی رماؤں گا   الٰہ آباد کا قیدی نہ پابند بنارس ہوں
ہے موت میں ضرور کوئی راز دلنشیں   سب کچھ کے بعد کچھ بھی نہیں یہ تو کچھ نہیں
جب تمہارا خیال آتا ہے   ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں   فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
دل وہ ہے جو فریب نظر کو سمجھ سکے   آنکھیں وہ ہیں جو ژرف نگاہی کے ساتھ ہیں
بندگی میں تو ہے وہ لطف جو شاہی میں نہیں   دل سے کوئی مگر اللہ کا بندا بھی تو ہو
غم کے داغوں سے رہی ابذا مگر یہ بھی ہوا   مجھ کو پیہم لذت یادِ حد املتی رہی
بے سازِ بے مغنّی یاں وجد آرہا ہے   ہر وقت بج رہا ہے ہر ذرہ گا رہا ہے
مجھے یہ انقلاب دہر کب خطرے کا باعث ہے   میری طبع رواں اک ماہی بحر حوادث ہے
"سمندر کو آگ سے اور مچھلی کو پانی سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔"
سینے میں دل آگاہ جو ہو کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی   بیدار تو ہے مشغول تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے   اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے تاب سہی برباد سہی
وہ خوش کہ کروں گا ذبح اسے یا قید قفس میں رکھوں گا   میں خوش کہ یہ طالب تو ہے مرا صیاد سہی جلاد سہی
(سوال)   عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
(جواب)   حسن بے حد ہے خودی محدود ہے
بے تعلق منزل ہستی سے گذرا دل مرا   اس کی نظروں میں سزاوار تمنا کچھ نہ تھا
نظر کو ہو ذوقِ معرفت کا کرے تو شوقِ اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا
تجسس کی نظر سے سیر فطرت کی جو اے اکبر   کوئی ذرہ نہ تھا جس میں کہ اک عالم نہیں نکلا
رہ عرفاں میں حس حظ والم کا نامناسب ہے   پسند طبع اکبر ہے نہ خوش رہنا نہ غم کرنا
امتیاز حسرت و رنج والم جاتا رہا   غم ہوا اتنا کہ اب احساس غم جاتا رہا
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج + مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔ (غالب)
جیسی دل میں ترنگ آجائے   عشق و مستی کا قاعدہ کیا

رکھ اپنی نظر سوے ہو اللہ ۔۔۔ تو تو میں میں سے فائدہ کیا

غم و تکلیف سے خالی فقط اک حس ہو ہستی کا ۔۔۔ نہ چشم غیر میں ہو اور نہ سودا خود پرستی کا
یہی حالت ہے جس کی آرزو ہے اہل باطن کو ۔۔۔ یہی لذت ہے جس کا حس فلک ہے اوج مستی کا

فروغ دل جو ہو منظور بزم ہستی میں ۔۔۔ اشارہ شعلے کا دیکھ اور ہوا کی سن دھیمر

ہوا کی دھیمی دھیمی صدا جو سرگوشی کی طرح ہوتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ مناظر فطرت کے مطالعہ سے قواے ذہنی کی تہذیب کرنی چاہئے۔

بے بصر وہ ہیں جو بحثوں میں یہاں خورسند ہیں ۔۔۔ جن کی آنکھیں کھل گئیں ان کی زبانیں بند ہیں

سنہ ۱۹۰۹ء میں لسان العصر کی آنکھ کا اپریشن ہوا تھا اور ہدایت تھی کہ بات نہ کریں۔

پیدا کئے فلک نے نادیدنی مناظر ۔۔۔ نیچی ہیں ان کی نظریں جو صاحب نظر ہیں

داغ دل پہ نظر یاس نہ کر اے اکبر ۔۔۔ کوئی ذرہ چمن دہر میں بیکار نہیں
تجھ پہ گلزار کھلائے گا یہی داغ کبھی ۔۔۔ آج گو طبع مری محرم اسرار نہیں

ہر شگوفہ پر تڑپ جاتی ہے طبع حسن دوست ۔۔۔ پتی پتی پر نگاہیں ڈالتا ہوں پیار کی
ناچتا ہوں صحن گلشن میں ہوا کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ ہم نوائی چاہتا ہوں بلبل گلزار کی
مجھ کو دیوانہ بنا دیتا ہے فطرت کا جمال ۔۔۔ عارض گل سے خبر ملتی ہے روے یار کی

۱۵ر دسمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو موتیا بند کا اپریشن کلکتہ میں ہوا تھا اس بعد یہ خیال پیدا ہوا

میں نے مرشد سے کیا جاکر یہ اک دن التماس ۔۔۔ کار دنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اداس
جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر ۔۔۔ آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر
فلسفہ نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ ۔۔۔ میری چشم طبع کو عارض ہے غربی کٹریکٹ
میرے حق میں کوئی فکر سالوینشن کیجئے ۔۔۔ ہو سکے تو مذہبی اک اپریشن کیجئے
کی توجہ حضرت مرشد نے میرے حال پر ۔۔۔ اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشم باطن میں دیا نشتر نگاہ تیز کا ۔۔۔ کٹ گیا وہ رنگ محسوسات کفر انگیز کا
پھر در دل پر مرے تقوے کی ٹٹی باندھ دی ۔۔۔ آنکھ پر شوق لقاے حق کی پٹی باندھ دی
خدا کی یاد کی پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو ۔۔۔ میری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں — جو اچھے[2] ہیں وہ مومن ہیں برے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت[3] لوگی ہے جن کی خالق سے — نہیں ہے شرک[4] کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

[1] مذاہب رسوم [2] عملا اچھے ہیں [3] طبیعت ۔ فطرت [4] ان المشرکین نجس ۔

پاس وانفاس ہو اگر ملحوظ — ہر نفس راہ کامرانی ہے
سانس لینے کا ورنہ کیا حاصل — صرف اک شغل زندگانی ہے

As though to breathe were life

آزادی کا شور مبارک — یہ تقلیدی زور مبارک
مرا تو ہے اور ہی منظر — میں تو یہ کہتا ہوں اکبر

عارف کو بیہوشی زیبا
عاقل کو خاموشی زیبا

عالم وحدت میں کثرت رنگ دکھلانے لگی — ہوش کے ٹکڑوں سے میں میں کی صدا آنے لگی

جہان فانی کی اتنی وقعت تمہارے ہی فلسفہ میں ہوگی
مرا عقیدہ تو یہ نہیں ہے کہ جو خدائی میں ہے یہیں ہے

ہمارے ذہن کو اس مصرعہ اکبر پہ مستی ہے — خوش اخلاقی عبادت ہے خوشامد بت پرستی ہے

غلامی

عزت ملی ہے شرکت کونسل کی شیخ کو
غازہ ملا گیا ہے رخ فاقہ مست پر

اب اور چاہئے نیٹو کے واسطے کیا بات
یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام سے ہم

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تار امید و بیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

ہے غلامی ہی جو قسمت میں تو ہو لطف کے ساتھ
کہہ دو ہندی سے کہ آبادِ پرستاں میں ہو

پہننے کو تو کپڑے ہی نہ تھے کیا بزم میں جاتے
خوشی گھر بیٹھے کر لی ہم نے جشن تاجپوشی کی

پاؤں کانپا ہی کئے خوف سے ان کے در پر
چست پتلون پہننے پہ بھی پنڈلی نہ تنی

وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے ہم کہتے ہیں ہاں
بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے

حکم خاموشی ہے اور میری زباں
آپ کی باتیں ہیں میرا کان ہے

موجیں ہیں طبیعت میں مگر اُٹھ نہیں سکتیں
دریا ہے مرے دل میں مگر بہ نہیں سکتے

پتوار شکستہ میں نہیں طاقت پر چم
ہے ناؤ میں سوراخ مگر کہہ نہیں سکتے

گرمی محبت میں ہیں وہ آہ کے مانع
پنکھا نفس سرد کا جھلنے نہیں دیتے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہوتی ہے نصیب تلخ کامی تم کو
محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو

اغیار نہیں بنا سکے تم کو غلام
ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

تدبیر کریں تو اس میں ناکامی ہو
تقدیر کا نام لیں تو بدنامی ہو

القصہ عجیب مضیق میں ہیں ہندی
یورپ کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

قفس ہے کم ہمتی کا سیمیں پڑے ہیں کچھ دانہ ہائے شیریں
اسی پہ مائل ہے طبع شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں

دفتر تدبیر تو کھولا گیا ہے ہند میں
فیصلہ قسمت کا اے اکبر مگر لندن میں ہے

کوئی کہتا نہیں سیاح ہوں فطرت کا ماہر ہوں
یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں میں ناظر ہوں

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے
جو اپنی گرہ میں ہے اسے کھو بھی رہے ہیں

بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو رہے ہیں

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں
اس کی ہر اک بات کا دیوانہ ہوں

شب میں پیدائش ہوئی ہے مثل شمع
جلوہ خورشید سے بیگانہ ہوں

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند

ہم سب میں مطیع و خیر خواہ انگلش
یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

کانٹے بچھ جاتے ہیں ان لوگوں کی راہ رزق میں
خوف آتا ہے چھری چلتی ہے ان کی میز پر

بلا طاقت تہ افلاک انساں کی نہیں چلتی
وہاں تو ریل چلتی ہے یہاں روٹی نہیں چلتی

ٹھیک سے نہیں ملتی۔

ہے عجب انقلاب دنیا میں
کیا کہوں بات بھائی صاحب کی

اب وہ تسبیح پر بجائے درود
پڑھ رہی ہیں دہائی صاحب کی

نہ کچھ انتظار گزٹ کیجئے
جو افسر کہیں بس وہ جھٹ کیجئے

کہاں کا حلال اور کیسا حرام
جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجئے

متحد احساس سے ہم کو معترا کر دیا
ٹکڑوں کے ریزے کئے ریزوں کو ذرہ کر دیا

خوشی سے شیخ کالج سوئے مسجد اب نہیں چلتا
جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا

گو بہت اونچی ہے پرواز حریف
شیخ بر گڈ کم نہیں ہیں جمپ[1] میں

ان کا طوطی بولتا ہے عرش پر
ان کی مرغی بولتی ہے کمپ[2] میں

[1] کودنا = Jump۔ [2] فوجی ڈیرا = Camp

میری نصیحتوں کو وہ شوخ سن کے بولا
نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

دیسی آدمی = Native

دریا میں تو صاحب سے اگن بوٹ میں ہارے — میدان الکشن[1] میں گئے ووٹ[2] میں ہارے

۱؎ انتخاب Election ۲؎ رائے = Vote

اس کی حرکت ہے کلید مغربی پر منحصر — دل ہے یہ سینے میں یا پاکٹ[1] کے اندر واچ[2] ہے

۱؎ جیب = Pocket ۲؎ گھڑی = Watch

کہا صیاد نے بلبل سے کیا تو نے نہیں دیکھا — کہ ترے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے

کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر میری — نشاط طبع کی مہلک مگر بیکاری پر ہے

جب آنکھ کو کھلنے سے ہو جھپک جب منہ میں زباں جنبش سے ڈرے — اس قید میں کیونکر جینا ہو اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو ایسی ساعت پر افسوس ہے ایسی حالت پر — یا جھوٹ کہے یا کچھ نہ کہے یا کفر بکے یا کچھ نہ کرے

قاتل کو بھروسہ قوت کا اور ہم کو خدا کی رحمت کا — ہونا تھا جو کچھ ہو ہی لیا وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے — اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

ان کی سب سنتے ہیں اپنی نہیں کہہ سکتے ہیں کچھ — کیا قیامت ہے زباں کٹ گئی اور کان رہے

مس ہوائے باغ کا ہے اب پروں کو ناگوار — اتنا خوگر ہو گیا ہوں پنجۂ صیاد کا

جو ہے زباں پہ دل کو نہیں اس سے فائدہ — جو دل میں ہے وہ لا نہیں سکتے زباں پر

مفتوح ہو کے بھول گئے شیخ اپنی بحث — منطق شہید ہو گئی میدان جنگ میں

خلق نکو کو سب نے خوشامد سمجھ لیا — کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب آدمی کے ساتھ

زوال قوم کی ابتدا وہی تھی کہ جب — تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی

جو کہا اس نے کیا منظور کیا حرف نفی — ہم سراپا اب تو اس محفل میں "جی ہاں" ہو گئے

مصارف مے لندن نہ ہو سکے برداشت — غرضکہ یاروں میں افیوں ہی گھلی آخر

بنے بندر سے ہم انساں ترقی اس کو کہتے ہیں — ترقی پر بھی نیٹو بدنصیبی اس کو کہتے ہیں

نہ پیسہ ہتھیار کا ہے نہ زور — کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں

تہ دل سے ہم کوستے ہیں مگر — کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

مشرق غربی جھپیٹ میں ہے — دل سینے میں تھا سو پیٹ میں ہے

کیسہ خالی ہے بکس بھی ہے خالی — جو کچھ ہے یہاں پلیٹ میں ہے

قلی اک اس طبیعت کا ملا جو کل یہ کہتا تھا — میرے دل میں خیالات بلند آنے نہیں پاتے
سڑک پر کام میں تکلیف ہے بنگلے پہ بے لطفی — یہاں سایہ نہیں ہے اور وہاں گانے نہیں پاتے

اقتضائے فطرت ہے کہ طبیعت انسانی ماحول سے اثر پذیر ہوتی ہے (فلاطوں) غلامی ہمیشہ خیالات عالیہ کی حاجب ہوا کرتی ہے ۔

مریسے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

ہوا آج خارج جو میرا سوال — کہا میں نے صاحب سے با صد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ — وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سنکر بہت طبع غمگیں ہوئی — مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے — تو بیشک جہنم بھی ہے کوئی شے

پوچھتے کیا ہو کہ تو ہیرو ہے یا ہر نبس ہے — بندہ جو کچھ ہو بہر حالت بلا لیسنس ہے

نیٹو کی گذر ہے دال ہی پر — دیسی کالا آدمی
کالا اس طرح دال میں ہے — معاملہ گڑبڑ ہے

کیون نہ اپنے دل کو ہوان سے ملاپ — لارڈ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ
ان کے حق میں بھی دعا کرتے ہیں ہم — مندروں میں جب کبھی کرتے ہیں جاپ
ان کی بڑھتی سب مناتے ہیں یہاں — خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ
ہر طرف سامان ہیں آرام کے — کھل گئی ہے ہر طرف ہر شے کی شاپ[۱]
ہو گئے روشن حدود آسماں — علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ
ساری دھرتی دب گئی سائنس سے — لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ
حضرت واعظ ہیں راضی رقص پر — دیر کیا ہے اب پڑے طبلے پہ تھاپ

ایک صاحب نے فرمائش کی تھی مگر بعد ملاحظہ خاموش رہے ۔

[۱] دکان Shop

کہتے تھے سابق میں سب اوپر خدا نیچے حضور — اس مقولے کو مگر بدلیں گے اب اہل شعور
زیر پا ہے ریلوے اور سر پہ ہے انجن کی بھاپ — اب یہ کہنا چاہیئے نیچے بھی آپ اوپر بھی آپ

فلسفہ

یقین قوت تدبیر بت پرستی ہے
غرور رفعت دنیا نظر کی پستی ہے

آپ اندھیرے میں ہیں بجلی سے مدد لیتے ہیں
چاند سورج ہیں ہمیں راہ دکھانے والے

حد ادراک میں داخل نہ ہوا سر ازل
کچھ سمجھ ہی نہ سکے ہوش میں آنے والے

کون ہموار کسی کا ہے جہاں میں اکبر
اک ابھرتا ہے یہاں ایک کے مٹ جانے سے

ع ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں۔ (غالب)

فنا کا خوف کچھ اہل حیات ہی کو نہیں
ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے

روح کو قالب میں آنے سے بڑا انکار تھا
یہ نہ سمجھی تھی کہ آخر دوستی ہو جائے گی

کسی نے بزم میں سمجھا نہ باعث گریہ
تمام رات رہی شمع اشکبار افسوس

بارہا جوش جنوں میں مجھے آیا ہے خیال
کہ تماشا ہے یہ ہنگامہ نیکی و بدی

نظر عشق میں ہے زندگی و موت اکبر
اضطراب نفس چند و سکون ابدی

برق و بخارات کا زور اے حکیم
کب ہے پئے روح رہ مستقیم

تار پہ جاتے نہیں اہل نظر
ریل سے کھنچتا نہیں قلب سلیم

اک فلسفہ ہے تیغ کا ادراک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزور تیغ
یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزور موت

محو حیرت ہی رہی بحر میں ہر چشم حباب
کچھ نہ تھی ہستی امواج گذرنے کے سوا

برباد کیا اجل نے مجھ کو کیا؟ یہ کہئے
روح رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

موت آئی اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے (انیس)

معنی کی شعاعوں سے جو لکھ جاتا ہے دل پر
سچ ہے کہ وہ لفظوں میں بیاں ہو نہیں سکتا

عالم ہستی کو تھا مد نظر کتماں راز
ایک شئے کو دوسری شئے کا سبب کرنا پڑا

ناقص مقدموں سے نکلیں گے جو نتیجے
ان پر وثوق صحت اے مہرباں کہاں تک

بڑھ رہا ہے کفر زلف علت و معلول سے
حسن فطرت ہے حجاب روئے یزداں ان دنوں

حادثے اپنے طریقے سے گذرتے ہی رہے / کیوں ہوا ایسا یہ ہم تحقیق کرتے ہی رہے

یہ بھی فانی وہ بھی فانی دونوں ہیں بے اعتبار / انقباض موت ہو یا انبساط زندگی

کوئی عظیم نتیجہ ضرور ہے ملحوظ / نظام جسم بشر میں بڑا تکلف ہے

کیا ثبات عمر بس اک جنبش فطرت کی دیر / زندگی کیا ہے فقط اک عکس آئینہ میں ہے

صبح کو کہتا ہوں دیکھو کس طرح کٹتا ہے دن / شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا

عمر یونہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ / عرصہ ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

بڑی عمریں ہیں جن کی ان سے سنئے حال دنیا کا / نگاہوں میں زمانے ہیں زبانوں پر فسانے ہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ طلسم ہستی / اس کی قدرت کے کرشمے بھی عجب ہوتے ہیں

جان جب خاک میں پڑتی ہے تو ہوتی ہے خوشی / خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

اگر موج نفس میں آئیں موجیں جوش معنے کی / حباب زندگی ہی سے ہو بحر بیکراں پیدا

تھا کیا ہی سماں تھی کیا ہی وہ شب سینے ہی میں تھے اسباب طرب / ہر حرکت دل اک نغمہ تھی ہر تار نفس سازندہ تھا

اس سے بڑھ کر کون ہے راہ فنا میں بے قرار / حصر کی حد سے ہے باہر تیزی رفتار وقت

مبتلائے بحث کو راز خدا کی کیا خبر / معنی بے لفظ و لفظ بے صدا کی کیا خبر

پایا اک ہنگامہ ہم بھی ہو گئے اس میں شریک / ابتدا کا علم کیسا انتہا کی کیا خبر

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اس شعر پر سر محمد اقبال نے انگریزی میں ایک آرٹیکل لکھا ہے اور لسان العصر کو اس طرز ادا کے اعتبار سے پروفیسر ہیگل (ایسے زبردست فلسفی) پر ترجیح دی ہے۔

قابل دریافت راز ہستی پروانہ ہے / کیوں اسے یہ حکم فطرت ہے جلو تڑپو مرو

معنی کا آئینہ ہے اکبر کا یہ لطیفہ / ہنسنا بھی اک مرض ہے رونا بھی اک دوا ہے

میں طاقت ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی / کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تل کے نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کے

فلاسفی کے مکالموں نے کسی نے یہ خوب ہی کہا ہے / جو تندرستی ہو تیری اچھی تو سانس ہی میں بڑا مزا ہے

مقابل ترے پیچ سب پیچ ہے / مگر تو بھی خود پیچ در پیچ ہے

جستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ — کیوں میں پوچھوں وہ دلارام ملے گا کہ نہیں
اسی مٹی کو دیکھ اکبر اگر ذوق تعقل ہے — کہیں ٹہنی کہیں پتی کہیں غنچہ کہیں گل ہے
آرام کی تلاش نے رکھا ہے بے قرار — ہر خواہش سکون سبب اضطراب ہے
ایک صوت سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے — ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
دم بھر میں جسم و روح کا قصہ تمام ہے — مٹی میں مل گیا یہ وہ، اپنے وطن گئی
ہر قدم پر ہے فزوں لذت سرگرمی سعی — شوق نے خوب مزے دوری منزل کے لئے
مسرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی — مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز زیست — سُلایا شب گور نے سو رہے
نقش معنیٰ منظر بے معنی و مفہوم ہے — مصلحت فطرت کی ہے یا دین کا مقسوم ہے
ہم اظہار خودی سے کوئی دم ساکت نہیں ہوتے — مگر جب غور کرتے ہیں تو خود ثابت نہیں ہوتے
یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل — نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
عبث ہے نظم بلیغ فطرت جو رخ نہیں حسن مدعا کا — حدیث عقبیٰ اگر غلط ہے تو کیا نتیجہ ہے ارتقا کا
کسی کے مرنے سے یہ نہ سمجھو کہ جان واپس نہیں ملے گی — بعید شان کریم سے ہے کسی کو کچھ دے کے چھین لینا

خلقت کی یہ موجیں ہیں ازلی ممکن نہیں ضبط اس منظر کا
اے ہوش بشر کب تک یہ جنوں ہر ذرے کے "کب" اور "کیونکر" کا

اعراض جو ہیں یہ نفسانی کھو دیتے ہیں نور ایمانی — موقعہ ہی نہیں ملتا دل کو جو یاں ہو وہ اپنے جوہر کا
بے اختیار خود کو مختار تم سمجھ لو — لیکن ہوئے یقیناً بے اختیار پیدا

ہر بات پہ جس نے شک ہی کیا وہ صرف پریشان باطن تھا
پرکار سے نقش اس وقت بنا اک جزو جب اس کا ساکن تھا

فطرت انسانی

یہ ملنے ہی سے اکثر رنج بھی ہو جاتے ہیں پیدا — جو سچ پوچھو تو ملنے سے نہ ملنے کا گلا اچھا
جانتی تھی قوت اپنی مدت عمر عروج — بحر میں لیکن حبابوں کو ابھرنا ہی پڑا
ادھر وہی طبع کی نزاکت ادھر زمانہ کی آنکھ بدلی — بڑی مصیبت شریف کو ہے امیر ہو کر غریب ہونا
وہ شناور ہوں جو ہر موج کو ساحل سمجھا — وہ مسافر ہوں جو ہر گام کو منزل سمجھا
بچ رہے طاعون سے تو اہل غفلت بول اٹھے — ابتو مہلت ہے پھر اگلے سال دیکھا جائے گا
ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے — غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا
دو مرادیں جو ملیں چار تمنائیں کیں — ہم نے خود قلب کو آرام سے رہنے نہ دیا
بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمرِ عزیز — سینہ اک گنجینۂ داغ عزیزاں ہو گیا
بلندی مراتب سے تلون ہو گیا پیدا — بدلتے ہیں ہزاروں رنگ اب وہ آسماں ہو کر
عجب کیا ہے جو دونوں دن ہیں بیہوشی کے دنیا میں — چلے جب ہو کے رخصت آئے جس دن میہماں ہو کر
الگ رکھتی ہے فطرت ہوش کو ایسے مواقع پہ — کہ تا افشانہ کر دے راز ہستی راز داں ہو کر
دل مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں — امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں
سکون قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں — بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں
ضروری کام نیچر کا جو ہے کرنا ہی پڑتا ہے — نہیں جی چاہتا مطلق مگر مرنا ہی پڑتا ہے
طلب ہو صبر کی اور دل میں آرزو آئے — غضب ہے دوست کی خواہش ہو اور عدو آئے
خدا پناہ میں رکھے کشاکش غم سے — اسی سے تار نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے
ہو جس طرف طبیعت لازم ہے شوق کامل — ہر بات میں اثر ہے ہر رنگ میں مزا ہے

ہر چیز میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو۔

مقام شکر ہے غافل مصیبت دینا — اسی بہانہ سے اللہ یاد آتا ہے
گو بہت کچھ رنج یاران وطن سے تھا ہمیں — آنکھ میں آنسو مگر وقت سفر آ ہی گیا
بعد مدت کے نظر آئی جو صورت یار کی — سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

رہتی ہے کار دو عالم میں ہمیں وحشت سی — نہیں معلوم یہاں آئے ہیں کس کام کو ہم
رہ چکے ہیں جو کبھی فصل بہاری میں اسیر — کانپ کانپ اُٹھتے ہیں جب دیکھتے ہیں دام کو ہم
ہوئی جو عمر ان کی مجھ سے سنئے کہ پندرہ میں ہے ایک باقی — عجب ہے نیچر کے اقتضا سے جو رکھے نیت کو نیک باقی
اُٹھانا پڑتا تھا دن رات بار الفت خوباں — جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا
اکبر سے نہ کہئے رائے سرجن — امید مریض توڑئیے کیوں
نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خون دل — بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہئے
بے دشمن دیں راحت دنیا ہے تو کیا ہے — قائل ہو کوئی آنکھ تو جینے کا مزا ہے
شریک بیکسی بودن ترا با ہمدماں اکبر — ازاں بہتر کہ در بزم حریفاں شادماں باشی
خیال دوڑا نگاہ اُٹھی قلم نے لکھا زبان بولی — مگر وہی دل کی اُلجھنیں ہیں کسی نے اس کی گرہ نہ کھولی

خیال شاعر کا ہے ترالا یہ کہہ گیا ایک کہنے والا
شباب کے ساتھ یوں ہے رندی کہ جیسے پھاگن کے ساتھ ہولی

زخمی نہوا تھا دل ایسا سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی — پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی
جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا — اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا
زندگانی کا مزا دل کا سہارا نہ رہا — ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
بولنے کی ہے نہ قوت نہ اشارے کی سکت — اتنا بس بھی مرا فطرت کو گوارا نہ رہا
جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا — شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا
ہمیشہ زخم دل پر زہر ہی چھڑکا خیالوں نے — کبھی ان ہمدموں کی جیب سے مرہم نہیں نکلا
ایں فتنہ کہ برپا شد وایں شور کہ برخاست — الزام بگردوں منہ از ماست کہ بر ماست
شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب — دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد
جیسی حالت پیش آتی ہے زمانہ میں جسے — ذہن انسانی میں ویسا ہی اُتر آتا ہے عکس
یہ مواقع ہیں کہ ہو جاتے ہیں وجہ اختلاف — آئینہ کا رخ جہاں بدلا بدل جاتا ہے عکس
ہوائے نفس کے تابع ہیں جن کے جسم اکبر — انھیں کی روح رہتی ہے بدن میں مضمحل ہو کر
دل کو اک غم نے گھیر رکھا ہے — کیا کسی سمت التفات کروں

ہمنشیں مجھ سے کچھ نہ پوچھ اس وقت — جی نہیں چاہتا کہ بات کروں

جانتے ہیں کہ یہ غفلت کے ہیں کام — پھر بھی کرتے ہی چلے جاتے ہیں

دل بیتاب نے کیا کیا دکھائے ہیں مجھے عالم — یہ پرزہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانے میں

نہایت غضب کا ہے۔

کون پا سکتا ہے مکروہات دنیا سے نجات — زندگی جب تک ہے جھگڑے زندگی کے ساتھ ہیں

غم میں ہو جاتا ہے کچھ امید فردا سے سکون — وائے بر حالش جسے امید فردا بھی نہ ہو

معترض فریاد سے ہوں زیر لب کرتا ہوں آہ — آپ کی مرضی یہ ہے شاید کہ اتنا بھی نہ ہو

رہ گئے وہ پوچھ ہی کر جس کو اس کو ہے گلا — اس کے دل سے پوچھئے جس کو کہ پوچھا بھی نہ ہو

انسان نے انسان سے کی جنگ ہمیشہ — دنیا کے نظر آئے یہی رنگ ہمیشہ

گرمی موسم شباب اُف اُف — یہ سمجھئے کہ جیٹھ تپتا ہے

مایوسی نے محفوظ کیا امیدوں کی بے تابی سے — اب اشک بھی تھمتے جاتے ہیں اور دل بھی ٹھہرتا جاتا ہے

جگر کو زخم سے زخموں کو آہوں سے بچاتا ہوں — مگر ہوتے ہی ہیں زخم اور انھیں چھلنا ہی پڑتا ہے

فنا کے رنگ سے دل خوں ہوتا ہے مگر اکبر — زباں کو واہ کرنے کے لئے ہلنا ہی پڑتا ہے

مایوس ہوں باغ عالم میں امید سے یاری چھوٹ گئی
جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

دل کی بے تابی ہے ثابت آنکھ کے اظہار سے — بجلیاں پیدا ہوئی ہیں آنسوں کے تار سے

جب طبیعت خوش نہیں تو کیا کرے اچھا مکاں — دل بہل سکتا نہیں اپنا در و دیوار سے

پسند چشم کا ہرگز کچھ اعتبار نہیں — بس اک کرشمہ وہم و خیال ہوتا ہے

یہ سانس نہیں ہے سینے میں اک پھانس بشر کی جان میں ہے
درد اس کا مگر محسوس نہیں غفلت کا خمیر انسان میں ہے

نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہے — انجمن میں ہوں مگر عالم تنہائی ہے

انسان کی غفلت کم نہ ہوئی قانون فنا کی عبرت سے
ہر گام پہ کٹتے پانوں بھی ہیں اور سر بھی اُٹھائے جاتا ہے

ابتدائے عالم ہستی میں میں بیہوش تھا   ہوش جب آیا تو دل میں غفلتوں کا جوش تھا
پھر مصائب اور فنا کے تجربے پیہم ہوئے   بعدازاں جب تک جیا مغموم اور خاموش تھا

فارسی

وقت بہار گل دلم از ہوش دور بود　　موج نسیم دشمن شمع شعور بود
یک جلوہ کرد و صورت پروانہ سوختم　　آرے ہمیں علاج دل ناصبور بود
ناقصاں را سود بخشد پرتو اہل کمال　　ماہ نورا می کند در نور کامل آفتاب
ہر سحر لرزاں و ہر شامے بخون می بینمش　　شد مگر از غمزہ حسن تو بسمل آفتاب
ہست رفتار حسیناں باعث صد انقلاب　　می کند تغیر فصل از طے منزل آفتاب
دلم فسردہ شد و عشق و آرزو باقیست　　نماند در گل پژمردہ رنگ و بو باقیست
فدائے صورت زیبا رخے کہ فانی نیست　　نثار حسن حسینے کہ حسن او باقیست
چیزے کہ بہ عشق او می رقصد و می سوزد　　دل نیست کہ در پہلو می رقصد و می سوزد
در شمع چو می بیند نورے ز رخ خوبت　　پروانہ بگرد او می رقصد و می سوزد
ہر شمع بیاد او می گرید و می کاہد　　ہر شعلہ بشوق او می رقصد و می سوزد

ایک پروانہ لمپ کے گرد ناچ رہا تھا۔

نالہ من چہ توانی بر ما را برساں　　اے صبا قصہ دوری وطن ہیچ مپرس
آخر فصل بہار است و دم رخصت گل　　دیگر از حسرت مرغان چمن ہیچ مپرس
حسرتے چند بہ دل دارم و ایں نکتہ بس است　　وز کہ آموختہ ام طرز سخن ہیچ مپرس
مگو از لعل یمانی و ببیں لخت دلم　　اشک من بنگر و از در عدن ہیچ مپرس
بیکسی معتکف تربت او بود بدشت　　قصہ اکبر مہجور وطن ہیچ مپرس
عزت اکبر نہ مثل برہمن در دیر بود　　قشقہ بودش بر جبیں لیکن ز دست غیر بود
ایں سخن مقبول اہل دل بود ہر آئینہ　　بے خودی در سجدہ جا خواہد خودی در آئینہ
ہماں بہ کز حدیث دی و فردا بے خبر باشی　　بہ ذوق لم یزل امروز سر تا پا نظر باشی
بکش دامان شب برخیز و شمع دل فروزاں کن　　چرا افتادہ در بند گریباں سحر باشی
در بحر زندگی دلم آہے کشید و رفت　　برقے بگوشش کہ برابرے طپید و رفت

داغ دل است رنگ[1] فنا اندریں چمن   سبزہ دمید و مرد و گل تر[2] شید و رفت

۱؎ ہم رنگ فنا ۲؎ شگفت۔

اے آنکہ فسانہ گوی از دیر و حرم   ایں دفترِ تست باعث درد سرم
بگزار مرا بحالم[3] از راہ کرم   چشمے داریم و عالمے در نظرم
دیگر چہ معلم و کتابم باید

جامے ز مے طہور دارم در دست   جانم لبِ سر و دعا شقی بیخود و مست
نے طالب نغمہ ام نہ من بادہ پرست   تار نفس است و یاد وے از عہد الست
دیگر چہ مغنی و شرابم باید

۳؎ بحال خود۔

فرمان کسے بود در ہا کہ چنیں سفتم   گفتند بگو گفتم گفتند مگو خفتم

"آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم"۔

فیشن

شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں — پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی — کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے — وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے

انگلش ڈرس انور کا جو کل بزم میں دیکھا — اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر — تبدیلیٔ صورت کے رہے گر یہی اطوار

حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا — شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے — انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

انور نے کہا صلِ علیٰ واہ بہت خوب — شک اس میں نہیں مدح کے قابل ہے یہ گفتار

لیکن جو یہ تعمیم ہے حضرت کے سخن میں — اس کو تو نہ تسلیم کرے گا یہ گنہگار

ہر ملت و مذہب میں ہیں اچھے بھی برے بھی — وہ کونسا فرقہ ہے کہ سب جس میں ہیں ابرار

باطن سے ہے اخلاقِ حمیدہ کا تعلق — فطرت میں جو ہے نیک وہ بد ہوگا نہ زنہار

ہے جس کو ضرورت وہ ضرورت سے ہے مجبور — ہے شوق جسے کیوں نہ کیا جائے وہ مختار

مقصود جو اصلی ہے وہ ہے دل کی درستی — یا ہیٹ اور کوٹ ہو یا جبہ و دستار

حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ہوائے طوبیٰ ہے اب نہ سر میں نہ موجِ کوثر ہے اب نظر میں
ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پائنیر میں

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی — چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر — پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

حاکمِ دل بن گئی ہیں یہ تھیٹر والیاں — میں لگاؤں گا گلِ باغِ جگر کی ڈالیاں

ضبط کے جامے کے بخیئے ٹوٹتے ہیں دوستو ‎ ‎ دی و فردا کیا کروں پاؤں جو یہ خوش حالیاں
آسماں سے کیا غرض جب ہے زمیں پر یہ چمک ‎ ‎ ماہ و انجم سے ہیں بڑھ کر اں کے بندے بالیاں
فول وہ کہتی ہیں مجھ کو میں انھیں سمجھا ہوں پھول
ہیں گل رنگیں سے بہتر اُن گلوں کی گالیاں

بیوقوف Fool انگریزی میں کبھی کبھی "ف" کی آواز Ph سے بھی نکلتی ہے جیسے Phase رومن میں پھول Phool یونہی لکھا جائے گا۔

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں ‎ ‎ حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
لطف آزادی کی اس میں بڑھ گئی ہے چاشنی ‎ ‎ اب تو شیشے میں اترنے کی نہیں جلیبیاں
اپنے ہاتھوں اپنے سانچے کا کریں کی بندوبست ‎ ‎ یہ نہیں وہ گڑ کہ تم اس کی بناؤ بھیلیاں

بضرورت قافیہ۔

خواہ صاحب کو تم سلام کرو ‎ ‎ خواہ مندر میں رام رام کرو
بھائی جی کا فقط یہ مطلب ہے ‎ ‎ جس میں روپا ملے وہ کام کرو

روپیہ کا اصل لغوی تلفظ روپا بمعنی چاندی ہے اسی سے روپیہ چاندی کا سکہ ہوا

مرعوب ہوگئے ہیں ولایت سے شیخ جی ‎ ‎ اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
پارک کے زر روے کے مالی سے گل بے لولیا ‎ ‎ مال ضائع کرنے کا تم کو ہے مالیخولیا
شیخ کے دامن کو اکبر نے دیا بوسہ جو کل ‎ ‎ ہم نے برکت کے لئے اک مس کا دامن چھولیا

خبط۔ سنک۔

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا ‎ ‎ اک میر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا یہ سائے میں پھیلی ‎ ‎ پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا
فرمائیں مرا قصور حضرت جو معاف ‎ ‎ جو امر ہے واقعی گذارش کروں صاف
انکار نہیں نماز روزے سے مجھے ‎ ‎ لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف
تکلفات سے للہ اپنا سر نہ پھراؤ ‎ ‎ جو دال روٹی ہو موجود وقت پر وہ کھلاؤ
مجھے بھی چکھو گے کیا رکھ کے خوان نعمت پر ‎ ‎ کباب کرتا ہے اب مجھ کو انتظار پلاؤ

شکل کولے کی ہٹ سولے کی — واہ کیا دھج ہے میرے بھولے کی

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے — اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا — بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے

چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں — اخبار میں جو چاہے وہ چھاپ دیجئے

بہت شوق انگریز بننے کا ہے — تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجئے

عادت جو پڑی ہو ہمیشہ سے وہ دور بھلا کب ہوتی ہے
رکھی ہے چنوٹی پاکٹ میں پتلون کے نیچے دھوتی ہے

دستار و پیرہن گم اور جیب و کیسہ خالی — تہذیب مغربی نے ہم کو چتھاڑ ڈالا

میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام — اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

اکبر ہنوز اُن سے ہے امیدوار لطف — بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا نہیں

ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر — اگزیبیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے

نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں — یہ صرف تحریر میں ڈیر سر ہے یا جناب مکرمی لکھا ہے

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

لیلے نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا

حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا — سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

(خطاب Sir اور سر) (ایک انگریزی ناچ Ball سر کے بال)۔

تہمد میں بٹن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اگا
ہر پیڑ پہ اک پہرا بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اگا

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی — اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

تماشہ گاہ Theatre

بسے برگڈ میں مغرب کی رفاقت اس کو کہتے ہیں — ہوئے مدفون تکئے میں اصالت اس کو کہتے ہیں

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہمنشیں — اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو

قاصد ملا جوان سے وہ کھیلتے تھے پولو[۱] — خط ارکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو — (۱ گھوڑ چوگان)

چھاپے کی تقویت پر لیڈر بنو نہ اکبر — اپنی بساط دیکھو اپنا مقام دیکھو

باتیں بھی مجھ سے کیں مری خاطر بھی کی بہت — لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کے لئے — جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے۔

کافی اگرچہ لیٹنے کو اک پلنگ ہے — انگڑائیوں کو عرصۂ دنیا بھی تنگ ہے

اگرچہ ریش منڈانے سے ہے صفائی رخ — گناہ گار مگر بال بال ہوتا ہے

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور — بھینس کو گون پنھا دیجئے عاشق ہو جائیں

انگریزی جامہ = Gown

کچھ جوڑ تو ان میں سے ہوئے بال[۱] میں رقصاں — باقی جو تھے گھر ان کا افلاس نے مارا

بہرا[۲] وہ بنا کیمپ میں یہ بن گئی آیا — بی بی نہ رہیں جب تو میاں بن بھی سدھارا

۱ محفل رقص۔ ۲ خدمتگار Bearer ۔ بہرا، جو سن نہ سکتا ہو۔ کھلائی ۔ آیا۔ "آیا" مذکر ہے۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں — بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سلطنت گورنمنٹ آگے آئی

پانوں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دھن میں ہو گئے پھرکی

سند کیسی جمال ان میں اگر ہے ہو گا خود ظاہر — کوئی سرٹیفکٹ سے خوبصورت ہو نہیں سکتا — سند

جو چاہتے ہیں کٹے عمر اعتدال کے ساتھ — بٹھا رہے ہیں وہ بسکٹ کا جوڑ دال کے ساتھ

پہلے ہوتا تھا وصال اور اب ہے مرگ نیچری — عرس کا اب اس لئے ہے نام اپنی ورسری

شاپ میں سب جمع ہیں مجھ سے نہ پی پی کیجئے — آپ اس بوتل کو میرے گھر پہ وی۔ پی کیجئے

دکان = Shop

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب — فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

بوے وفا نہیں ہے مسوں کے اصول میں — بن رنگ دیکھ لیجئے گملے کے پھول ہیں

اکثر اسی ہوٹل میں بنے ہیں کلوخ کمپ　　اُس کے خوشا نصیب جسے ہو رسوخ کمپ

آخر اگر ملے جو ہے نام و نمود میں　　کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت میں

دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ　　فوٹو کوئی لگا دے جواں کا بہشت میں

ورچوس دیکھتے ہیں وہ نہ سنر دیکھتے ہیں　　فرنچر دیکھتے ہیں اور ڈنر دیکھتے ہیں

بدکار = Sinner نیکوکار = Virtuous

مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی مسجد میں دو　　شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہو

رات بھر۔ صبح کو توبہ کر لی + رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

توپ کی طرح چل اس عہد میں گو منہ ہو سیاہ　　سرخروئی اب اسی میں ہے کہ تلوار نہو

زمانہ کا انقلاب ہے۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں　　بات وہ ہے جو پانیر[1] میں چھپے

([1] ایک انگریزی اخبار) مطلب یہ ہے کہ خواہ مخواہ دیسی چیزوں پر بدیسی چیزوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

رفتار ترقی یہ کہیں ناچ نہو جائے　　یہ قراءت مصری کہیں کھماچ[1] نہو جائے

توحید کی تحریک سے زندہ ہے ترا دل　　مغرب کی مگر کوک سے یہ واچ[2] نہو جائے

([1] ایک راگ ہے۔ [2] جیبی گھڑی) ۔ کسی شے میں افراط اچھی نہیں۔

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے　　اسی پر شیخ بے چارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہاں باقی رہے ہم میں وہ اوراد سحر گاہی　　وظیفے کی جگہ یا پانیر یا آئی ڈی ٹی ہے

(I. D. T. = ایک انگریزی اخبار کا نام ہے) ۔ ضروریات کے مقابلہ میں مذہب کوئی چیز نہیں ہے۔

مطلع انوار مشرق سے ہے خلقت بے خبر　　مستند پر تو وہ ہے مغرب سے جو منقول ہے

روحانیات میں بھی مغرب ہی کی تقلید ہے) مراقبہ کچھ نہیں مسمریزم سب کچھ ہے۔

راہ مغرب میں یہ لڑکے لُٹ گئے　　واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

"نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے"۔

نہ مانا شیخ جی نے چکھ گئے دس پانچ یہ کہہ کر　　اگر قابض ہوں یہ بسکٹ تو ہوں اللہ مالک ہے

دیکھئے مرض شکم اتنا غالب آیا کہ حکیم عقل کی اس کے سامنے کچھ نہ چلی۔

شکر ادا کرنا ہے واجب ان کی طبع نیک کا　　ہر دٹز سے بھیجے ہیں مجھ کو فوٹو[1] کیک[2] کا

ضعف سے رعشہ ہے یا غربی ہوا کا ہے اثر　　ہینڈ[3] کو میری مرض لاحق ہوا ہے شیک[4] کا

[1] عکسی تصویر Photo [2] انگریزی کھانا Cake [3] ہاتھ Hand [4] ہلنا Shake

مصافحہ کو to shake hands کہتے ہیں اور شیک کے معنی ہے کے بھی ہیں انھیں دونوں معنوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

وہ کبھی مجھ کو جواب نامہ لکھتا ہی نہیں　　جب گلہ کرتا ہوں کہدیتا ہے پہنچا ہی نہیں

فرائض

قرآن کو زبان سے دل میں اتاریئے — علمی نمونہ چھوڑ عمل کو سنواریئے
چشم و زبان میں کیجئے پیدا اثر جناب — بعد اس کے بندگان خدا کو پکاریئے

ماضیت کہنہ نقشئے مستقل است و ہمے — در حالش ار نہ بینی اے وائے بر نگاہت
مشرب مرا قناعت، مذہب مرا طریقت — ملئے اگر تو خادم رکئے اگر تو رخصت
نواب کہتا ہے مل جاؤں گا کر ان کی مدد — چھپا ہوا ہوں غریبوں کی بھوکھ پیاس میں میں

متی کا عہد نامہ جدید ملاحظہ ہو۔

ہرگز نہ قضا کرو نمازیں — مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
تیری تنخواہ بڑھی شکر ہے لیکن اے دوست — تیری تو کچھ نہ ترقی ہوئی تنخواہ کے ساتھ
کرو طاعت خدا کی بس وہی معبود برحق ہے — اسی کی شان یکتائی جہاں میں آشکارا ہے
اگر اعمال اچھے ہیں تو پاؤ گے بڑے درجے — سمجھ لو امتحاں اس دار فانی میں تمھارا ہے
بزرگوں کا ادب اللہ کا ڈر شرم آنکھوں میں — انھیں اوصاف کی نسبت مذاہب میں اشارا ہے
محنت کا امانت کا قناعت کا شجر ہو — جس رنگ کا پھل آئے وہ عزت کا ثمر ہو
خالق پہ بھروسا ہو تو عزت نہیں گھٹتی — افسوس کہ انسان بہت پست نظر ہے

نفس کی خواہش کے آگے عقل کی سنتا ہے کون
میں کہوں کس سے کہ اس غفلت سے ڈرنا چاہئے

شامت آئی ہے یہ مسلم ہے — بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی
میری جانب اشارہ غالب ہے — یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی
خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو — کھل ہی جائے گا آئی ہے جس کی
اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے — بڑھ گئی ہے مری بہت وقعت (طہراب)

بزم ہستی میں محبت کے ترانوں کو نہ چھوڑ — یہ وہ شے ہے جسے ہر سازسے اک سازشں ہے

ہے یہی دستور لیکن کس قدر افسوس ناک — زندگی ہی کو سمجھ لینا مآل زندگی

غنچہ کھل جائے تو پھر زینت محفل نہ سہی — خود شگفتہ رہے گلدستہ میں داخل نہ سہی

دل وہ ہے جو باغ ایماں کی ہوائے پھول جائے — آخرت کی یاد میں دنیا کو بالکل بھول جائے

نیت ہو اگرچہ خیر و ایماں کی طرف — آنکھیں نہ اٹھاؤ بزم عصیاں کی طرف

مانا کہ پڑھو گے وہاں پہنچ کر لاحول — جانا ہی ضرور کیا ہے شیطاں کی طرف

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظ طریقت — دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق

اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو — انگریز کو ہے ٹیٹو سے جس قدر تعلق

حدیں قوموں کی قسمت کی کیا کرتا ہے یہ قائم — زمانہ دیکھ کر چلیئے طریق زندگانی میں

محبت کس طرح اس قوم میں باہم رہے قائم — زبانیں صرف غیبت دل ہیں ڈوبے بدگمانی میں

مطلب یہ ہے کہ پیٹھ پیچھے برائی کرنا اور خواہ مخواہ لوگوں پر شک کرنا چھوڑ دینا چاہئے۔

زندگی روز قیامت میں ریلیشن[1] سمجھو — اس کو کالج اور اسے کانووکیشن[2] سمجھو

[1] رشتہ۔ علاقہ [2] جلسہ تقسیم اسناد۔

جس سے جو بن پڑے وہی کام کرے — صاحب بنے کھائے کھیلے آرام کرے

لیکن رہے قومی بھائیوں کا ہمدرد — ہر حال میں ادعائے اسلام کرے

ہنسی خوشی سے ہے بہتر کنارہ کش ہونا — یہ لطف کیا کہ جدا ان سے ہوں ملال کے بعد

جس نے رکھا نہ فضولی سے سرو کار اکبر — مرد عاقل ہے وہی دہر کے مہمانوں میں

قلزم کی تہ ٹٹولو یا ایئر شپ میں جھولو — جب بھی یہی کہوں گا اللہ کو نہ بھولو (ہوائی جہاز)

اپنی جگہ سے تم نہ ہٹو گو ہوں گردشیں — ایسے رہو کہ جیسے انگوٹھی میں نگ رہے

مقلد لیڈر مرحوم کے اتنا نہیں سمجھے — غریبی اور محنت پہلے یا جاہ و حشم پہلے

ذرہ ذرہ سے لگاوٹ کی ضرورت ہے یہاں — عاقبت چاہئے تو انسان زمیندار نہ ہو

ہر آرزوے دلی کی تم پچ نہ کرو — لالچ میں بہت ضرر ہے لالچ نہ کرو

شیخ جی قانع کے گھر میں لو جنم — ورنہ اب مٹی ہے ہستی آپ کی

فلسفے میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی — سعی کا موقع ملے تو آرٹ[1] یا سائنس سیکھ
دشمن دانا سے بچ پہچان لے نادان دوست — صرف لفاظی سے ان روزوں نہیں ملنے کی بھیکھ

[1] آرٹ کے معنی یہاں ادب کے نہیں ہیں ہنر کے ہیں۔

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ در کار اند — تا تو پاسے بکف آری و کنی عہدہ پری
طاعت حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے — شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

ابر و باد و مہ و خورشید فلک در کارند ٭ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری (سعدی)

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے — لطف کیا ہے لدئے موٹر پہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اُٹھا — روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

فیشن اعمال نامہ کی نہوگی کچھ سند — حشر میں تو نامۂ اعمال دیکھا جائے گا

چاہا جو میں نے ان سے طریق عمل پہ وعظ — بولے کہ نظم ذیل کو ارقام کیجئے
پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ — خالق کا شکر کیجئے آرام کیجئے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم — تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجئے
یورپ میں پھر ئے پیرس و لندن کو دیکھیے — تحقیق ملک کا شغر و شام کیجئے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن — خاطر سے محو خطرہ انجام کیجئے
پیران بے فروغ کا گل ہو چکا چراغ — ناحق نہ دل کو تابع اوہام کیجئے
رکھئے نہ دل کو دیر کلیسا سے منحرف — متروک قید جامۂ احرام کیجئے
رہئے جہاں میں وسعت مشرب سے نیک نام — مجھ کو مرید ہندوں کو رام کیجئے (قابو میں لائیے)
رکھئے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر — دولت کو صرف کیجئے اور نام کیجئے
سامان جمع کیجئے کوٹھی بنائیے — باصد خلوص دعوت حکام کیجئے
آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے — تزئین طاق و سقف و درو بام کیجئے
یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہوجئے — موقع ملے تو شغل مئے و جام کیجئے
چشم و لب بتاں سے بھی غافل نہ ہوجئے — تکمیل شوق پستہ و بادام کیجئے (لب و چشم)
نظارہ مساں سے ترو تازہ رکھئے آنکھ — تفریح پارک میں سحر و شام کیجئے

مذہب کا نام لیجئے عامل نہ ہوجئے　　جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجئے
طرزِ قدیم پر جو نظر آئیں مولوی　　پبلک میں ان کو موردِ الزام کیجئے
زنجیرِ فقہ توڑیئے کہہ کر خلافِ شرع　　مضمون لکھئے دعوی الہام کیجئے
ممنوع ہے تعددِ ازدواج خاص کر　　یوں گھوم گھوم پھر کے تنقیہ عام کیجئے (صفائی)
قومی ترقیوں کے مشاغل بھی ہیں ضرور　　اس مد میں بھی ضرور کوئی کام کیجئے
لڑکے نہوں تو ہو نہیں سکتی چہل پہل　　فکریں پئے وظیفہ و انعام کیجئے
تحصیل چندہ کیجئے لڑکوں کو بھیج کر　　سارا علاقہ ہند کا اب خام کیجئے {قبضہ کرکے مالگذاری وصول کرنا}
بے رونقی سے کاٹئے کیوں اپنی عمر کو　　کیوں انتظار گردشِ ایام کیجئے
جو چاہیئے وہ کیجئے بس یہ ضرور ہے　　ہر انجمن میں دعوے اسلام کیجئے

لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے
مردوں کے ساتھ قوم میں آرام کیجئے

کیا فرض یہ ہے کہ ہم ڈھٹائی سے رہیں　　لازم کیا ہے۔ بلند ادائی سے رہیں
کافی ہے خدا کی یاد اک گوشہ میں　　روٹی مل جائے اور صفائی سے رہیں

High thinking and plain living بلند خیالی اور سادہ زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

مذموم ہے رمز و طعنہ و کبر و حسد　　رکھو یہ روش کرے جو اللہ مدد
ہم رنگ سے ارتباط با صدق و صفا　　بے میل سے احتراز بے کینہ و کد

رمز یہاں کپٹ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

قافیہ

اے قبلہ مجھ پہ آپ چڑھے آتے ہیں یہ کیوں
ممبر اس انجمن کا ہوں ممبر نہیں ہوں میں

ممبر (۱) رکن ۔ ممبر لکڑی کی نشست جس پر بیٹھ کر وعظ کہا جاتا ہے۔

ضرورت کچھ نہ تھی اس کی کہ اس میں بھی ہو جاتے
سلام و رحمۃ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ[1] اور گڈ ڈے[2]

حیات مذہبی سے بھاگنا تھا کھیل گڑیوں کا
کہاں کی قوم ہاں کچھ بن گئے ہیں نازنیں گڈے

[1] روز بخیر = Good day [2] شب بخیر = Good night

بندٹاپے میں تھے وہ بنگلے پر
صبح کے وقت ہنس پڑی اک میم

جب وہ بولے بجائے کو کروں کوں
مرغ شاخ درخت لاہو تیم

زندگی سے میرا بھائی سیر ہے
پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

عقل نے اچھی کہی کل لالہ مجلس رلے سے
جھک کے ملنا چاہئے ہم سب کو ویسرائے سے

شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیے ہیں اس کے خوب
کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

فقط سڑکوں سے تسکین نگاہ چشم شرقی ہے
اندھیرا ہے گھروں میں راستوں میں لیمپ برقی ہے

ابتدا گرمی کی ہے اپریل سے
اب میں گھبرانے لگا کھپریل سے

موج ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی
جا کے گنگا پہ کیا کرتا ہوں جے مائی کی

میں کیا کروں گا عزیزو یہ پارٹی[1] لے کر
مزا تو جب ہے کہ آئے وہ یار ٹی[2] لے کر

خموش ہو گیا بت کی طرح میں کونسل میں
برہمن اٹھے جو اپنی مجارٹی[3] لے کر

[1] دعوت رخصت = Party [2] چاء = Tea [3] کثیر جماعت = Majority

مرغی نے کہا خوب کسی کیمپ میں لٹکے
انڈا وہی اچھا ہے کہ بچہ جیسے کھٹکے

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندھان ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نا بدان ہیں

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو
وہ زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

یا ایجیٹیشن کے صدقے چاہئے دودھ اور کھانڈ[1]
یا ایجیٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈلے[2]

یا قناعت اور طاعت میں بسر کر زندگی
رزق کی کشتی کو کھے پتوارلے اور ڈانڈ لے

[1] شکر [2] ایک مقام کا نام ہے

چھوڑ کر رنج اپنے مٹنے کا — منتظر ہوں اب ان کے پٹنے کا (یعنی رقیبوں کے)

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر — بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر

سودا اُس کو ہے جو سدھا رالندن — وہ دولت و جنس گھر میں جو تھی لے کر

یہ بولے رو کے پیروا ور گیا دین — دھرم دنیا سے اُٹھا اور گیا دین

مس کو دیکھا عاشق زلف چلیپا ہو گیا — مست تھا دل بھول کر وسکی کا پیا پہو گیا

من العلم قلیلا کو بھی دیکھو بعداد تیتم — نہ مانو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جو تی تم

چیکوں دنیا سے کس طرح میں — عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں

قومی چندے کدھر سمائیں — کالج نے کہا کہ تو ند ہوں میں

بولے جاڑوں میں لالہ گنگا دین — دھوپ سے مجھ کو ہوتی ہے تسکین

ڈاڑھی سورج کی تھام لیتا ہوں — مختصر یہ کہ گھام لیتا ہوں

اس کے دست ناز میں سے پائی ٹی — اب کہاں باقی ہے ہم میں پائیٹی (چائے۔ تقدس)

اجل آئی اکبر گیا وقت بحث — اب اف کیجئے اور نہ بٹ کیجئے If: اگر But: مگر

ہوتا ہے نفخ یور بین نان پاؤ سے — میں خوش ہوں ایشیا کی خیالی پلاؤ سے

جو پوچھا میں نے ہوں کس طرح ہے پی — کیا اس بت نے میرے ساتھ مے پی

خوش =

نہ سن تو قران کا وعظ بھائی خوشی سے تقلید ہکسلے کر — پھرے گا کمپوں میں اخر اک دن دیا سلائی کا بکس لے کر

Haxley = ایک انگریزی فلسفی)۔ قافیہ کی تلاش دیکھئے اور جستجوے سخن کی داد دیجئے۔

رندان پختہ کار کو موسم کی قید کیا — موقوف مے کشی نہیں ماہ اگست پر

اثر یہ تھا عیسوی نفس کا کہ زندہ ہوتا تھا جسم بے جاں

یہاں تو ہم مر رہے ہیں لیکن بتان ترسا کے دم میں آ کے

قول بابو ہے کہ جب بل پیش ہو — پیش حاکم بلبلا نا چاہئے

محبت اپنی ہی پریوں سے رکھیں حضرت اندر — مس مغرور لندن ان کی چیری ہو نہیں سکتی

فزوں ہے دلکشی مشرق کی مغرب کی لطافت سے — حریف بلبل گلشن کینری ہو نہیں سکتی

ادھر ہے جلوۂ مضموں ادھر حسن قوافی ہے — یہی اک شغل میرے دل کے بہلانے کو کافی ہے

سر میں شوق کا سودا دیکھا — دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا (جلوہ دربار دہلی)
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا — کیا بتلائیں کہ کیا کیا دیکھا
نظم ہے مجھ کو بادہ صافی — شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی — خیر اب دیکھئے لطف قوافی
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا — اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا — حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

Lord کی خرابی ۔ لاٹ لکڑی کا ایک بڑا ستون۔

خیموں کا ایک جنگل دیکھا — اس جنگل میں منگل دیکھا
برمھا اور ورنگل دیکھا — عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

کشتی لڑنے کی جگہ ۔ بیٹھنے کی درباری کرسی ۔

اگزیبیشن کی شان انوکھی — ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی — من بھر سونے کی لاگت سوکھی
گو رقاصہ اوج فلک تھی — اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی — بزم عشرت صبح تلک تھی
کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے — کوئی مانے خواہ نہ مانے
ہم تو سنتے ہیں یہ فسانے — جس نے دیکھا ہو وہ جانے

بلبل ہیں آج ہم چمنستاں کے کیمپ کے — پروانے کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے
فکر بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی — اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں پمپ کے
رکھتے تھے جو ہر اک قدم پھونک پھونک کر — خوگر ہوئے ہیں لیپ کے اسکپ کے جمپ کے

Leap Skip, Jump = اُچھل کود پھاند۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے — میں نہ مانوں گا کہ وارث آپ کے لنگور تھے
موت چل دی میری مشت استخواں کو سونگھ کر — چونک اُٹھا اکبر غرض خواب گراں سے اونگھ کر

دیکھی جو نمائشِ چکا گو — دل نے کہا دین سے کہ بھاگو
اتنے میں اجل پکاری سر پر — بس ہو چکا خوابِ زیست جاگو
آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اس کو پلاؤ قلیا
سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری — پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری — تیزی تھی ہر جمپ سے جاری
([illegible] ۱۹۰۳)
کچھ چہروں پر مردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی — دل نے جو حالت کردی دیکھی
ڈالی میں نارنگی دیکھی — محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی — دہر کی رنگا رنگی دیکھی
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم — ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم چم چم
پر تھا پہلوئے مسجد جامع — روشنیاں تھیں ہر سو لامع
جس کو دیکھو دید کا طامع — کوئی نہیں تھا کسی سامع
سرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی — سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی — لطف کی دولت لٹتی دیکھی
چوکی ایک چوکھی دیکھی — خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی — دودھ اور شہد کی مکھی دیکھی
ایک کا حصہ من و سلوا — ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک حصہ بھیڑا اور ریلوا — میرا حصہ دور کا جلوا
اوج برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا — رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوج بخت ملاقی ان کا — چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا — آنکھیں میری باقی ان کا
ہجر کی شب یونہی کاٹو بھائیو — ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو
جو سچی بات ہے کہدوں گا بے خوف و خطر اس کو — نہیں رکنے کا میں ہرگز پری ٹوکے کہ جن ٹوکے
انار آتے جو کابل کے تو پڑتے سب کے حصہ میں — امیر آئے تو ہم کو کیا مزے ہیں لارڈ منٹو کے
فرما گئے ہیں یہ خوب بھائی گھورن — دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن
تمھاری شاعری یہ پھلجھڑی ہے یا پڑاقا ہے — یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کا سنّاد ہاقا ہے

قوم

کمر باندھی تھی یاروں نے جو راہ حب قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا

کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

خدا کے منکر بنی سے غافل کہاں کے پیر اور امام صاحب
انھیں کے در پہ جھکی ہے خلقت سلام صاحب سلام صاحب

دل تو مدت سے ہے خاک در دیر اے اکبر
ہاں زباں پر ہے مگر کفر کی تردید ہنوز

ملت کو جو دیکھو تو نہیں حامی دیں ایک
قوت کو جو پوچھو کہیں دو دل بھی نہیں ایک

حریفوں سے لگاوٹ کرتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں
یونہی بربادیاں آتی ہیں یونہی گھر بگڑتے ہیں

کپتان اپنی موج میں ہیں ہم ہیں ڈوبتے
واللہ قوم پر ہے یہ قومی جہاز بوجھ

ٹٹو پہ جس طرح سے ہو تازی کا ساز بوجھ
یوں بابوان ہند پہ اب ہے نماز بوجھ

اب تک کوئی بہتری تو ظاہر نہ ہوئی
گذرے جاتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم

شاید کہ یہی ترقی قومی ہے
ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ جوش میں گویا ابھر رہے ہیں

ادھر ہے قوم ضعیف و مسکیں ادھر ہیں کچھ مرشدان[1] خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

جو خیال میں نرالے تو مذاق میں انوکھے
نہ وہ وضع قوم کی ہے نہ وہ شان ہے نہ دھج ہے

کوئی ان میں ہے جو ایسا کہ وہ دون[2] کی ہے لیتا
جو اسے بھی چھیڑ دیکھا تو وہ کمتر از کھرج[3] ہے

جو کر آئے سیر لندن ہیں اسیر کبر و فیشن
جو نہیں گئے ہیں بن ٹھن انہیں ایڈ گرج ہے

نہیں کوئی صاف سینہ بہم ان میں بھی ہے کینہ
یہ انھیں کہیں کمینہ وہ انھیں کہیں اُچج ہے

کہیں میم کا ہے پھندا کوئی دخت رز کا بندہ
ہے پھر اس پہ تازہ خندہ کہ دل اس میں کیا حرج ہے

---

[1] لیڈر [2] بہت بلند راگ [3] بہت آہستہ راگ۔

تھا شوق ادائے مطلب اک حسن کے ساتھ — اکبر نے جو فکر کی تو وہ بات بنی
دیوانہ تھی قوم عشق میں پریوں کے — پکڑی گئی اور غلام جنات بنی
ہو جنھیں مقدرت وضع و نفاذ قانون — بس انھیں کو صفِ اقوام میں نیشن سمجھو

(قوم) اصلی قومیت کیا ہے؟

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے — غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے
فلسفۂ الحاد کا کر لیجئے فوراً قبول — دین کی ہو بات تو ابطال پر ٹھن جائیے
چندے کے مجلس میں پڑھئے رو کے قراں مجید — مذہبی محفل میں لیکن مثلِ دشمن جائیے
شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت — رُوٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جائیے
وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں — اغیار ان پہ گذرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زبان کی کبھی بحث — ہے سخت مضر یہ نسخہ گاؤزباں
اے شیخ جب نکیل نہیں دست قوم میں — پھر کیا خوشی جو اونٹ مرے ریل ہو گئے
اب تو جاگو ایشیائی بھائیو — نیند کی غفلت میں صدیوں سو لئے
ایک اس عہد میں دو دل بھی نہیں اے اکبر — یہی باعث ہے کہ میں نے کبھی ہم ہم نہ کیا
ہر سمت تو ہے اک دام بلا رہ سکتے ہیں خوش کس طرح بھلا — اغیار کی کاوش ایک طرف آپس کی لڑائی ایک طرف
ناتوانی سے مٹا جاتا ہے آپس کا وہ میل — نبض کے ساتھ ہے اب سانس کو چلنا مشکل
ہنر سے بھی فوائد ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے — سبب یہ ہے کہ ہم آپس میں یکدل ہو نہیں سکتے
مجرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا — کہ قدر اُٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی
اتحاد باہمی اس ملک میں آساں نہیں — کوئی سر سید ہے کوئی بابو آشوتوش ہے

مختلف الخیال و مختلف المذاق لوگ یہاں جمع ہیں۔

گردن فارمر کی ہر اک سمت تن گئی — بگڑی ہو قوم کی مگر ان کی تو بن گئی
قوم کی مسجد میں کیجے جھاڑ پھونک — اسپتالوں میں وہ اچھی ہو چکی
کوئی صاحب نہوں للہ ناخوش سن کے یہ مصرعہ — خیال حبِّ قومی پیچھے اور فکر شکم پہلے
کوئی مرکز ہی نہیں پیدا ہو پھر کیونکر محیط — بھول ہے پیچیدگی ہے ابتری ہے بھول ہے

کیا خوشی اس کی مجھے۔ ان کو جو نوابی ملی — روغنی صاحب نے لی مجھ کو وہی آبی ملی

نہ سُنّی ہے خوش اور نہ شیعہ ہے شاد — ہے دونوں کے مرکز میں باہم فساد

یہ ۱۹۱۸ء کا نقشہ ہے جس وقت جنگ عظیم رک گئی تھی مگر ترکستان پر مالی، اقتصادی، تجارتی، ملکی، سیاسی ہر قسم کا انتشار تھا اور ایران میں خانہ جنگی ہو رہی تھی کاش مرحوم ۱۰ برس تک اور زندہ رہتے تو جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہی دیکھتے کہ فضل خدا سے اب مرکز بھی قائم ہیں آپس میں اتحاد بھی ہے ہر طرح کی ترقی بھی ہے۔

نہ تجارت کا طریقہ نہ عبادت کا لگاؤ — یا گورنمنٹ کے دفتر میں ہیں یا قوم کے سر

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قوم بکس پگھل رہی ہے — نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچہ میں ڈھل رہی ہے

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے — قوم ہی کو دیکھئے زندہ ہے اور موجود ہے

لفظ قومی پر بلا مرکز اکڑنا چاہئے — اس کے یہ معنی ہوئے آپس میں لڑنا چاہئے

کیا اچھے ڈھب سے صلح اور میل وملت کی نصیحت ہے۔

ہم کو سنبھالتی ہے ملّت جو لا بنائے — مَیں کو نباہتی ہے عزت جو دل میں آئے (قانون)

کیا حال قوم مجھ سے تو پوچھتا ہے ہمدم — ہم کا پتہ نہیں ہے مَیں ہیں مگر بہت کم

جب پیشوا نے اپنا کعبہ جدا بنایا — اپنے مزے کو سب نے اپنا خدا بنایا

جھوٹی لگاوٹوں سے ہرگز نہیں ہے سیری — حرص وطمع نے کھودی اس قوم کی دلیری

بگذار بہ حال خودم اے بزم تسلی — غیرت زدہ را کار بہ آمرزدگاں نیست

عزت = Honour

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں — قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

کوئی نہ آیا میرے پاس "ہر کو جپ" کے لئے — جو صورتیں نظر آئیں وہ صرف ہپ کے لئے

"ہر کو جپ" کہنے کے لئے

حافظہ کے فیض نے روکا ہے باب اتحاد — شکوہ انگیز اک نہ اک قصہ ہر اک کو یاد ہے

استخوان مغربی کا شکر کرنا ہے بجا — باہمی عف عف یہ لیکن قابل افسوس ہے

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے — کالج کے چیونٹے لپٹے ہیں ٹیڑی کی ٹانگ سے

عالم میں چپ جو مستند و باوقار ہیں — گونجا ہوا پرس ہے وفاقی کی سانگ سے

پولیس میں شیخ ہیں مسجد اُجاڑ ایوان خالی ہے
کتب خانہ بھرا جاتا ہے اور میدان خالی ہے

اس کا پسیجنا ہے اور اس کے ہیں بھپارے
یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

اس خوان مغربی سے بچتا ہے کون لیکن
حضرت نگل رہے ہیں بندے نے چکھ لیا ہے

قومی ترقیوں کی زمانے میں دھوم ہے
مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

گردن کشی کریں گے عرب میں اب اونٹ بھی
ابتک تو ہند ہی میں بھڑکتی تھی مجھ سے گاے

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

قوم پر ممبری کا فیر ہوا
کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا

شیخ جی مر گئے کمیٹی میں
غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

وہ قوم کی شرط ہی نہیں ہے زبان کہیں ہے مکاں کہیں ہے
ستون ہی جب نہیں میسر تو کیا دکھاؤں میں ٹھاٹھ چھت کا

دنیا کی ہوس دھرم[1] کا لیتی ہے جو رنگ
دقت ہوتی ہے جاتری[2] ہوتے ہیں تنگ

گنگا جی کا بہاؤ تو یکساں ہے
آفت ہے مگر پراگ[3] والوں کی یہ جنگ

[1] مذہب [2] مسافر [3] پراگ۔ الٰہ آباد کا پرانا نام ہے پہلے پراگ تھا پھر فقیر آباد ہوا پھر الٰہ آباد ہوا۔

جن لوگوں کا قومی کوئی مرکز نہیں ہوتا
ان میں کا کوئی فرد معزز نہیں ہوتا

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

خیال حالت قومی سے دل کو پست کرتا ہوں
مگر جب دیکھتا ہوں اپنا بنگلہ جست کرتا ہوں

قصیدہ

قصیدہ مبارکباد جشن جوبلی ملکہ معظمہ قیصر ہند حسب ایمائے مسٹر ہاول صاحب جج ۱۸۸۶ء

زمانے میں خوشی کا دور ہے عشرت کا ساماں ہے
برنگ گل ہر اک باغ جہاں میں آج خنداں ہے
کہیں ہے رقص کی محفل کہیں ہے جلسہ دعوت
کہیں تصویر بنتی ہے کہیں سرو چراغاں ہے
کہیں خیرات خانے جاری ہوتے ہیں کہیں مکتب
کہیں تقسیم کپڑوں کی پئے فصل زمستاں ہے
تعجب کیا اگر ایسی خوشی ہے اہل عالم کو
یہ حیرت کیا جو قیصر کا ہر اک دل سے ثنا خواں ہے
سریرآرائی پنجاہ سالہ خیر و خوبی سے
محل لطف باری ہے مقام شکر یزداں ہے
رئیس امن واماں سے ناظر حال ریاست ہیں
ہری کھیتی زمینداروں کی ہے سرسبز دہقاں ہے
ہزاروں مدرسے قائم ہوئے ہیں سیکڑوں کالج
جہاں فکر ارسطو بس بھی اک طفل دبستاں ہے
جہاں چلتا نہ تھا کچھ زور رواں اب ریل چلتی ہے
میسر خاکساروں کو بھی اب تخت سلیماں ہے
نہ کچھ کھٹکا ہے چوروں کا نہ قزاقوں کی ہے دہشت
رواں بے زحمت و خوف و خطر ہر سمت انساں ہے
طلسم تازہ دیکھا کارخانہ تار برقی کا
زبان تار پر وہ بات ہے جو دل میں پنہاں ہے
محبت بڑھ رہی ہے فاتح و مفتوح کی باہم
گرہ جو دل میں تھی وہ اب مثال در غلطاں ہے
پریس کو بھی ہے عہد امپرس میں کامل آزادی
زباں خامہ مضموں نگاراں سیف براں ہے
فروغ مہر و مہ سے جب تلک ہے زینت عالم
نشاط انگیز جب تک گردش گردوں گرداں ہے
دل اہل جہاں ہے جب تلک مرکز تمنا کا
ہوائے آرزو جب تک محیط قلب انساں ہے
خدا کے نام کی عزت ہے جب تک اہل دانش میں
تجلی علم کی جب تک چراغ راہ عرفاں ہے
ہماری حضرت قیصر اس اقبال و صحت سے
کہ جن کا آفتاب عدل اس کشور پہ تاباں ہے

ظرافت

لغزشیں مد ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف
سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

کمزوریاں

خوان فلک پہ جو ملے شکر کے ساتھ کر قبول　　غم کی شکایتیں ہیں کیا آیا ہے پیش کھا بھی جا

پیش آنا اُردو کا محاورہ نہیں ہے۔

ترا ناوک بھی اے صیاد کیا ہی اوج پر ور ہے　　کہ تیرا صید بسمل رہتا ہے آخر نہیں ہوتا

آخر نہیں ہوتا اُردو میں نہیں کہتے۔

نہ خلق اس کی خبر لیتی نہ عقل اس کی مدد کرتی　　خدا جب تک کسی کا حافظ و ناصر نہیں ہوتا

ہے، کا حذف خلاف فصاحت ہے۔

اس مس پہ کون میرے سوا ہو فریفتہ　　گاہک میں ہی ہوں ہند میں لندن کے مال کا

مال کا لفظ ویسا ہی ہے جیسا، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسہ پر　　خموش ہو گئے آخر کو تین چار کے بعد

اخلاق سوز ہے۔

ہر لگاوٹ کی وہ دھج ہے کہ تڑپ جاتا ہے دل　　کسی اُستاد سے تم سیکھے ہو شرمانا بھی

سیکھے ہو۔ تم نے سیکھا ہے۔

لیا نہ تخلیہ میں ان کا بوسہ چوک ہوئی　　بلا سے مجھ پہ وہ ہوتے اگر خفا ہوتے

جناب حضرت واعظ کا واہ کیا کہنا　　جو ایک بات نہ ہوتی تو اولیا ہوتے

نہ رہنے دے گا مجھ کو جوش دل اب دستکش ہرگز　　قیامت ہو گیا ہے آپ کا سینہ ابھرنے سے

ویسا ہی جیسے ؎ دست عشاق یار کب آئیں + ہاتھ ٹوٹیں کہا کرے کوئی

تیروں نے غم کے قلب کو کمبخت کر دیا　　سوز دروں نے سینہ کو دم پخت کر دیا

پخت نہیں پُخت ہے　　غلط ہے۔

جھنجھلا کے بولے ان سے جو لپٹا اندھیرے میں　　اندھیر اس طرح کا تو دیکھا کہیں نہیں

ابتذال ہے محض اندھیرے اور اندھیر کے لئے شعر کہا گیا　مثلاً (جان صاحب)

"ہو اندھیرے کا برا شرم سے کٹ کٹ گئی ہیں + جس کو لپٹایا تھا میں نے مرا بھائی نکلا۔

ایسا شوق نہ کرنا اکبر گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا ہم بھی کالے یار بھی کالا

نیچر نے دیدیا ہے پٹہ رجولیت کا کیونکر نہ ہوں بتوں سے طالب قبولیت کا (مردی)

تخلیئے میں آج میں نے اُن کا بوسہ لے لیا دیکھیئے ڈگری جو ہو دعوے تو دائر ہو گیا

مبتذل اور بازاری ہے۔

جو سن چکے میری غزلیں تو بولے جذبہ لا جو ہنہنایا ہے اتنا تو آج لید بھی کر

اس شعر سے کس قدر تعفن آتی ہے کیسی غلاظت آمیز تشبیہ ہے

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

بازاری محاورہ ہے اور بازاری معنوں میں ہے۔

گو کہ وہ کھاتے پڈنگ اور کیک ہیں پھر بھی سیدھے ہیں نہایت نیک ہیں
جب میں کہتا ہوں کہ گیومی کس ڈیر ہنس کے کہتے ہیں کر یو مے ٹیک ہیں

ٹیک کے بعد ہیں غلط ہے اس کے علاوہ سب غلط ہے بیکار ہے کوئی خاص بات نہیں۔

سینہ مس کا ابھارا ہے دل فساد انگیز ہے لوگ سچ کہتے ہیں باد بجاں باد انگیز ہے

کیسی بھونڈی تشبیہ ہے۔

ہر اک رمارک آپ کا عقرب کا نیش ہے مجھ کو بھی رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہے
مجھ سے کہا کہ گوز شتر ہے ترا سخن اس سے یہ کہدیا کہ تو گوبر گنیش ہے

دونوں مبتذل ہیں۔ بازاری ہیں۔ چرکین کے کلام کی بو آتی ہے۔

پیش آجائے جو مسجد تو نمازی بھی سہی بت جو موقع پہ ملیں دست درازی بھی سہی
گالیاں اس نے جو دیں وصل کا طالب میں ہوا کہدیا جان کہ ترکی ہے تو تازی بھی سہی

صرف ترکی اور تازی کے محاورہ کے لئے مننے نچھاور کئے گئے ہیں اور لطف یہ کہ محاورہ بھی غلط معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے پوائنٹ یہ سخت ہے اسے ٹچ نہ کرو

نقطہ . . . . چھونا ...) ۔ محض دو لفظوں کے استعمال کے لئے کس قدر مبتذل جذبہ کا اظہار کیا ہے۔

لپٹ بھی جا۔ نہ رُک اکبر غضب کی بیوٹی ہے	نہیں نہیں پہ نہ جا یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

حسن = Beauty - فرض = Duty) - محض قافیوں کے لئے مذاق سلیم کا خون کیا گیا ہے

سدیشی گورنمنٹ سے تج گئی	یہ بائی پیرمنٹ سے بچ گئی	(ریاح)

کتنی لغو اور غیر متین تشبیہ ہے۔

نہیں بدلی زباں اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے	میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں سٹ ڈاؤن کہتا ہے

Down کا تلفظ ڈاؤن ہے، کون کا قافیہ غلط ہے اس کے علاوہ دلیل نہایت کمزور ہے اور شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

کرتے ہیں بائیسکل خوب وہ دفع ریاح	اب تو بلین ارغنوں کا یہ سواری ہو گئی

کس قدر غیر مذہب مذاق ہے۔ محض پر گوئی کا نتیجہ۔

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ	علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ

کیا اچھی فرمائش ہے۔

ڑخا دیا ہراک کو مغرب نے پاس کر کے	سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کر کے

مصوریٔ فطرت

کہتے ہیں فطرت جسے یہ ہے نقاب روے دوست
ہے اسی پردہ میں پنہاں آفتاب روے دوست

پردہ فطرت خرد افروز و حکمت خیز ہے
ہے جنوں انگیز لیکن آب و تاب روے دوست

دیکھ لی جس نے جھلک اس کے وہ پہنچا دار تک
زینت ممبر ہوا محو حجاب روے دوست

ذوق معنی ہو تو اے اکبر نظر آگے بڑھا
عالم نیچر تو ہے لوح کتاب روے دوست

بہار آئی کھلے گل زیب صحن بوستاں ہوکر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرم فغاں ہوکر

بچھا فرش زمرد اہتمام سبزہ تر میں
چلی مستانہ وش باد صبا عنبر فشاں ہوکر

عروج نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گاے مرغان چمن نے شادماں ہوکر

بلائیں شاخ گل کی لیں نسیم صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روے رنگین بتاں ہوکر

جوانان چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر

پختہ طلعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشاں نقش پا ملتا نہیں

جوشش گریہ پیہم کا ہے باعث رنج یار
جزر و مد ہو نہ سمندر میں اگر ماہ نہو

ہو نمود اور حسینوں کی چلے جائیں جو آپ
رونق اجاے کواکب میں اگر ماہ نہو

محو تمکین رہے نفرت ہو سبک وضعی سے
صورت کوہ ہے انسان صفت کاہ نہو

خدا ہی جانے کتنے قالبوں میں مشترک ہوگی
یہ خاک جسم بھی دنیا میں تیری ہو نہیں سکتی

فنا کا دور جاری ہے مگر مرتے ہیں جینے پر
طلسم زندگانی بھی عجب اک راز فطرت ہے

دام ہستی کی بھی ترکیب عجب رکھی ہے
جو پھنسے اس میں وہ پھر جان بچا ہی نہ سکے

یہاں بیداریوں سے خون دل آنکھوں میں آتا ہے
گلابی کرتی ہے آنکھوں کو واں تاثیر سونے کی

سر خاک شہنشاہان عالم کہتی ہے عبرت
قدم رکھے بچا کر آئے جو شہر خموشاں میں

جب واقعات اصلی پیش نظر نہ آئے
شاعر نے کام رکھا تحسین و آفریں سے

الفاظ نے سنور کر اپنے قدم جمائے
نیچر نے کی گذارش رخصت ہوں میں یہیں سے

حسن نور شمع ہر محفل میں ہر شب ہے وہی
موسم باراں میں لیکن کثرت پروانہ ہے

خانۂ ہستی کے ٹکڑے اُڑ رہے ہیں نزع میں
پھینکئے اب کوٹ کو تہ کیجئے پتلون کو

اس بحر میں ہوں مثل حباب اے غم ہستی
طوفان میری کشتی کو ڈبو ہی نہیں سکتا

شور بلبل، جوش گل، موج نسیم، انوار صبح
اللہ اللہ کس قدر ہیں دلکشا آثار صبح

چھڑا ہے راگ بھونرے کا ہوا کی ہے نئی دھن بھی
غضب ہے سال کے بارہ مہینوں میں یہ پھاگن بھی

یہ رنگ حسن گل یہ نغمۂ مستانہ بلبل
اشارہ کرتی ہے فطرت ادھر آ دیکھ بھی سن بھی

ہوئے روشن یہ معنی چاند کیوں شاعر کو پیارا ہے
کمال اس میں یہ ہے عارض بھی ہے ابرو بھی ناخن بھی

۱؎ بدر ۲؎ پہلے ہفتہ کا چاند ۳؎ و نتیس کا چاند۔

مفلسی میں بھی تکلف دوست ہے طبع بلند
سرو بستاں بے بضاعت ہے مگر خوش پوش ہے

غضب کی آتش فشاں ہوا ہے پڑے ہیں بستر پہ جل رہے ہیں
عرق میں ڈوبے ہوئے سراپا تڑپ رہے ہیں ابل رہے ہیں

عامل ہے ہوا باغ کی معمول ہے مٹی
مٹی ہے کبھی پھول کبھی پھول ہے مٹی

عامل معمول مسمریزم کی اصطلاحات ہیں۔

منتشر ہونے میں پاتے ہیں اب آرام حواس
شوق مجموعہ ہوش خرد افزا نہ رہا

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں
اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی خوش رنگ چست نازک پیاری
پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا اُبھار
تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم
وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم

گو تابع جوش برق پروازی ہیں
دونوں کے خطوط طیر متوازی ہیں

کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے
اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے

ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں
فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں
پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

اس سمت اگر خیال انساں بڑھ جائے
دامان نظر پہ رنگ عرفاں چڑھ جائے

یہ نظم نظم معرا ہے یعنی Blank verse جس میں وزن تو ہے مگر قافیہ ردیف کچھ نہیں ہے۔

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر — بلا قصد ضرر اس کو ہٹایا میں نے انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل — نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا
ابھی وہ روشنی میں شمع کی کاغذ پر پھرتا تھا — لیا میرے سوا نوٹس ہی کس نے اُس کا دنیا میں

نوٹس لینا - خیال کرنا - To take notice

نہ تھی فطرت کی کیا کاریگری اس کے بنانے میں — نسب نامہ بھی اس کا عالم ذرات میں ہوگا
یہی تھی اس کی ہستی اور اسی میں اس کی مستی بھی — نہ ماتم کرنے والا ہے نہ لائف لکھنے والا ہے

لائف = حیات

وہ دھبا درس عبرت دے رہا ہے مجھ کو اے اکبر — معاذ اللہ کیا سمجھا ہے تو نے اپنی وقعت کو
تجھے بھی صفحہ روئے زمیں سے ایک دن آخر — مٹا دے گی کوئی تحریک فطرت حکم باری کی
عجب حیرت سے میں تو دیکھتا اس داغ کاغذ کو — مرے نظروں میں تو نقشہ یہ ہے دنیائے فانی کا

داغ = دھبا۔

صریحاً جسم تھا اک جان تھی احساس تھا اُس میں — اور اب دھبا سا ہے کیا جانے کوئی کیسا دھبا ہے
معاذ اللہ معاذ اللہ سناٹے کا عالم ہے — بہت جی چاہتا ہے روؤں اس ہستی کے دھبے پر

اصل کاغذ جس پر دھبا ہے حسن نظامی دہلوی لے گئے اس کا فوٹو انھوں نے چھاپا ہے۔

یہ ہیں برسات کے دن تیسری بھادوں گذری ہے — میں اپنا غم غلط کرتا ہوں کچھ اشعار لکھنے سے

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا — کیا دلکشا یہ سین ہے فصل بہار کا
نازاں ہیں جوش حسن پہ گلہائے دلفریب — جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم اُبھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب — نقشہ کھچا ہوا ہے خط و زلف یار کا
سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے — شبنم ہے بحر یا گہر آبدار کا
مرغان باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں — اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
پرواز میں ہیں تیتریاں شاد و چست و مست — اک ساز دلنواز ہے مضراب و تار کا
ابر تنک نے رونق موسم بڑھائی ہے — غازہ بنا ہے روئے عروس بہار کا

بدلی ہوئی رُت محسوس ہوئی بھونرے کی بھی آواز سُنی ۔ فطرت کی بسنتی یہ ٹھمری بے ساختہ و بے ساز سُنی
طوفانِ جوش دل کی آنسو میں ایک جھلک ہے ۔ موتی میں کیا دھرا ہے بس ایک بوند پانی
دور کوہ لبِ ساحل سے جو گذری اک موج ۔ کوہ نے اس سے کہا تو نے یہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دم چند ۔ بولی سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند
ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل ۔ اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل
ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب ۔ پوچھئے موج سے ہے بھی اسے رک جانے کی تاب
اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تعلی کیسی ۔ اضطراری ہے روش شان ارادی کیسی
بہ گئی موج یہ کہہ کر کہ میں مغرور نہیں ۔ تجھ میں اے کوہ مگر روشنیٔ طور نہیں

بلبلا ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

مصوری جذبات

بے ساختہ رہتی ہے مصیبت میں یہ لب پر — فطرت ہی کی جانب سے دعا بھی ہے کوئی چیز

دل کو بے عشق حقیقی نہیں ہوتی حرکت — وہیں چلتی ہے یہ کشتی کہ جہاں تھاہ نہ ہو

پھنسی جسم خاکی میں روح لطیف — اسیر کمند ہوا ہو گئی

وقت پیری آگیا اکبر جوانی ہو چکی — سانس لینا رہ گیا اب زندگانی ہو چکی

جلوہ نہ ہو معنے کا تو صورت کا اثر کیا — بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

خدا پناہ میں رکھے کشاکش غم سے — اسی سے تار نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے

خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل — پر کروں کیا یونہی تسکین ذرا ہوتی ہے

یہ اضطراب یہ بے چینیاں یہ بے تابی — مجھے ہمیشہ ہے بجلی کو ایک پل کے لئے

مریض غم کیا کرتا ہے ضبط نالہ ہمت سے — مگر منہ زرد ہو جاتا ہے جب کروٹ بدلتا ہے

بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں — کوئی گذری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

لندن کو چھوڑ لڑکے اب ہند کی خبر لے — بنتی رہیں گی باتیں آباد گھر تو کر لے

راہ اپنی اب بدل دے بس پاس کر کے چل دے — اپنے وطن کا رخ کر اور رخصت سفر لے

واپس نہیں جو آتا کیا منتظر ہے اس کا — ماں خستہ حال ہوئے بے یاد باپ مرے

مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ — پیران مشرقی سے اب فیض کی نظر لے

میں بھی ہوں اک سخنور آسن کلام اکبر
ان موتیوں سے آکر دامن کو اپنے بھر لے

عشرت صاحب کو لکھا تھا۔

عفو کن یارب اگر تقوے نماند بر مزار — دل بہ پہلو ہست و کارم با شباب افتادہ ہست

کمال شوق میں صرف اک نظارہ کافی ہے — حسن خود ہی ہے عاقل اشارہ کافی ہے

جس طرح ہے تجھے الم جسم کی تمیز — دیکھے گا درد جان کو بھی اک دن تو اے عزیز

بھوک سے زائد ہو جس کے پاس کھانا اس کے پاس — اتنی دولت ہے کہ رکھنے کی جگہ ملتی نہیں

پڑا ہے قحط بشر مر رہے ہیں فاقوں سے — خوشی ہو کیا مجھے شراب میں پڑاقوں سے
بجھی ہوئی ہے طبیعت یہ روشنی ہے فضول — اُتار لیجئے صاحب چراغ طاقوں سے

خط میں کیا لکھا ہے قاصد کو خبر کیا اس کی — پوچھتا ہے مجھے انعام ملے گا کہ نہیں
اک طرف دام ترقی اک طرف موج شراب — ہر طرح حاضر ہیں ہم کہئے پھنسیں کہئے نہیں
بیان اپنی مصیبت کا تھا مجھے منظور — خیال تھا سوے تشبیہ جستجوئیں تھیں
ہوئی جو ٹائی ٹنگ غرق کہدیا میں نے — کہ دل مرا تھا اور اس دل کی آرزوئیں تھیں
ٹے ٹنگ ٹکڑے ہوا ٹکرا کے آئس مرگ سے — دب گیا سائنس بھی آخر پیام مرگ سے

ایک جہاز کا نام ہے جس میں پندرہ عمائدین بوڑھے بچے عورت مرد ساحل کے دس میل کے اندر غرق ہو گئے۔ جہاز بنانے والوں کا دعوے تھا کہ برف کی بڑی سے بڑی چٹانیں اور موجوں کے زبردست سے زبردست طوفان بھی اس کو نہیں دبا سکتے۔ کیا اچھا نتیجہ نکالا ہے۔

کیوں جلا رکھا ہے اس دور نے پیری میں مجھے — ستم غیر ضروری یہ فلک کا دیکھو
کیا اگر دوں سے نہیں غیر ضروری یہ بات — اپنے مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو
خانہ امید نظر آتا ہے اُجڑا ہوا — دل کو حسرت ہے کہ یا اللہ کیا تھا کیا ہوا
جدا رہتا ہوں گو تم سے مگر دل خوش نہیں رہتا — جو بس ہوتا جہاں رہتے ہو تم میں بھی وہاں رہتا
یہ چاہتا ہوں طبیعت کو انتشار نہو — کسی پہ بار نہوں کوئی مجھ پہ بار نہو
بیان اے اثر میں جس کی قوت لا نہیں سکتا — زبانیں کہہ نہیں سکتیں دلوں پر جو گذرتی ہے

حواس و ہوش رخصت ہو چکے دم بھی نکل جاتا
تو فطرت کے جو قرضے ہیں وہ سب بیباق ہو جاتے (ادا ہو جاتے)

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا احساب + خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

میں چاہتا ہوں کہ بس ایک ہی خیال رہے — مگر خیال سے پیدا خیال ہوتا ہے

تمناؤں کی حالت کچھ نہ پوچھو دل کے بجھنے پر
اندھیرے میں نہیں معلوم پروانوں پہ کیا گذری

طلب تحسین کی کیوں تجھ کو ہے بزم حریفاں سے　　سرور طبع خود ہے داد تیرے خوش کلامی کا

جوانی نے تو اپنے واسطے ہم کو اُٹھایا تھا　　بوڑھاپا تو بٹھائے اب خدا کے واسطے ہم کو

تازگی طبع کی ممکن ہی نہیں ہجر کی شب　　قصہ سُن کر بہ تکلف کوئی سو جائے تو کیا

مذہب

موت کے عشووں کے آگے بار منطق کچھ نہ تھا
دل کو مذہب کے قدم پر سر کو دھرنا ہی پڑا

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

وہ بھی نافہم ہے جو خضر کا طالب نہوا
وہ بھی نافہم ہے جو خضر کو منزل سمجھا

خوبی مذہب دم آخر کھلی
نزع میں مونس فقط ایمان ہے

امید حور میں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر
خدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ پنجگانہ چلے

عہد طفلی سے ہے مذہب میں گرفتاری دل
ساتھ ساتھ اپنے بڑھا کی ہے یہ بیماری دل

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاح قوم
ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ

کعبے سے بت نکال دیئے تھے رسول نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

جب علم گیا تو شوق عزت معدوم
دولت رخصت تو ذوق زینت معدوم

مسجد سے یہ آئی گوش اکبر میں صدا
مذہب جو مٹا تو زور ملت معدوم

مذہب ہے گم ترقی یورپ کے سامنے
معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی

لیکن وہ آفتاب ہے اور یہ ہے مثل ابر
ابر غلیظ سے ہے نہاں آفتاب بھی

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ
تادم مرگ رہے یاد خدا جان کے ساتھ

میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی
سر ملانا تمھیں کیا فرض ہے شیطاں کے ساتھ

نہو مذہب میں جب زور حکومت
تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

ترجمہ۔ یکے از اکابر یورپ ۱۸۹۰ء

ہلائیں کس طرح سر صدر پر نزلہ ہے مذہب کا
بہت اونچے سروں میں بج رہی ہے ابتو گت ان کی

مگر قومی اطبا دور ہی کردیں گے یہ نزلہ
قوی اطفال کو کردے گی آخر تربیت ان کی

تماشا دیکھیئے بجلی کا مغرب اور مشرق میں
کلوں میں ہے وہاں داخل یہاں مذہب پہ گرتی ہے

یاروں کو فکر روز جزا کچھ نہیں رہی
بس کام ہے انھیں رہ عیش و نشاط سے

کہتے ہیں حرج کیا ہے جو تاریک ہے وہ پل
بائیسکل پہ گذریں گے ہم پل صراط سے

ہے نور خدا بھی طالب زرق کا دوست ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

ہیں ہوا پر کفر کے گیسو پریشان ان دنوں
کوئی دل میں کیونکر آئے بوئے ایماں ان دنوں

کھو دیا تمکیں دیں کو تو نے اے شوق نمود
عزت اصلی نثار نام عزت ہو گئی

یہ صندوق کتب بھاری ہے یارب اٹھ نہیں سکتا
یہ ہے مذہب تو مجھ سے بار مذہب اٹھ نہیں سکتا

"چار پائے برو کتابے چند"

یہ شان بے نیازی اور یہ بیگانہ فطرت
گلا کیا مرگ ہاشم کا وہی کیا تھا ہمیں کیا ہیں

لسان العصر کا چودہ برس کا جوان بیٹا

اسی حیرت میں عمریں کٹ گئیں ارباب بینش کی
کسے اللہ کہیئے اور کس کو ماسوا کہیئے

صداقت کے نشاں اس مصرعہ اکبر سے ملتے ہیں
کلیں سائنس سے چلتی ہیں دل مذہب سے ہلتے ہیں

منقبت

عاشق جو آستانہ مشکل کشا کی ہے ۔۔۔ تابش مری جبیں پہ نور خدا کی ہے
حب علی سے ہو گی دلوں کو شگفتگی ۔۔۔ کلیوں کو احتیاج نسیم و صبا کی ہے
روبہ مزاجیان سگ دنیا کی دیکھ لیں ۔۔۔ حسرت بس اب زیارت شیر خدا کی ہے
صورت شگفتہ ہر گل رنگیں قبا کی ہے ۔۔۔ مستانہ چال باغ میں باد صبا کی ہے
پھولوں سے لو لگائے ہے باد صبا کی لے ۔۔۔ دمساز تان بلبل شیریں نوا کی ہے
سبزہ لہک رہا ہے بصد انبساط طبع ۔۔۔ سنبل میں تاب یار کی زلف دوتا کی ہے
مرغان باغ وجد میں ہیں فرط شوق سے ۔۔۔ ڈوبی ہوئی مزے میں طبیعت ہوا کی ہے
آراستہ ہے ایک طرف بزم مومنیں ۔۔۔ کثرت لبوں پہ حمد و درود و دعا کی ہے
پوچھا جو اس سماں کا سبب بول اٹھے ملک ۔۔۔ پیدایش آج حضرت مشکل کشا کی ہے

جناب فاطمہ کے مرتبے کا کیا کہنا ۔۔۔ ہمیشہ چاہئے ان پر درود خوان رہنا
جناب حیدر کرار کی ہیں وہ بیوی ۔۔۔ حسن حسین کی ماں اور رسول کی بیٹی

معاشرت

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

مے انھوں نے پی اب انکے پاس کیونکر دل لگے
جانور اک رہ گیا انسان رخصت ہو گیا

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

کہاں کی پوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کی زمزم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب

عزیزان وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہے بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

فتنہ نہیں فساد نہیں شور و شر نہیں
یاں زن نہیں زمین نہیں اور زر نہیں

مانا کہ ہر طرح سے میں بے اختیار ہوں
پر یہ بتاؤ تم کو خدا کا بھی ڈر نہیں

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے
ہاتھ اس مس سے ملانا چاہئے

لطف ساقی سے نہ چھلکے جام دل
ظرف عالی کی یہی پہچان ہے

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا

غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا

اکبر نے سنا ہے اہل عزت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

ہر چند محل انقلابات رہا
گھٹنے بڑھنے کا بیچ دن رات رہا

چھوڑی نہیں منزلیں قمر نے اپنی
ذی رتبہ و صاحب مقامات رہا

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی
دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی
ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی

کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ
عزت کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے

لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

آگاہ ہوں معنیٔ خوشِ اقبالی سے ۔۔۔ واقف ہوں بنائے رتبہ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر ۔۔۔ چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

پاکیزگی نفس کی دشمن مے ہے ۔۔۔ انسان کو خراب کرنے والی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیوٹ سکریٹری ۔۔۔ مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج ۔۔۔ بس یہی ان کے لئے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت ۔۔۔ نازِ یورپ کو اسی کا آج ہے
لفظ تاجر خود ہے اے اکبر ثبوت ۔۔۔ دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے

تجھے انگلش سے جب موقع نہیں ہے گرم جوشی کا ۔۔۔ تو پھر کیا لطف ہے اے ہم نفس اس بادہ نوشی کا
تکلف سے جواب اس نے دیا بس کر کہ اے اکبر ۔۔۔ ادا کرتا ہوں میں یہ حق فقط پتلون پوشی کا

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس ۔۔۔ ہے ابتری معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا ۔۔۔ ہے اپنے ہی میل معصیت کا افسوس

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں ۔۔۔ پہنچائے گا قوت شجر ملک کے بُن میں
تحریک سودیسی پہ مجھے وجد ہے اکبر ۔۔۔ کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کے دھن میں

چو مسٹر نباشد ترا میزبان ۔۔۔ چہ پرہیز خوردن چہ بر روئے خوان
چو آہنگ رفتن کند جان پاک ٭ چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک (سعدی)

نیچریت چیست از دیں گم شدن ۔۔۔ نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناولہا ۔۔۔ کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا
بکن تزئیں پائے خود ز بوٹ ڈاسن و پتلون ۔۔۔ کہ سر سید خبردار ز رسم و راہ منزلہا

تہذیب مغربی کی بھی ہے وارنش غضب ۔۔۔ ہم کیا جناب شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے لاہم توہم

دست و پا بستہ ہوں میں ظاہر کوئی گن کیا کروں ۔۔۔ دوسروں کے بس میں ہوں فکرِ تمدن کیا کروں

روٹی ملے جو سکھ سے کافی ہے اللہ اللہ ۔۔۔ ظلمت کدہ ہے دنیا ہر شے کو کیوں ٹٹولو

نہ اس میں دخل منطق کو نہ دولت کو نہ طاقت کو ۔۔۔ دلی حالت خدا ہی کی عنایت سے سنبھلتی ہے

یہ معذرت تو ملاقاتیوں سے آپ کریں ۔۔۔ مجھے تو کام فقط آپ کے سلام سے ہے

سایۂ مغرب میں شوق دل نے پھیلائے تو پاؤں
چار ہی دن میں مگر پتلون ڈھیلی ہو گئی

پیٹ سے دل نے کہا درجہ ہمارا ہے بڑا
ساغر جمشید ہم ہیں تو ہے بٹنے کا گھڑا

پیٹ بولا اصطلاحیں تری سب منسوخ ہیں
ہم ہیں اب غربی گدام اور تو ہے غربی جھوپڑا

بے گزٹ ہو کے جو رہئے تو محلے میں حقیر
با گزٹ ہو کے جو چلئے تو فرشتوں میں خفیف

کیسے چکر میں بزرگوں کو پھنسا رکھا ہے
حضرت پیر فلک بھی ہیں عجب ذات شریف

نئی محفل کی نکٹائی تو گویا طوق گردن ہے
وہی بتخانہ اچھا تھا وہی زنار اچھی تھی

اکثر یہی ہے حالت قانون مغربی
آزادیوں کی قید میں روح ان کی ہے پھنسی

پکچر ہے اس طرف تو ادھر بہشتی بھی ہے
اس سمت ناچ ہے تو ادھر خود کشی بھی ہے

تعلیم عورتوں کو ضروری ہے لاکلام
لیکن جو یہ اثر ہے تو بس دور سے سلام

ہم کو کمال شوق سے تعلیم دیجئے
لیکن کچھ اپنے گھر کی بھی اصلاح کیجئے

ہم فائدہ اٹھائیں گے مغرب کے راج سے
لیکن پناہ مانگیں گے ایسے رواج سے

دھن دیس کی تھی جس میں گلتا تھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

قیمت کو ثمر سے بڑھ کر دیتے ہیں ٹھرے کے دام
بے حسی کا میکدہ ہے غفلتوں کا دور ہے

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے

سائے کے بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن
اس شوخ کے گھونگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

"آگرہ میں مقدمہ ہوا تھا۔ ایک میم نے اپنے شوہر کو زہر دیدیا۔ ایک صاحب نے اپنی میم کو قتل کیا"

حال مسز کلاک و مسٹر فلم کھلا
تھا کل بیان پیش عدالت کھلم کھلا

بہ تخفیف تشدید بہ ضرورت شعر

ان کو کرایا قتل اور ان کو پلایا زہر
تہذیب مغربی کی یہ تکمیل اور قہر

پردے پہ اعتراض ہو اور زہر ہو دوا
پالیگمی پہ طعن ہو اور یہ ستم روا

تعدد ازدواج۔ ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی شرعی اجازت۔

لاکھوں مقدمات ہوئے بعض کھل گئے
گند راز مانہ یار کے دامن سے دھل گئے

فتنے کا ہے قصور نہ مفتون کا قصور
سب کچھ ہے یہ خرابی قانون کا قصور

پردہ نہیں طلاق میں آسانیاں نہیں   جایز کہیں تعدد ازواج یاں نہیں
فطرت کا اقتضاء جو ہے وہ کس طرح رکے   پھر کیوں گناہ جرم کی جانب نہ دل جھکے
آسان ہو طلاق تو دل شاد کیجئے   بے قتل غیر اپنا گھر آباد کیجئے
پردہ جو ہو تو ایسے مواقع بھی کم ملیں   کیوں بزم مے میں شوخ نگاہیں بہم ملیں
قانون میں روا ہو اگر دوسرا نکاح   پھر کیوں یہ قتل زوجہ اولے کا ہو مباح

جایز شرعی طور پر۔

جب پردہ و طلاق و تعدد روا نہیں   پھر بدمعاشیوں کے سوا کچھ دوا نہیں
جانیں ہزار جاتی ہیں بچے بلکتے ہیں   مستان مے جگہ سے بھلا کب سرکتے ہیں
مغرب کا دل جو خواہر مشرق کے ساتھ ہے   یہ بھی گھروں میں ان کے لئے ملتی ہاتھ ہے

خواہر مشرق

بس ظاہری نمود چمک اور ادا میں ہے   دل کی خبر نہیں ہے کہ وہ کس ہوا میں ہے

محاورات

بے عشق کے جوانی کٹنی نہیں مناسب — کیونکر کہوں کہ اچھا ہے جیٹھ کا نہ تپنا

چودھویں منزل میں وہ ماہ خوش اقبال آگیا — صبر و تقوے پر جو بھاری ہے وہی سال آگیا

کر گئی کام نگاہ بت پر فن کیسا — تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

کہیں گے تعین ذات پر ہو نشاں دو یا یہ بتاؤ — بتوں کے آگے ہے سخت مشکل خدا کو اپنا گواہ کرنا

واعظا تیری زباں پہ ہے مذمت مے کی — یہ سخن تیرا گلوگیر ہوا اچھو کی طرح

یہ بھی قسمت رزق ٹوٹے جو دانت — غرض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

ہوتا ہے نفخ یوروپین نان پاؤ سے — میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے

مرا سوز دل آپ کیا دیکھتے ہیں — یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے

درگاہ جانے والے ہیں غیروں کے ساتھ وہ — گھی جل رہا ہے آج تو گھر گھر چراغ میں

رخصت ہو جو علم دیں تو پھر دین بھی جائے — گل ہو جو چراغ ابھی ہو پگڑی غائب

شراب دولت سے مست ہیں وہ مے قناعت سے ہم ہیں سرخوش
نہیں ہے کچھ باہمی تعلق وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش

دنیا کی حرص و آز کا واعظ شہید ہے — گو پیر ہو گیا ہے مگر زن مرید ہے

شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا — وہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا

کرو نہ تعمیر گھر کی اکبر حدود میونسپل کے اندر — یہ اہل کاران بد دیانت بنیں گے پھوڑا بغل کے اندر

شاید امپرومنٹ ٹرسٹ کی طرف اشارہ ہے۔

نہیں ان کو کچھ شرم لاحول قوم — یہ ملحد تو چکنے گھڑے ہو گئے

"پانی پڑا پسل گیا"

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے — زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

چندوں کے سوجتے ہیں ان کو مضمون — دل شاد ہو اس سے قوم یا ہو محزون

لڑکے انہیں دیکھ کر مچاتے ہیں دھوم — ہیں یہ نئی روشنی کے چندا ماموں

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو — اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو
اک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمھیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں
کہیں اس عہد میں دو دل نظر آتے نہیں ایک — اثر معنئے یک جان و دو قالب نہ رہا
کل جور چرخ مرے ہی حصّہ میں آپڑا — دنیا پڑی تھی پر وہ مجھی پر برس پڑا
محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب — "ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے پا بہ رکاب
بھروسا باغ ہستی میں نہیں کچھ نخل قامت کا — نفس کیا ہے ہوا کی بیل ہے دھوکے کی ٹٹی ہے
ظاہر ہوئی کمیٹی و کالج کی اک لکیر — آخر اسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر

مجبور بدل جانے پہ یہاں اقبال و حشم کے دور بھی ہیں
یکتائی کا دعوے خوب نہیں اللہ کے بندے اور بھی ہیں

خدا جانے مرا کیا وزن ہے ان کی نگاہوں میں — سنا ہے آدمی کو وہ نظر میں تول لیتے ہیں
سبا تھی ملے جب ایسے ناز کھنیا لیاں کیا — سینا ہے جب گزی کا سوئی مہین کیوں ہو

"جیسا دیس ویسا بھیس"، ٹاٹ پر موبخ کی بخیہ نہیں ہوتی۔

گو سائنس چل رہی ہے خول اب نہیں جھنڈہ — مشرق بدست مغرب مردہ بدست زندہ
جب غم ہوا چڑھالیں دو بوتلیں اکٹھی — ملّا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹی
وعدہ بوسہ ابرو کا نہ کر غیر سے ذکر — دل لگی میں کبھی تلوار بھی چل جاتی ہے
شیران شرق کا انھیں منظور ہے شکار — بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے
میں نے تو چل کے کہدیا اس سال جون میں — ٹٹی اگر نہیں تو خس کم جہاں پاک
نہیں ہے کچھ شکایت مندروں کی — کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے
جب اک بھائی تھے اس منصب پہ ممتاز — تو پھر کیوں آپ نے کی جست و پرواز

ووٹ بازی کے متعلق۔

لگے کہنے کہ رہنے دیجئے پند — مرا بس کیا مریداں می پرانند

پیران نمی پرند مریداں می پرانند۔

اس کا گھوڑا جس کی کاٹھی   بھینس اُسی کی جس کی لاٹھی
زور بٹھاوے تھانے تھانے   دنیا دیکھے دنیا مانے
تجھ کو تو ہے خالی چھپنا   اس سے اچھا ہر کو جپنا
بھیجی جو تم نے مجھ کو لیچی   شربت کی نظر ہے اس سے نیچی
منہ میں رکھ کر جو میں نے چوسا   بولی یہ زبان کہ واہ موسیٰ

موسیٰ ۔ محمد موسیٰ صاحب برادر خورد مولوی احمد علی صاحب ۔ ایم ۔ اے ۔

موسا ۔ موس لیا ۔ دھوکا دے کر سارا مزا اُڑالے گئے ۔

عدو کے شکست سے بچتے نہیں ہیں   یہ کالے ہیں مگر کوّے نہیں ہیں

ہندوستانی کالے تو ہیں مگر کوّے کی طرح سیانے نہیں ہیں ۔

مادہ پرستی

منکر ہیں روح کے جو یہ اہل غرور — اک امر ہے پوچھنا ہمیں ان سے ضرور
ہے فہم و خرد کا تم کو دعوےٰ یہ کہو — پیدا ہوا مادے میں کیوں کر یہ شعور

رکھو جو مقابل اس کے سارا عالم — دنیا بخدا ہے ایک ذرے سے بھی کم
اس اک ذرے میں ہے ہماری کیا اصل — نافہم ہیں کر رہے ہیں ناحق ہم ہم

مخلوط کرو نہ نفس و نیچر کو بہم — گو فہم نے بھی لیا ہے نیچر سے جنم
جو بھوک لگے زبان کو وہ ٹھیک نہیں — نافع وہ طعام ہے کہ طالب ہو شکم

اللہ کا صدق دل سے جو طالب ہو — حیرت نہیں گر ملک کا ہم قالب ہو
ہرگز نہ بڑھیں گے اس سے نیچر کے مرید — ممکن نہیں جسم روح پر غالب ہو

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

کھینچے، چلائے، کودے، اچھلے، ٹھیلے — ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے
حالت تو یہی ہے بلکہ اس سے بدتر — یوں منہ سے جو جس کے دل میں آئے کہہ لے

ہوائے ایجاد رنگ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے — جو بات بگڑی نہ وہ کیونکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے
جو قوم ہمسایہ ہے نمازی نہیں ہے اس پر بلا یہ طاری — ہم اپنی مستی میں گر رہے ہیں وہ ہوش میں ہے سنبھل رہی ہے
ہم اپنی صورت بگاڑتے ہیں بنا رہی ہے وہ اپنے گھر کو — ہم اپنا نقشہ مٹا رہے ہیں وہ اپنے سانچے میں ڈھل رہی ہے

زبان اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے راز سوز حسرت
وہ شمع اس کو بیاں کرے گی جو قبر سید پہ جل رہی ہے

وہ ہنس کے بولے جگہ کہاں ہے دکھاؤں کاریگری جو اپنی — کہا تھا منکر سے میں نے اک دن بنا تو لے آسمان اپنا

اب مادہ کے چھاننے والے ہی رہ گئے — روحانیات کا وہ اکھاڑا نکل گیا

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی — موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

شارح دیوان ہستی ہے قیاس مغربی — ہے ازل بھی تجربوں کے زیر فرماں ان دنوں

نہ رازِ آسماں جانا نہ کچھ حالِ زمیں جانا
رہیں بحثیں بہت اور درحقیقت کچھ نہیں جانا

ذروں کو ملا کر ذروں سے صناعی کی عزت پاتے ہو تم
کس درجہ کا حق حاصل ہے انھیں جو دل کو ملاتے ہیں دل سے

ڈارون صاحب یہ اچھا مسئلہ سمجھا گئے
دعوےٰ مخدومیت میں مستا ہر لنگور ہے

یعنی انسان بندر تھا بتدریج فیضِ ارتقاء سے انسان ہوگیا۔

کبھی سائنس کے ان کے دیوتاؤں سے ذرا پوچھو
یہ مشتِ خاک کیونکر جان کے سانچے میں ڈھلتی ہے

وہی بیخ شجر تحریک موسم بھی وہی لیکن
کوئی ڈالی تو رہ جاتی ہے کوئی شاخ پھلتی ہے

بھلا سائنس کیا سمجھے نزاکت شوقِ عاشق کی
کہاں فوٹو سے وہ نکلا جو میرے دل میں ارماں تھا

نعت

وہ تو موسےٰ ہوا جو طالب دیدار ہوا
پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمہیں دیکھا ہوگا

نظر کر اُن کی طرف ادب سے تو پھر دین تیرے دل کو سب سے
عجب نہیں عاشقان رب سے ظہور کار عجیب ہونا

چمن قراں ہے ہر لفظ اس کا ہے گل
نہاں ہر گل میں ہے بوئے محمد

محمدؐ پھول ہیں واعظ صبا ہیں
کہ پھیلاتے رہیں بوئے محمدؐ

ہوئی زائل جہاں سے ظلمت و کفر
پڑا جب پر تو روئے محمدؐ

"کشف الدجیٰ بجمالہ" کا ترجمہ ہے۔

ہوا ہے باعث ایجاد عالم حسن یہ کس کا
یہ کس کے دیکھنے کو مجمع اہل نظر آیا

"لولاک لما خلقت الافلاک" کی دوسری تصویر ہے۔

نزع میں نام لیا قبر میں مذکور آیا
کون سی جا تھی جہاں وہ نہ مجھے یاد رہے

یہ جلوہ حق سبحان اللہ یہ نور ہدایت کیا کہنا
جبریل بھی ہیں شیدا اُنکے یہ شان نبوت کیا کہنا

وہ کفر کی ظلمت دور ہوئی اور محفل دین پر نور ہوئی
یہ مہر ہدیٰ سبحان اللہ یہ صبح سعادت کیا کہنا

جس دل میں ہو پر تو کرسی و عرش اس دل کی بلندی صلِ علےٰ
جس سینے میں قرآن اُترا ہو اس سینے کی عظمت کیا کہنا

تسبیح سے دنیا گونج اُٹھی تکبیر کا غل تا عرش گیا
تاثیر ہدایت صل علےٰ یہ جوش عبادت کیا کہنا

حضرت کی نبوت میں ہو کس طرح مجھے شک
ہر ذرہ کو ہے ورد رفعنا لک ذکرک

تھی شان جلالی کہ عدو رک گئے آخر
وہ نور تھا عالی کہ صنم جھک گئے آخر

احباب نے طویل مضامیں وہاں پڑھے
لیکن مری زبان کا تھا قصہ مختصر

میں نے تو بزم نعت میں اتنا ہی پڑھ دیا
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

وجد میں لائے گا یہ مضموں اہل ذوق کو
دھوم تھی روز ازل اس سید ذی جاہ کی

جب رکے آثار فطرت کہہ کے حرف لا الٰہ
نور احمد سے اُٹھی آواز الا اللہ کی

فکر رسول پاک ہے فخر زبان انس و جن
روح کو اس سے ہے سرور قلب ہے اس سے مطمئن

ولولہ دل جواں قوت خاطر مسن
سنئے اگر بگوش ہوش ورد ملک ہے رات دن

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

صلوٰات ہو محمدؐ پر صلوٰات ہو محمدؐ پر

خضرِ رکوع ہے یہی شوق سجود اسی سے ہے ۔ حالت ذوق و وجد کا دل میں درود اسی سے ہے
دین خدائے پاک کی شان نمود اسی سے ہے ۔ منبعِ[2] خیر ہے یہی ہمت جود[3] اسی سے ہے

یعنی یہی کلمہ عبادت خدا کے لئے بندہ کا رہبر ہے ۲ منبع = سرچشمہ ۳ جود = بخشش۔ سخاوت۔

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر ۔ ہے یہ وہ نام خار[1] کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض[2] کو کر دے سما[3] ابھار کر ۔ اکبر اسی کا ورد تو شوق سے بے شمار کر

۱ خار ۔ کانٹا ۲ ارض = زمین۔ ۳ سما ۔ آسمان

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

شافع عاصیاں[1] ہیں وہ تائبوں کے کفیل ہیں ۔ فیض رسان خلق ہیں حامی بے عدیل ہیں
شکل میں وہ جمیل ہیں شان میں وہ خلیل[2] ہیں ۔ منظر نور حق ہیں وہ مہبط جبرئیل ہیں

۱ گنہگاروں کے بخشوانے والے ۲ حضرت ابراہیم خلیل اللہ۔

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

سینہ بیت ہیں ان سے شق کفر کے دل میں تیر ہیں ۔ حکم خدا کے ہیں مطیع دین کے دستگیر ہیں
راحت جان و روح ہیں روشنی ضمیر ہیں ۔ خلق ہے ان سے مستفید[1] ہادی بے نظیر ہیں

۱ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

حالت ملک و قوم پر ہوں شب و روز بے قرار ۔ دین سے دل کو پھیر دیں ایسے سبب ہیں بے شمار
مرکز طبع کیا بنے جس سے ہو کم یہ انتشار ۔ آئی صدا فلک سے یہ پڑھ تو اسی کو بار بار

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

رہنے دے آسمان اگر تجھ سے ہے بر سر جفا ۔ ہو نہ ملول تجھ سے ہے دولت و جاہ اگر خفا
مسلک مستند ہے یہ چھوڑ نہ تو رہ صفا ۔ نسخہ حظ دیں یہ ہے ہے یہی ٹھیک فلسفا

صلِّ علےٰ محمدؐ صلِّ علےٰ محمدؐ

مدیح سرورِ کونین میں خامہ اُٹھاتا ہوں خیال کفر کی ظلمت پہ اک بجلی گراتا ہوں
شب اوہام ہے شمع یقیں محفل میں لاتا ہوں چراغ طور ایمن کوہ معنی پر جلاتا ہون
الٰہی شوخی برق تجلی دہ زبانم را
قبول خاطر موسےٰ نگاہان کن بیانم را

ثنا۔ توصیف

محمدؐ پیشوا اور رہنمائے خلق و عالم ہیں معزّز ہیں مقدّس ہیں مکرّم ہیں معظّم ہیں
فروغ منزلِ ہستی ہیں نور عرش اعظم ہیں حبیب حق ہیں ممدوح ملک ہیں فخر آدم ہیں
انھیں کے رنگ سے رنگ گل ہستی کی زینت ہے
انھیں کی بُو سے عطر آگیں بنی آدم کی طینت ہے
انھیں کے دل کو آگاہی ہوئی تھی راز فطرت پر انھیں کی طبع کو وجد آگیا تھا ساز فطرت پر
وہی چشم خدا بیں محو تھی آواز فطرت پر انھیں کا ناز غالب آگیا تھا ناز فطرت پر
وقائع ان کے عزم و فکر کے سانچے میں ڈھلتے تھے
ذرائع غیب سے تکمیل مقصد کو نکلتے تھے
وہ نظریں ساقی میخانۂ یزداں پرستی تھیں وہ آنکھیں مظہر انوار راز بت پرستی تھیں
انھیں پر بدلیاں خالق کے رحمت کی برستی تھیں اسی محفل کی بحثیں خلد کے پھولوں سے بستی تھیں
اسی سرکار نے رتبہ بڑھایا طبع انساں کا
اسی دربار نے خلعت پنھایا نور ایماں کا
نہ سمجھا پھر ہر اک نے آب و سنگ و نار کو حاکم طبائع ہو گئے تحقیق موجودات کے عازم
جو تھے صناع تاثیر عناصر کے ہوئے عالم پرستاران عنصر نے عناصر کو کیا خادم
ہوئی توحید پالا جڑ کٹی عنصر پرستی کی
پڑی بنیاد اسی ارشاد سے علمی ترقی کی
غلط سمجھا گیا دعوےٰ بتوں کی فاعلیت کا یقین پیدا ہوا حکم خدا کی کاملیت کا
بڑھا نور بصر گذرا زمانہ جاہلیت کا بجا ڈنکا زمانے میں بشر کی قابلیت کا

معانی ان کے روشن تھے اندھیرے میں اُجالے میں — سما جاتا تھا خوف ان سے تعرض کرنے والے میں
وہ یوں اصحاب میں تھے جس طرح ہو چاند ہالے میں — مصنف سیل[1] کو لکھنا پڑا اپنے رسالے میں

اشارہ عقل کی جانب کلام حق میں واضح ہے
یہی قرآن در گنجینۂ فطرت کا فاتح ہے

قدم ان کے لئے تھے بہر حل مشکل مسائل میں[2] ہدایت اُن سے حاصل کی جہاں میں طبع مائل نے
جوابوں میں تشفی پائی ان سے طبع سائل نے — نہایت ہی فصاحت سے ہے لکھا کارلائل[3] نے

جو طاقت رات کو دن اور دن کو رات کرتی تھی
وہ طاقت یعنی یہ فطرت خود اپنے بات کرتی تھی

معاشر دیکھ کر شان ان کی ان کو شاہ کہتا تھا — مسافر راہ پا کر ان کو خضر راہ کہتا تھا
مخاطب معترف[4] ہوتا تھا حق آگاہ کہتا تھا — مخالف کو حسد تھا پھر بھی دل میں واہ کہتا تھا

دل کافر میں بھی قدر ان کی تھی ان کا ادب کچھ تھا
زہے شان نبوت کچھ نہیں تھا اور سب کچھ تھا

جواہر خانہ اس چشم کرم سے سینہ بنتا تھا — حقائق کا خرد کا علم کا گنجینہ بنتا تھا
لطافت سے صفا سے نور سے آئینہ بنتا تھا — علو[5]ئے فکر سے عرش بریں کا زینہ بنتا تھا

مریدان کے نہ تھے مشتاق دنیا کی تگ و دو کے — قدم افلاک پر پڑتے تھے اس ہادی کے پیرو کے
قلوب ان کے نظر کے رعب ہوش افزا سے ملتے تھے — چمن ان کے سخن کے فیض بے ہمتا سے کھلتے تھے
ہجوم خلق تھا راہ طلب میں شانے چھلتے تھے — بشر کی کیا حقیقت ہے فرشتے جھک کے ملتے تھے
فلک تھا دم بخود[6] باد مصیبت چل نہ سکتی تھی — خدا کی بات تھی ٹالے کسی کے ٹل نہ سکتی تھی

[1] Sale ایک انگریزی مصنف ہے [2] ان کے لئے راستہ کرتے تھے [3] Carloyle ایک زبردست انگریزی مصنف اٹھارھویں صدی میں گذرا ہے [4] اقرار کرنے والا [5] بلندی خیال [6] چپ چاپ۔

نصائح

اعلیٰ مقصود چاہیئے پیش نظر
کوشش تری گو ہو لطف ذاتی کے لئے

فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا
شیریں کے لئے کہ ناشپاتی کے لئے

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے

گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کو غرور ہے

خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں
کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے

اکبر بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے

البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار
مائل ہے نیکیوں پہ برائی سے دور ہے

سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کے پند کو
وقت کلام لب پہ جناب و حضور ہے

برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اس میں نہ ہے فریب نہ کچھ مکر و زور ہے

افکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے معین ہے اہل شعور ہے

راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے باادب ہے عقیل و غیور ہے

رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
نیکوں کا دوست صحبت بد سے نفور ہے

لیکن جو ان صفات کا مطلق نہیں پتا
اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت رکھ دیں

بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

ذات واحد میں عناصر ثلاثہ کے قائل ہیں یعنی خدا بہ حیثیت باپ کے خدا بہ حیثیت بیٹے یا مسیح کے خدا بہ حیثیت خالق و رب کے۔

وقت ہی پر ہر ایک کام اچھا
آسماں کا پروگرام اچھا

قرب ہے جن کو تخت شاہی کا
دور ہی سے انہیں سلام اچھا

لائحہ عمل، سردی، گرمی، روز، شب، بارش کے اسباب کے اوقات مقرر ہیں۔ مقربین سے زیادہ ربط ضبط خطرات سے خالی نہیں

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو　　　جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو

بس ایک سخن بندہ عاجز کا رہے یاد　　　اللہ کو اور اپنی حقیقت نہ بھولو

مخلوق الٰہی میں ۔ عمل پر جو نظر کر　　　انسان سے بدتر ہے نہ انسان سے بہتر

یہ ہے کہ جھکاتا ہے مخالف کی بھی گردن　　　سن لو کہ کوئی شے نہیں احسان سے بہتر

بنو گے خسرو اقلیم دل شیریں زباں ہو کر　　　جہانگیری کرے گی یہ ادا نورجہاں ہو کر

نور جہاں بیگم کے لئے مشہور ہے کہ حقیقتاً پس پردہ سے وہ ساری حکومت کرتی تھی جہانگیر برائے نام بادشاہ تھا

جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں　　　یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر

بدی طینت کی چھپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے　　　دل اچھا ہو تو بجھ جاتی ہے شاید بد زباں ہو کر

زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی　　　خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانکا آسماں ہو کر

اللہ کی جانب متوجہ رہیں احباب　　　صف ہو گی شکستہ جو کہیں رخ نہ رہا ایک

نماز جماعت مین ایک بھی قبلہ سے پھر جاے تو ساری جماعت ٹوٹ جاتی ہے

میں نے کہا کیوں لاش پہ آقا کی ہے مرتا　　　ہوٹل کی طرف جا کہ غذا بھی ہے کوئی چیز

کتے نے کہا ہو یہ جہالت کہ تعصب　　　لیکن مرے نزدیک وفا بھی ہے کوئی چیز

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ　　　آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

دنیا کے انتظام پر اکبر نہ ہو ملول　　　انصاف یہ نہیں ہے کہ پا جاو سب تمھیں

طالب خدا کی راہ میں سر رکھے مثل ماہ　　　نور جبیں کہاں ہے جو داغ جبیں نہیں

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار　　　اُٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی　　　اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو

لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ　　　موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اے جدّ بزرگ کے نواسو پوتو　　　تزئین کو تہ کرو زمینیں جوتو

کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت　　　اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو

شہوات کی پیروی کا منصوبہ نہو　　　دولت تری خادمہ ہو محبوبہ نہو

شہرت جو کمال سے ہو پیدا ہو جاے　　　لیکن یہ تکلفات مطلوبہ نہو

لطف چاہو اک بت نوخیز کو راضی کرو — نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
لیڈری چاہو تو لفظ قوم ہے مہماں نواز — گپ تو بسوں کو اور اہل میز کو راضی کرو
طاعت و امن و سکوں کا دل کو لیکن ہو جو شوق — صبر پر طبع ہوس انگیز کو راضی کرو

یہ منزل حرص و مال و دولت نہ دے گی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا
نگاہیں ہوں تو ویرانے میں بھی آبادیاں دیکھیں
اگر دل ہو تو ہر پہلو سے کر لے دل لگی پیدا

آسمان کی چھت بہت نیچی سر نخوت کو ہے — کبر سے کہہ دو کہ دنیا میں ابھرنا دیکھ کر
قصد تو جائز ہے لیکن اپنا قابو دیکھ کر — ہاتھ اٹھانا چاہیئے انساں کو بازو دیکھ کر

"چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے"

اکبر اس جلوہ خاموش کو بے حس نہ سمجھ — ہاں بصیرت سے تہی دیدہ نرگس نہ سمجھ
راحت زیست کے سامان کے دھوکے میں نہ آ — امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ — خاتمہ جس کا ہو افسوس اُسے اَقس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسن عمل — پھر انجام یہ امرت ہے اسے بِس[۲] نہ سمجھ
اسٹیشن فنا کی بھی کیا خوب ریل ہے — اس راہ میں ہر ایک پسنجر[۳] کا میل[۴] ہے
غفلت نے کر دیا جنھیں آزاد وہ ہنسیں — میری نگاہ میں تو یہ دنیا ہی جیل ہے
چھیڑنا اچھا ہے ساز سعی کا اس بزم میں — آدمی کو زندگی میں اک نہ اک دھن چاہیئے
ہو وسمبر میں مبارک یہ اُچھل کود آپ کو — خون مجھ میں بھی ہے لیکن مجھ کو بھاگن چاہیئے
مذہب دبا ہوا نہ ہو فکر معاش سے — اندازہ ترقی ملت اسی میں ہے
گھر میں احساس ضرورت ہو تو بازار کو جا — کر نہ بازار میں تو جا کے ضرورت پیدا
اک روز بھی تارک تگ و دو نہ ہوئے — فارغ از بحث گندم و جو نہ ہوئے
جمعیت دل کہاں حریصوں کو نصیب — ننانوے ہی رہے کبھی سو نہ ہوئے

۱؎ خودرو ۲؎ زہر ۳؎ گاڑی = Passenger مسافر۔ رستہ چلنے والے ۴؎ ڈاک گاڑی = Mail ۵؎

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا　　غم نہ کھا روٹی تو گیہوں کی رہی

جنگ کے بعد کچھ دنوں کے لئے کرنسی سے ایک روپیہ کے نوٹ چلے تھے۔

زیادہ بے لطفی ہو چلی تھی اس وقت یہ اشعار معارف نے چھاپے ورنہ نصیحت اور امر بالمعروف ہمیشہ چاہئے۔

اس وقت مولویت صوفی سے بڑھ گئی ہے　　اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
مُلا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم　　صوفی کو ضد یہ دارم یارے چرا نجویم
مُلا یہ کہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو　　صوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو
مُلا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی　　صوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی
مُلا یہ کہ رہے ہیں قرآن ہی سے بڑھئے　　صوفی یہ کہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے
اس جنگ میں ہے بیشک نادانی سیاسی　　یہ بات ہے یقینی ہرگز نہیں قیاسی
گو قید ظاہری کی پاتے ہیں ان میں قلت　　وہ بھی جماعتیں ہیں وہ بھی ہیں نظم ملت
دینی طریق میں تو ہر سمت اب کمی ہے　　مجلس میں ہے تزلزل میلوں میں برہمی ہے
کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن　　دیکھا نہیں تھا لیکن مُردوں پر اپریشن

Reformation = اصلاح۔　　Operation = عمل جراحی۔

بازو قوی جو رکھتے ہوتی اگر حکومت　　اس وقت شاید آتی کچھ کام یہ خصومت
تنگی رزق نے تو چرخے دئے ہیں کتوا　　کیسی دلیل شرعی کیسا خرد کا فتوے!
ہوتا رہے گا نشتر پہلے چلائیے تو　　جان حزیں کو ان کے تن سے ملائیے تو
ہے ہاتھ میں قلم بھی منہ میں زباں بھی ہے　　لیکن یہ دیکھئے تو حضرت میں جان بھی ہے
وضع کہن کا مٹنا اس کی یہ رت نہیں ہے　　تیشے سے توڑ دو تم ایسا یہ بت نہیں ہے
اس وقت کیا تمھاری یہ خوش خیالیاں ہیں　　آپس میں گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
بہتر ہے کام لینا نغمات موعظت سے　　روکو گلے کو لیکن ایسی چلت پھرت سے
شیعہ ہوں خواہ سنی ملا ہوں خواہ صوفی　　بے سود جنگ باہم ہے سخت بیوقوفی

باتیں نئی کہاں سے لاکر کوئی کہے گا　　تم بھی وہی رہوگے وہ بھی وہی رہے گا
دیکھو ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے　　موقوف کب یہ حالت آپس کی شور پر ہے
وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو
اللہ کو پکارو　اللہ کو پکارو

مکالمت

پھرتے ہیں تذکرہ کالج و اسکول کے ساتھ   خیر مقدم ہے ہمارا ڈنر اور پھول کے ساتھ
معترض گو نہیں دینے کے کبھی بھول کے ساتھ   مستقل چال میں ہم اپنی ہیں معمول کے ساتھ

اعزازی دعوتیں اور ہار گجرے، جو پہنائے جاتے ہیں۔

عمر گذری ہے اسی بزم کی طراری میں
دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں + پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں (انیس)

کوئی خاص بات نہیں غالباً جسٹس محمود ابن سرسید کی طرف اشارہ ہے۔

پرانی روشنی کا جواب

بے ضرورت نظر آتا ہے تعلی کا یہ فیر   معترض کون ہے جب آپ کی نیت ہو بخیر
اب تو سب آپ کے اپنے ہی ہیں کم رہ گئے غیر   نہ حرم آپ کو بیگانہ سمجھتا ہے نہ دیر

آپ کو لطف گورنمنٹ سلامت رکھے
مستفید اس سے ہمیں تا بہ قیامت رکھے

غربا بھی ہیں مگر قوم کے اجزا اکثر   غربا ہی سے تعلق میں ہے ان کو تو مفر
دور ہے ان سے خود آرائی مغرب کا اثر   بحث ان کی بھی اسی بات پہ ہے ختم مگر

آپ کا دل رہ مغرب کا اگر سالک ہے
کیجئے چین غریبوں کا خدا حافظ ہے

آپ بنگلوں میں ہیں مسرور تو پھر ہم کو کیا   آپ مسجد سے ہوئے دور تو پھر ہم کو کیا
آپ مسند پہ ہیں مغرور تو پھر ہم کو کیا   جاہ ہے آپ کو منظور تو پھر ہم کو کیا

ہمیں ابھریں گے کبھی گو ابھی پستی میں ہیں
آپ دھبوں کی طرح دامن ہستی میں ہیں

نئی روشنی

کرلی ہے میں نے خوب نئی روشنی کی جانچ — مجھ سے بحث نہ کیجئے اب آپ تین پانچ
ان لیڈروں کی شعلہ زبانی سے کیا ہوا — ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب پہ آئی آنچ

نئی اور پرانی روشنی کا موازنہ

نئی روشنی	پرانی روشنی
پاس کالج کے جو ہیں ووٹ طلب کرتے ہیں	پاس مسجد کے جو ہیں طاعت رب کرتے ہیں
عشوہ ہائے عجمی کے وہ ہوئے ہیں کشتہ	یہ رخ سادگی طرز عرب کرتے ہیں
ان کو ہے لمنڈو وسکی کی ضرورت اور یہ	رفع پانی سے فقط خشکی لب کرتے ہیں
پھیلتے وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ	یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظ نسب کرتے ہیں
وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں	وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

لباس و اتحاد و دین و غیرت ایک لقمے ہیں — نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یارب کہ مٹکا ہے

شام

ادوار کے متعلق "صبح" میں اور نثر کے متعلق دوپہر میں بحث کی جا چکی ہے اس کے بعد فاضل مؤلف نے کچھ سرخیاں دی ہیں اور ان کے ماتحت اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ دعوے بے دلیل قبول خرد نہیں کے اثر سے کون ناواقف ہے۔ شواہد کے عدم اور حوالہ جات کے فقدان سے عبارت کا اثر صحیح طور پر نہیں ہوتا۔ پھر بھی فاضل مؤلف نے عنوان نہایت اچھے قائم کئے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اُن سے کافی طور پر بحث کر کے داد سخن نہیں دے سکے۔ عبدالماجد صاحب کا مضمون ان کی کتاب سے بہت پہلے کا ہے اور پڑھنے والے کو حیرت ہو جاتی ہے کہ دو مختلف راہ چلنے والوں میں کس حد تک توارد ہو سکتا ہے۔

A History of Urdu literature P. 230.

ان کی غزلیں = اس عنوان کے تحت میں فاضل مؤلف نے دکھایا ہے کہ اکبر کی ہمہ گیر طبیعت کا ایک جزو ان کی غزلیں بھی ہیں جس میں بے ثباتی دنیا اور انسانی مقدرت کے فنا ہونے کے مرقعے دکھائے گئے ہیں جو محاورات صفائی بیان وخیال، اختراعات، سوز و گداز، پرواز خیال وشوار بحور اور نادر تشبیہات سے بھری ہوئی ہیں دنیا کے تلخ تجربات، سوز و غم اور حسرت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں مگر اکبر کی شہرت کا دار و مدار صرف ان کی غزلوں پر نہیں ہے۔

اکبر کی ذکاوت وظرافت = اکبر کے شہرت کے ذمہ دار وہ مطلا اور بیش بہا اشعار ہیں جن میں ذکاوت ظرافت اور طعن وطنز کا عنصر غالب ہے۔ اکبر کا معیار ظرافت بلند ہے جس کی وجہ سے ان کے تتبع میں شعر کہنے والوں کو بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان میں خداداد ظریف کی ظرافت اور کہنہ مشق شاعر کے کمال ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ اکبر کی ظرافت خود مقصود نہ تھی بلکہ ذریعہ مقصود تھی۔ عمر بڑھتی گئی اور خالص ظرافت گھٹتی گئی۔

ذکاوت وظرافت کے اجزاے ترکیبی :۔ نادر اور تازہ تشبیہات عام مشاہدات سے منتخب کر لی جاتی ہیں ان میں آورد نہیں ہوتی بلکہ ماحول کی مناسبت سے ان کا انتخاب ہوتا ہے اور ان میں نئے معنی پہنادیئے جاتے ہیں۔ نئے اور عجیب وغریب قافیے اور ذو قافیتین ہندی

انگریزی اور اردو سے لئے جاتے ہیں۔ پُرانے الفاظ کو ایسے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جن کا خواب و خیال بھی نہ رہا ہو اس کے اثر کا کیا پوچھنا۔ عامیانہ اور بازاری الفاظ (جو مملکت سخن میں اب تک بے عزت تھے) ان میں نیا جادو نیا حسن نیا مفہوم پیدا کر کے صرف کلام کئے جاتے ہیں نئے مصطلحات اور اشارات مثلاً کلو سلو، جمن بدھو وغیرہ نہایت شافی و عمدگی سے مختلف اشعار میں برتے گئے ہیں۔ معمولی الفاظ مثلاً فالتو یا گٹ پٹ نہایت قابل تعریف اور موزوں انداز سے لائے گئے ہیں جنھوں نے تصویر شعر میں

(فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں   خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو)

اور بھی رنگ آمیزیاں کر دی ہیں۔ سوقیانہ محاورات بھی جو غیر مستعمل ہیں رشتۂ نظم میں منسلک کئے گئے ہیں۔ ذو معنی اور مفاہیم مختلفہ کے الفاظ بھی لائے گئے ہیں۔ اُردو ہندی یا انگریزی کے الفاظ میں حسن ایہام و تناسب سے کام لیا گیا ہے۔ الفاظ میں وضع و تراش کی بدولت نئے معنی اور نئے حسن پیدا کر لئے جاتے ہیں۔ حسن و خوبی الفاظ میں حلول ہیں۔

اکبر کی ظرافت اور اس کا میدان۔ اکبر کی ظرافت محض خوش طبعی نہیں ہے بلکہ حسن معنی کے لحاظ سے نازک اور متانت آمیز ہے ان کے ذریعہ کسی نہ کسی مذہبی، علمی، مدنی، اخلاقی، سیاسی یا روحانی حقیقت کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ ظرافت کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں شخصیت اور مرتبت کی کوئی منزلت نہیں۔ حالات حاضرہ اور سیاسیات اس کے مخصوص مباحث ہیں۔ "تہذیب مغربی اور ہندوستان میں اس کی ترقی" شاعر کے طعن و طنز کے لئے بے شمار موضوع مہیا کرتی ہے۔ نشانۂ ظرافت امیر و غریب، عالم و جاہل انگریز ہندوستانی ترک۔ ہندو مسلمان سنی شیعہ سب ہیں۔

اکبر کی خاص اصطلاحیں۔ مس۔ شیخ۔ سید صاحب، اونٹ، گائے، کلیسا۔ مسجد، دیر، بت، کالج۔ برہمن، لالہ اور ایسے بہت سے لفظ ان کی مصطلحات میں خاص مفاہیم کے حامل ہیں۔ مس۔ تہذیب مغربی کی دلکشی و نظر فریبی کا مجسمہ ہے۔ شیخ ظاہر پرست مسلمان ہے جو لفظ پر مرتا ہے اور معنی سے بے خبر ہے۔ سید صاحب یا تو خود سر سید پر طعن ہے جن کے دل و دماغ پر تہذیب مغربی اور تعلیم مغربی چھائی ہوئی تھی، یا حامیان علیگڈھ کی طرف اشارہ ہے۔

اونٹ ہم کو عرب کے ان سنین ماضیہ کی سیر کراتا ہے جو مسلموں کے شاندار زمانۂ گذشتہ سے متعلق ہیں ہندو سے ہند و مسلم اتحاد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

سیاسی شاعری دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے ایک تو وہ ہے جس میں محض شاعرانہ سبک مزاجی پائی جاتی ہے جس کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جن میں حقایق سیاست مضمر ہیں اور جس میں اُن کے خشم و عقیدت و حقارت کی جھلک نظر آتی ہے۔

اکبر کے نزدیک سیاسی حقوق دانۂ دام بلاہیں جن سے ہندوستانیوں کی روحانیت کا شکار کیا جاتا ہے یا حلقۂ سلاسل ہیں جن سے غلامی کی زنجیر مضبوط کی جاتی ہے۔ گورنمنٹ اسکول محض کلرکوں کی خانہ پری اور غلامی کی بقاء کی مشینیں ہیں۔ اکبر کسی مفہوم میں سیاسی نہ تھے انھوں نے کبھی اس مضمون کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے گورنمنٹ کی بہت سی خدمات اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں معقول طور پر مختلف حیثیات میں انجام دی تھیں۔ پنشن پاتے تھے اور خان بہادر تھے۔ اکبر کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی خلاف صرف اس لئے کہتے تھے کہ بہ حیثیت شاعر کے انھیں مشاہدۂ حالات میں لطف آتا تھا اور وہ ظرافت کی خاک سے شعر کی اکسیر بناتے تھے۔ ان کی آراء میں بہت سے باہمی اختلافات ہیں اکبر فطرتاً محتاط تھے اور ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے تھے جس سے انھیں کچھ نقصان پہنچ جائے۔ ان کے اشعار میں اس سے کہیں زیادہ ہے جو نگاہ اوّل میں معلوم ہوتا ہے۔ گورنمنٹ نے جنگ عظیم اور بلوۂ مسجد کانپور کے زمانے میں اکبر کو اپنے کلام اور اشاعت کلام کے متعلق ہوشیار رہنے کی فہمایش کی تھی۔ ان کے اشعار میں بڑا اثر تھا اور وہ عام و خاص کے زبان زد تھے اُردو اور ہندی کے قیود ان کے کلام نے بالکل اُڑا دیئے تھے۔ فارسی اُردو اور خالص ہندی پڑھنے والے دونوں اس سے لطف اُٹھاتے تھے۔ سیاسی بلاؤں کی دوا ان کے نزدیک طاعت معبود اور اعتقاد آخرت میں مضمر تھی۔

سوسائٹی اور طعن۔ اکبر ایسے وقت میں پیدا ہوئے تھے جب ہندوستان میں ایک نئی روح دوڑتی پھر رہی تھی۔ تہذیب مغربی اپنی مجموعی رنگینیوں کے ساتھ چشم و دماغ پر اثر کر رہی تھی۔ ہندی بالکل یورپ کے رنگ میں رنگتے جارہے تھے۔ ہر ہندوستانی چیز سے نفرت

ہوتی جاتی تھی۔ انگریزی نام، لباس، کھانے اور انگریزی طرزِ زندگی کی تقلید کی جا رہی تھی۔ آخر قوم کے دور بینوں نے ادھر توجہ کی بنگال میں بنکم چندر چٹرجی اور ممالک متحدہ میں اکبر نے اصلاحِ معاشرت کرنی شروع کی۔

اکبر نے مجموعی تقلید، اور تعلیم روحانیات کے عدم شمول کی سخت مخالفت کی، عورتوں کی اچانک آزادی کے خطرات سے آگاہ کیا ان کے نزدیک مشرقی و مغربی تہذیب میں قطب شمالی و جنوبی سے کم فرق نہ تھا۔ انقلاب کی بہت موثر تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ صوفی محض ایمان فروش رہ گئے ہیں۔ مادیات کی گرم بازاری ہے۔ وہ تعلیم نسوں کے قطعی مخالف نہیں ہیں بلکہ اس کو صحیح طریقوں پر چاہتے ہیں۔

مذہبی اعتقادات۔ وہ وحدت وجود اور اثر دعا کے قائل تھے۔ مذہب ان کے نزدیک ایک زندہ چیز ہے اور ایسی ہے کہ اس کے لئے انسان زندہ رہے۔ محبت جوہر مذہب ہے۔ وہ ملا کے تعصب کو بہت حقارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ تنگ خیالی اور تنگ نظری کے بیحد مخالف ہیں چاہتے ہیں کہ فطرت پر سائنس کی کامیابیوں سے جو تر نگ حاصل ہوتی ہے اس میں یاد رہے کہ "خدا بھی ہے کوئی چیز"

اکبر معلم۔ فلسفی اور صوفی کی حیثیت سے:۔ مذہب کی ظاہری چیزیں (یعنی رسوم و اعتقادات فاسدہ وغیرہ) ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتیں اصلی ضرورت اس کی ہے کہ روح کی تہذیب کی جاے اور حواس پر پورا اختیار حاصل کیا جائے۔ اس کی حاجت نہیں کہ عیسائی بندروں کی طرح انگریزوں کی نقل کرنے لگے۔ رسوم اور رواج ڈھکوسلے ہیں۔ غصہ اور تعصب نہ چاہئے۔ اکبر کی آخری شاعری میں بہت سے اعلی درجہ کے فلسفیانہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ اکبر اپنی آخری عمر میں زبردست صوفی ہوگئے۔ جن اشعار میں نقش تصوف ہے وہ حاصل کلام کہے جاسکتے ہیں۔

طرز اور اہمیت:۔ ان کی طرز کی نقل ہو ہی نہیں سکتی۔ زبان اور سخن پر ان کو پوری قدرت حاصل ہے وہ باکمال مصور ہیں۔ ان کے اشعار معانی سے مالامال ہیں۔ کوئی شاعر کبھی اس قدر ہر دلعزیز نہ تھا۔ سلاست ایسی ہے کہ سب سمجھتے ہیں اور سراہتے ہیں بہت سے

اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں اور لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔

اکبر کا درجہ:۔ اکبر کا درجہ عجیب ہے۔ ادب اُردو کے محسنین اور بالیاقت اصحاب میں ذکی اور ظریف غزل گو اور ہجو سنج، مصلح، معلم اور رہبر، فلسفی اور صوفی، نغمہ بیز جمہور اور خطوط نویس ہونے کی حیثیت سے ان کو صف اوّل میں صدر نشینی حاصل ہے۔

جلد دوم اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۲ء حصہ ہشتم

اکبر کا آخری دور شاعری از جناب مولوی عبدالماجد صاحب بی۔اے

صفحات ۵۳۵-۵۷۷

خلاصہ :- ان کی ذات شوخی و زندہ دلی اور حکمت و روحانیت کے متضاد اوصاف کا حیرت انگیز مجموعہ تھی۔ وہ ارتقائے ہستی کے اس بلند مرتبہ پر فایز تھے جہاں شاعری فلسفہ و تصوف کے اختلافات و تناقضات رفع ہو کر باہم اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اکبر کے مجموعۂ کلام پر تفصیلی تبصرہ کے لئے ایک سے زائد ضخیم مجلدات کی ضرورت ہوگی مطبوعہ کلام اس وقت تک تین جلدوں میں ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کی ضخامت اتنی ہے کہ دو جلدیں اور شایع ہو سکتی ہیں۔

سہولت تفہیم کی غرض سے ان کی شاعری کو مختلف اصناف میں تقسیم کر کے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جاتی ہے۔

(۱) ظرافت و زندگی (۲) سیاسیات (۳) عشق و تغزل (۴) اخلاق و معاشرت (۵) تصوف معرفت فلسفہ۔ اس مضمون میں محض انھیں دو صنفوں پر بحث کی گئی ہے۔

۱۔ ظرافت و زندہ دلی

اکبر مرحوم کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی۔ اکبر کا موقلم صحیفۂ اُردو کے مرقع ظرافت میں جو گلکاریاں اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے ان سے بہتر نمونہ یہی نہیں کہ اس وقت موجود نہیں بلکہ ایندہ بھی اس میں ترقی و اضافہ کا کوئی درجہ مشکل ہی سے تصور میں آتا ہے جب تک خود جوان تھے شوخ طبعی بھی جوان رہی عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بننے لگا اور اُس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا ——یہی سبب ہے کہ کلیات سیوم میں ظریفانہ اشعار دس فی صدی سے زائد نہیں۔

قسام ازل نے ذہانت و فطانت شوخی و زندہ دلی کی تقسیم میں خاص فیاضی سے کام لیا تھا اس لئے پیرانہ سالی میں بھی اور غلبہ تصوف و معرفت کے باوجود یہ جذبات فنا نہیں ہو گئے تھے۔

اکبر کی ظرافت ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی کہیں کہیں لطف زبان، تناسب لفظی، ندرت ترکیب، جدت قوافی وغیرہ کی بنا پر لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں نہایت آزادانہ رائے رکھتے تھے تا ہم کچھ افتاد مزاج اور کچھ خانگی مصالح و ذاتی حالات کی بنا پر اظہار خیال میں بالکل جری نہ تھے بلکہ بعض اوقات اخفائے خیال میں اس قدر زائد اہتمام کرتے تھے جو ان کے مرتبہ اخلاق سے بہت ہی فروتر تھا۔ ظرافت اس خاص غرض کے لئے ان کے ہاتھ میں ایک کار آمد آلہ کا کام دیتی تھی ——— محض سیاسیات کی تخصیص نہ تھی رند و پارسا امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی۔ ہندو و مسلم، سنی و شیعہ کی ہر صحبت میں اور مسجد و بتکدہ، خانقاہ و میکدہ، علی گڈھ و دیوبند، ندوہ و فرنگی محل، قادیان و احمر، متھرا و بنارس، عدالت و دربار، مدرسہ و تھیٹر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے اور ایک ایک شے کا پورے غور سے جائزہ لیتے رہتے لیکن چہرے پر ظرافت کا نقاب اس قدر گہرا پڑا ہوا تھا کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ گذرتا کہ نگاہیں ہماری جانب ہیں۔

ان کو ظرافت کا سب سے بڑا مظہر یہی سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں ان کا عمل مولانا رومی کی تعلیم پر تھا ؎

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

اکبر ان دلبران سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے ——— ان اسرار کی وہ سر بازار منادی کرتے پھرتے، لیکن وہی اپنی مخصوص زبان میں جو لوگ آپ کی بولی سے واقف ہوگئے تھے۔ وہ معانی کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے اور جو لوگ ان کی مصطلحات سے ناآشنا تھے وہ بھی ایک دل لگی کی بات سمجھ کر ہنس پڑتے تھے۔ بت، صنم، مس، شیخ، سید صاحب، اونٹ گائے، کلیسا، حرم، دیر، بتکدہ، کالج۔ برہمن، لالہ صاحب وغیرہ بیسیوں عام الفاظ نے ان کی زبان میں ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

جب ظرافت کی ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب اخلاق معاشرت تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے متین سفید پوشوں کو اسی پچکاری سے رنگ دیتے۔

واقعات حاضرہ میں بڑی سے لے کر چھوٹی تک ہر شے پر نظر رہتی تھی۔ ایک روز حسن اتفاق کہئے

یاسوے اتفاق کہ انجمن ترقی اُردو کا ذکر آگیا فرمانے لگے "جی ہاں، یہ دیکھیے ایک زبان رہ گئی تھی جسے ہم اپنی کہہ سکتے تھے اب یہ بھی ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی اس کے لئے بھی ایک انجمن کھڑی کی ہے یہ سب بناوٹ اور ظاہرداری کے طریقے ہیں"

ہم سے چھن کر ہوگئی بزم ترقی کے سپرد　　سچ کہا مرزا نے اب اُردو بھی کورٹ ہوگئی

علاقہ اس وقت کورٹ ہوتا ہے جب سرکار خود اپنی مالگذاری اور قرض کی ادائیگی کا انتظام بجائے مالگذار کے کرتی ہے۔

ندرت تشبیہات اکبر کے نسخہ ظرافت کا ایک جزو اعظم ہے ——

بعض جگہ معروف و مانوس بلکہ پامال تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے مگر اس حسن و صنعت کے ساتھ کہ اس تقلید پر سو جدتیں نثار ہیں۔

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی۔

ندرت قوافی کے حضرت اکبر بادشاہ تھے۔

قدرت سخن کا یہ عالم تھا کہ ظریفانہ کلام میں بھی اکثر ایسے الفاظ لاتے جو عموماً مبتذل سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی بندش اس خوبی سے کرتے اور مصرع کا دروبست اس ٹھاٹھ سے رکھتے کہ کلام میں بجائے تنافر کے شگفتگی پیدا ہو جاتی اور سخن فہموں کو اقرار کرنا پڑتا کہ اس خاص موقع کے لئے اس لفظ سے بہتر واضح تر و جامع تر دوسرا لفظ ملنا ممکن نہ تھا۔

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے　　کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

(اس شعر کی جو "شان نزول" حضرت اکبر نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی تھی وہ بھی اس قابل ہے کہ آیندہ نسلوں کے لئے اسے محفوظ رکھا جائے۔ فرماتے تھے کہ "ایک بار دہلی گیا ہوا تھا ایسے انگریزی دارالحکومت قائم کئے ہوئے کئی سال گذر چکے تھے اس زمانہ میں امپیریل کونسل کے جلسے ہو رہے تھے۔ ہر صوبہ کے مشاہیر جمع تھے ایک محلہ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا نماز کے وقت ایک بہت ہی شکستہ حال موذن صاحب آئے، اور اسی طبقہ کے شاید ایک یا دو نمازی۔ کل جماعت اتنے ہی شخصوں کی ہوئی۔ نماز کے بعد میں نے موذن سے پوچھا کہ کیوں میاں، سر " " " بھی کبھی نماز پڑھنے تشریف لائے ہیں؟ موذن بے چارے نے

ان کی شکل دیکھنا کیا معنی ان کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ حیرت سے میرا منہ دیکھ کر انکار کیا اس کے بعد میں نے دو ایک اور مشہور لیڈروں کے متعلق سوال کیا کہ فلاں نواب صاحب، فلاں آنریبل بیرسٹر صاحب کبھی قدم رنجہ فرماتے ہیں اس نے ہر مرتبہ اسی حیرت کے ساتھ انکار کیا اس وقت زبان پر بے ساختہ یہ مصرعہ آ گیا۔ کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن")

ایک مرتبہ ۱۹ء میں الٰہ آباد میں اپنے مکان عشرت منزل میں تشریف رکھتے تھے خاکسار (مضمون نویس صاحب) کو مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا۔ شب کے کھانے کے بعد مسلمانوں کے ادبار پر تاسف کر رہے تھے دو چار اہل علم بھی موجود تھے کہ ایک صاحب نے کہا کہ فلاں فرقہ سے پھر بھی ہماری اخلاقی و معاشرتی حالت بہتر ہے لسان العصر نے فرمایا "جی ہاں" آپ نے خوب بات کہی۔ ساری دنیا سے ہم ذلیل ہوں تو کیا مضایقہ ہے، ہمارے فخر کے لئے یہ بالکل کافی ہے، کہ کچھ لوگ ہم سے ذلیل تر دنیا میں موجود ہیں۔ جب ہی تو میں نے بھی عرض کیا ہے ؎

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں   کیا کم ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

کلو ضلو حسو بدھو گنگو جمن گھورن وفاتی شبراتی کریمن نفیسن وغیرہ متعدد الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں اور ہر جگہ ان سے صحیح ادائے مفہوم اور لطف آفرینی و لطف افزائی کا کام لیا ہے۔ کبھی کبھی عام الفاظ بھی ایسے ہی مبتذل لاتے تھے لیکن اللہ رے حسن بندش و کمال مرصع سازی کہ ان کا ہاتھ لگتے ہی یہ کرخت بدزیب اور بدہیئت سنگریزے خاتم شعر میں نگیں بن کر جم جاتے تھے ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں   فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان لئے دیتے ہو   ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

یہی سلوک محاورات کے ساتھ کرتے رہے ہیں عامیانہ اور بازاری محاورات کو لیتے ہیں اور ان کھلونوں کو بلاغت کے سانچہ میں ڈھال کر کچھ اس طرح تیار کر دیتے ہیں کہ بڑی بڑی متین ہستیاں انھیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنے سر پر جگہ دینے لگتی ہیں۔

اکبر کی ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ان کا ذہن غیر معمولی سرعت کے ساتھ منتقل ہوتا رہتا تھا۔

معنی آفرینی کی ایک شق یہ بھی تھی کہ عام اور معمولی الفاظ کے حروف میں قطع و برید کر کے ان سے نئے نئے معنی و مطالب پیدا کرتے ۔ وہی الفاظ جو روزانہ ہر شخص کی زبان پر رہتے ہیں ان کی ذہانت ان کے اجزائے ترکیبی میں حک واضافہ تقطیع و تحلیل کر کے نئے نئے قالب تیار کرتی اور قوت اخلاقی ان کا غذی پتلوں میں معنی طرازی کی روح پھونکتی رہتی ؎

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم رہے — دم نکلنے پر بھی باقی ہم رہے

الف ب ت ہی کو پڑھ کر میں سمجھا — الف اللہ کا اور ما سوا بت

دکھا رہی ہے یہ ترکیب حسن طبع سلیم — علی کی تم میں جگہ ہو تو بس وہ ہے تعلیم

"ہ" سے ہندو "م" سے مسلم یہ دونوں مل کے "ہم" — سر پر انگریزی "الف" اس سے ہوئی حالت "اہم"

ہے الف "ہم" سے جدا لیکن محافظ اور معین — اس کے سایہ میں رہیں "ہ" "م" شامل ہوں بہم

سر تراشا ان کا کاٹا ان کا پانوٗں — وہ ہوئے ٹھنڈے گئے یہ بھی پگھل

شیخ کو "یخ" کر دیا مومن کو "موم" — دونوں کی حالت گئی آخر بدل

کبھی کبھی اتفاقیہ دو چار ہنسنے ہنسانے کے لئے کہہ لیتے تھے ورنہ عموماً ظرافت ۔ ظرافت کے پردہ میں بھی انھیں کسی مذہبی اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کی تعلیم ہی مدنظر رہتی تھی ۔

حضرت اکبر اگرچہ نہایت راسخ العقیدہ مذہبی شخص تھے تاہم مولویانہ تعصبات اور تنگ خیالیوں کے سخت مخالف تھے ۔ سر سید احمد خاں کی تحریکات کے وہ شروع سے سخت نکتہ چین رہے اور ان کو قومی اور مذہبی زندگی کے حق میں سم قاتل سمجھتے رہے ۔ خود سر سید کے مواجہ میں ان کے ادب و احترام کے باوجود بھی ان کی تحریکات کو ہمیشہ میٹھی چھری کے کچوکے دیتے رہے تاہم مولوی صاحبان نے فتاوائے تکفیر کی جو بارش کر دی تھی اس کے وہ زبردست مخالف تھے ۔

سر سید کی بابت یہ رائے رکھتے تھے کہ اگرچہ ان کے عقائد فاسد تھے اور ان کی تحریکات نے مسلمانوں کو دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے شدید نقصان پہنچایا ہے تاہم خدا جو زبان کے بجائے قلب پر نگاہ رکھتا ہے انھیں ان کی نیک نیتی کا اجر دے گا ۔

سید صاحب کی اصطلاح سے اکبر کی زبان میں حامیان تحریک علیگڈھ مراد ہوتے ۔

حضرت اکبر۔ مجلس زندگی کے ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھے تھے۔ شروع ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب ایک عرصہ دراز کے لئے ہندوستان سے ولایت تشریف لے گئے ان کی ذات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی روح رواں اور سب سے بڑی کارفرما تھی اس وقت اسی کے معاملات پر مسلمانوں کے قومی اخبارات میں ایک طوفان برپا تھا اُن کے روانہ ہوتے ہی اس تلاطم میں سکون پیدا ہوگیا۔ عین اسی زمانہ میں رویت ہلال کی شرائط سے متعلق مولوی نظام الدین حسن مرحوم، جنھیں علم حساب وہیئت سے خاص شغف تھا اور علماء فرنگی محل کے درمیان ایک مباحثہ چھڑ گیا اخبارات نے دلچسپی لی اور حریفانہ دلائل اپنی اپنی چمک دکھانے لگے۔ اکبر کی ذہانت نے ان حالات کو نوٹ کیا اسی وقت ایک نظم ارشاد ہوئی۔ آخری مصرعہ یہ تھا ع

آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

آغاز ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی معیت میں مولانا سید سلیمان ندوی (ایڈیٹر معارف) بھی وفد خلافت میں شریک ہوکر لندن روانہ ہوئے۔ اکبر کو ایک عالم دین کا سیاسی حیثیت سے ولایت جانا کچھ پسند نہ آیا ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی ۔۔۔ کہ ندوی سے اب ہوگئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے ۔۔۔ مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی

محمد علی کی رفاقت میں ہیں
خدا غیر سے ان کو کردے غنی

کبھی کبھی (گو نادراً) ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندہ دلی و شوخ نگاری کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے اور ظرافت خانہ کے حمام میں برہنہ ہوکر داخل ہوئے اس وقت متانت اپنا منہ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہوجاتیں۔ یورپ میں جنگ عظیم برپا ہے۔ غریب ترکوں پر ہر طرف سے یورش ہے۔ یہانتک کہ بالآخر حریف کا قدم سالونیکا تک پہنچ گیا ہے۔ سارا عالم اسلامی ہیجان و اضطراب میں مبتلا ہے۔ عین اس وقت یہ پیر ظریف اپنے ترکش سے ظرافت و شوخی کے تیر نکالتا ہے۔

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی "حرم" میں آئیں ۔۔۔ ملحوظ رکھے دنیا اس رشتہ ہم کو

پھر کرکے اس پہ قبضہ گمدیں یہ ترک ان سے　　　سالو نکاسے آؤ سالو نکالو ہم کو

پہلے دونوں مصرعوں میں رشتہ ازدواج کو بیان کرکے ایک کریہہ لفظ کی کراہت کو حتی الامکان دور کر دیا ہے پھر بھی ذہن کی اس حیرانی کو کون رفع کر سکتا ہے کہ یہ لفظ انھیں بزرگوں نے استعمال کیا ہے جن کا عارفانہ وسنجیدہ کلام ایک طرف سعدی و جامی دوسری طرف عطار وسنائی سے ٹکر کھاتا ہے۔

(۲) سیاست

سیاست سے براہ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی نہ کبھی اس فن کا انھوں نے مطالعہ باقاعدہ کیا تھا۔ اور نہ اس موضوع سے ان کے دماغ کو کوئی خاص مناسبت تھی لیکن چونکہ نہایت پختہ مذہبی شخص تھے اور مشرقی اخلاق کو بے حد عزیز رکھتے تھے اس سے جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات ان کے دل میں چھبتی اور مجبوراً خارزار سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کرکے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصّہ سرکاری ملازمت میں گذرا اس کے بعد آخر تک پنشن کے طوق گرانبار اور خطاب (خان بہادری) کی زنجیر طلائی سے پابجولاں رہے۔ اس لئے زبان پر مرتے دم تک مصلحت اندیشیوں کی مہر لگی رہی اور اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی نہ کر سکا تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جیسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے اور اوپر شکر کا غلاف اس قدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولیاں اُتارتا جاتا اور ادھر زبان فرط حلاوت و شیرینی سے ہونٹ چاٹتی رہتی۔

صدہا اشعار سیاسی مضامین سے لبریز ارشاد فرمائے ہیں کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے۔

"اونٹ" اور "خر عیسےٰ" اکبر کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں اونٹ اور گائے کا ذکر کثرت سے آتا ہے "خر عیسےٰ" کے بجائے کہیں کہیں جان بل بھی استعمال کیا ہے اور کہیں "بندر" بھی۔

اکبر کے عقیدہ میں سیاسی ترقی کا اصول حصول قوت تھا۔ اگر آج ہم "ان" سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں ان کے مساوی قوت

پیدا کریں سیاست نام ہے توازن قوت کا جو قوم جس قدر قوی تر ہوگی اسی قدر دوسروں کے مقابلہ میں مضبوط ہوگی۔

تحریک ترک موالات سے اصولاً وہ بالکل متفق تھے تاہم انھیں اس کے اکثر علَم برداروں کے خلوص وحسن نیت میں بہت شبہ تھا ؎ غیر مطبوعہ

نئی روشنی کا ہوا تیل کم حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے سیاسی کمیٹی میں پل جائیے
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

حضرت اکبر نے شخصاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجالس سے الگ رکھا ان کا مطمح نظر وطن کے بجائے عاقبت، ملک کے بجائے حقانیت اور قوم کے بجائے خدا تھا۔

ان کے نزدیک تمام امراض سیاسی کا درماں وحید طاعت وعبادت الٰہی تھی۔

وہ حسرت وتاسف کی نظروں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے تھے کہ وطن دوستی وقوم پرستی کا نام لے کر ساری دنیا (کیا مشرق اور کیا مغرب) محض مادی اغراض کے لئے برسر کارزار ہے خوف خدا وحق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جاتا ہے۔ البتہ جو خاصان حق ان ہنگامہ آریوں سے الگ خلوت گاہ حق میں مقیم ہیں وہ سکون خاطر وتسکین قلب کی لذتیں حاصل کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے ؎ غیر مطبوعہ

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے دنیا اُٹھی ہے اپنی تعلی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ اللہ ہی ہے ان کی تسلی کے واسطے

تحریک ترک موالات کو حاکم مطلق کی یادگار میں مقبولیت صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہو نہ یہ کہ اس کی بنا انا خیرٌ منہ پر ہو کہ یہ عین ابلیسیت ہے ؎ غیر مطبوعہ

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہوا س بنا پر تم کہ دل کو طاعت حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو تحریک ترک موالات کی وجہ کوئی اور ہی بیان کرتے ہیں جو اس قدر "خانگی" حیثیت رکھتی ہے کہ کسی نامحرم کی زبان سے ادا ہونے کے لائق نہیں۔ بہتر ہوگا کہ اسے خود انھیں کے زبان سے سنئے۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اکبر صاحب گورنمنٹ سے پنشن پاتے تھے۔

(ج) عشق و تغزل

غزل گو شاعر کی حیثیت سے اکبر کو شہرت عام کبھی نہیں حاصل ہوئی تاہم کلیات اول و دوم میں ان کی متعدد غزلیں ایسی درج ہیں جنھیں بلا تامل اساتذۂ غزل اُردو کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔

کلیات اوّل میں۔ حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قائم کئے ہیں۔

پہلا دور تا ۱۸۶۶ء گویا یہ ان کی شاعری کے بچپن کا دور تھا۔ اس وقت وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہمنوا نہیں تاہم برجستگی، شوخی، روانی طبع و لطف زبان کے جوہر اس وقت بھی نمایاں ہیں۔

دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۴ء۔ رندی و ہوسناکی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں تاہم جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے اور رنگ تغزل زیادہ نکھر گیا ہے لطف زبان و حسن بیان کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔

دور سوم ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۵ء۔ اس دور کا کلام رنگ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے طرز ادا میں سنجیدگی زیادہ پیدا ہوگئی ہے مضمون آفرینی پر زیادہ توجہ ہوگئی ہے۔ غزل میں اخلاقی و روحانی معنویت کی آمیزش بے تکلفانہ کی جانے لگی ہے اور جابجا ظرافت کا چٹخارہ بھی آنے لگا ہے پھر بھی مسلم و متعارف رنگ تغزل ہے کوئی مصرعہ الگ نہیں پڑنے پاتا۔

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے ۔۔۔ کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

اس شعر کے متعلق ایک لطیفہ۔ خود حضرت اکبر کی زبان سے سنا تھا۔ لکھنؤ میں منشی حاجی اطہر علی مرحوم کاکوروی ایک نہایت راسخ الاعتقاد اور متقشّف مذہبی شخص تھے۔ اکبر صاحب فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ غزل مشاعرے کی ہے جب شمع میرے سامنے آئی تو میں نے یہ غزل پڑھنا شروع کی۔ جوں ہی اس شعر پر پہنچا اور پہلا مصرعہ زبان سے ادا کیا کہ منشی صاحب کے چہرہ پر نگاہ پڑی۔ ان کا تقشّف و زہد قرآن کے ساتھ اس شاعرانہ آزادی کا

متحمل نہ ہوسکا۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ دوسرا مصرعہ سننے کے بعد رائے قائم فرمائیے یہ کہتے ہی دوسرا مصرعہ سنایا تو منشی صاحب پھڑک اُٹھے بے اختیار اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بہت دیر تک داد دیتے رہے"۔ شاعرانہ فتحمندی کی اس سے زیادہ دلچسپ اور کیا مثال ہو گی۔

دور چہارم ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء یہ کوئی مستقل دور نہیں اسے دور سوم کا تکملہ سمجھنا چاہئے دور سوم تک کا کلام کلیات اوّل میں موجود ہے اس کے بعد سے چار برس کا کلام کلیات دویم میں ہے اس لئے اس حصّے کے لئے ایک جداگانہ دور قائم کیا گیا۔ کلیات اوّل میں بیشتر حصّہ غزلیات ہی کا ہے کلیات دوئم میں یہ تناسب گھٹ گیا ہے اور جتنا حصّہ غزلیات کا ہے اس میں بھی چند اخلاقی، فلسفیانہ، سیاسی و عارفانہ مضامین شامل ہیں۔ تاہم عاشقانہ حصہ بھی لطف وکیف سے خالی نہیں۔ کہنہ مشقی سے پختگی بدرجہ غائت پیدا ہو گئی ہے اور اُستادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پیدا ہے۔ طبیعت کی آمد، جدت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہے۔

دور پنجم۔ آخری دور میں جو ہمارے اس تبصرہ کا اصل موضوع ہے تغزل کا رنگ بہت ہلکا پڑ گیا ہے اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں غزل بہت کم کہتے تھے۔ عموماً سیاسی اخلاقی عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ غزلیات کے عنوان سے کلیات سوم میں جتنے صفحات وقف کئے گئے ہیں تعداد میں زائد ہیں لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے عموماً وہ واقعات حاضرہ پر شاعر کے خیالات و افکار ہیں جنھیں غزل کے سانچہ میں موزوں کر دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی کسی قدر موجود ہے درمیانی کلام میں بڑھتی گئی یہاں تک کہ آخری زمانہ میں یہ خصوصیت تمام دیگر خصوصیات پر غالب آ گئی۔ کلیات اول کے پہلے ایڈیشن کے شایع ہونے پر کسی ناقد نے اپنی رائے یہ ظاہر کی تھی کہ "مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تھنکر (سوچنے والا۔ صاحب فکر) یا فلاسفر ہے، جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے نہایت پسند آئی۔ اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے اور واقعہ یہ ہے کہ جوں جوں ان کی شاعری نکھرتی گئی وہ روز بروز اس خیال کے زیادہ مصداق ہوتے گئے

قالب اگرچہ غزل کا ہے لیکن روح ان میں غزل کی نہیں جام و سبو اب بھی غزل میں تھا لیکن ان کے اندر اکثر شراب عشق و تشبیب کا ایک قطرہ بھی نہ ہوتا بلکہ کہیں اخلاق و موعظت کی یخنی ملتی تھی کہیں طریقت و معرفت کا آب طہور چھلکتا ہوتا تھا، کہیں ظرافت کی چاشنی سیاست کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آتی تھی۔

غرض آخری دور کا جو حصّہ غزلیات کے زیر عنوان رکھا گیا ہے اس کا بیشتر جزو ایسا ہے جسے رسمی و جزوی و لغوی معنی میں غزل و تغزل سے کوئی واسطہ نہیں۔

بااین ہمہ جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں پورے عاشق بن گئے ہیں۔ اپنے مرتبۂ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے۔ لطف زبان و سلاست بیان ان کی غزل کی جان ہے بیان کی لطافت کے ساتھ ساتھ خیال کی بلندی بھی موجود رہتی ہے۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب و شایستگی سے غافل ہو جائیں۔

دور اوّل کے برخلاف دور آخر کی اکثر غزلوں کی تان یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے لذت دنیا کا موہوم و ناقابل اعتنا ہونا' دنیا کی بے ثباتی اور اس سے اپنی بے تعلقی یہ موضوع اکثر غزلوں میں مشترک ہے۔

اچھوتے اور نامانوس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا' بلکہ اس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل میں یہ نعمت اکبر کے لئے مقسوم ہو چکی تھی ان کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب نہیں ہے واردات قلب کا عکس ہے۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس ایک بات کے اور میرے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

حق یہ ہے کہ اکبر کی عظمت ان کے عاشقانہ کلام کی بنا پر نہیں بلکہ دوسرے اصناف سخن پر ہے۔ عشقیہ شاعری (خصوصاً آخری دور کی) اس جہان وارسخن کی قلمرو کا خام ترین علاقہ ہے اور اگر محض اس صنف کلام کے معیار پر فیصلہ کیا جائے تو اکبر کی کرسی امتیاز کو اس کے موجودہ مقام سے پیچھے ہٹانا پڑے گا۔ بااین ہمہ خالص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اردو شعرا

میں صرف چند ہی سے فروتر ہے۔ روزمرہ کی شیرینی اور زبان کی صفائی میں ان کی اکثر غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے اور عاشقانہ تخیل کی بلند پروازیوں میں اگروہ عموماً غالب کی فضا تک نہیں پہنچ سکتے ہیں تو بھی اکثر مقامات پر انھیں شیفتہ و آتش کے بازووں سے بازو ملائے ہوئے پرواز کرتے دیکھا جاسکتا ہے۔ ابتدائی اور درمیانی ادوار میں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔ آخری دور میں کمتر۔

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں۔ آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے لیکن دو چیزیں ایسی تھیں، جنھوں نے اوّل سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی ایک ظرافت جس کا تعلق پیرایۂ ادا و انداز بیان سے تھا دوسرے اصلاح معاشرت و تزکیہ اخلاق جس کا تعلق موضوع سخن و مفہوم کلام سے تھا۔

اس کے بعد صفحہ ۲۰۳ سے ۲۳۴ تک مولانا نے اتنا مسلسل اتنا عبرت خیز اور اتنا بلیغ مضمون لکھا ہے جس کا انتخاب میری قدرت سے باہر ہے لہٰذا جو لوگ چاہیں وہ انجمن ترقی اردو سے مجلہ مذکورہ بالا کا اپریل نمبر منگا کر دیکھ لیں۔

وطن پرست شاعر

"The Patriot Poet."

اس نام سے چودھری رحم علی صاحب ہاشمی بی-اے نے ایک دیدہ زیب مختصر سا گلدستہ انگریزی زبان میں لکھا ہے جس میں اکبر کے کلام کا انتخاب ہے اور جتنے شعر لئے گئے ہیں سب کا ترجمہ انگریزی میں موجود ہے۔

یہ گلدستہ جیسا دیباچہ سے ظاہر ہے پہلے انڈپنڈنٹ اخبار کے لئے جو مضامین لکھے گئے تھے انھیں کا مجموعہ ہے۔

ہاشمی صاحب کا ارادہ ہے کہ اگر حالات نے اجازت دی تو وہ اکبر کی شاعری پر مفصل تبصرہ لکھیں گے خدا ان کو کامیاب کرے۔

رحم علی صاحب ہاشمی معمولی دل و دماغ اور سطحی نظر رکھنے والے حضرات میں سے نہیں ہیں وہ اُردو اور انگریزی کے مختلف جرائد و رسائل میں مدیر و نائب مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں لہٰذا ان کے گلدستہ میں سے کہیں کہیں سے کچھ پھول چن کر میں آپ کے سامنے اپنی زبان میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ عبدالماجد صاحب اور صاحب تاریخ ادب اُردو کی طرح ان کی نگاہ میں اکبر کی کیا حیثیت ہے۔

خان بہادر اکبر حسین الہ آبادی المعروف بہ لسان العصر کا نام ادب اُردو کی تاریخ میں شاعر فلسفی اور مصلح ہونے کی حیثیت سے نہایت عظیم الشان مرتبہ رکھتا ہے -ان کے چھوٹے سے سر اور منحنی سے جسم کو (جو آرام کرسی پر جلوہ ریز رہتا تھا) دیکھ کر ان کے عالی مرتبت حسن باطن کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا-لیکن لبوں کے کھلتے ہی بے تکلف اور شیریں جملوں میں ان کے دل و دماغ کی بزرگی موجزن ہو جاتی تھی۔ یہ مسلّم ہے کہ طرز بیان اور ظرافت میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا مگر ان کی اصلی عظمت اس امر میں ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری اور اردو ادب کو مالامال کر کے اس کی وسعت بہت بڑھا دی وہی اُردو جو ان کے پہلے بہت غریب اور محدود تھی انھوں نے اُردو شاعری میں بہت سی نئی ترکیبیں اور نئے خیالات پیدا کئے ہیں اور میں سنداً کہہ سکتا ہوں کہ

ابھی تک بہت سی زبانوں میں ان اختراعات کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔

ہندوستان کے جمہور میں ان کی شہرت کا آفتاب نہایت تیزی سے چمک رہا تھا مگر چند خاص وجوہ سے انھیں ہندوستان کے باہر بہت زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ اقبال اور ٹیگور کی عالمگیر شہرت کی بنیاد اسی پر ہے کہ مغرب ان سے اور وہ مغرب سے واقف ہو گئے پہلی دقت یہ ہوئی کہ اکبر کی شاعری کا ترجمہ قریب قریب ناممکن ہے۔ ظرافت کا عنصر مختص ہے اور وہ اُردو زبان کی جان ہے۔ ان کی خصوصیات بیّن میں سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت قافیوں کا انتخاب ان کی تلاش اور ان کا استعمال ہے۔

اکبر کی زندگی کا فرض اولین یہ تھا کہ وہ مغرب اور مغرب کی ہر شے کی تردید کریں اور ان کی سیاسی خودداری نے کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی شاعری کو مطبوع خلائق بنانے کے لئے مغرب سے کوئی مدد لیں۔ نہیں وہ تو اس پر تیار تھے کہ شاعری سے ترک موالات کر لیں بمقابل اس کے کہ اُسی مغرب سے خراج تحسین وصول کریں جس کو وہ اپنی نگاہ میں مشرق کا دشمن سمجھتے تھے۔

انھیں حالات کے لحاظ سے کوئی ناقدان کی شاعری کا تبصرہ سوا اُردو کے اور کسی زبان میں آسانی سے نہیں کر سکتا مگر یہ بات کسی طرح عمدہ نہ ہوگی کہ دنیا سے اپنے زمانے کے بہترین شاعر کے کلام کو پردۂ خفا میں رکھا جائے۔

مصلح

تحریک ترک موالات سے بہت پہلے اور سیو ریز اور جلیانوالہ باغ کی صلح سے بہت پہلے اکبر نے دور حاضرہ کی تحریک اور مذہبی تمدن کی خرابیوں کا احساس کر لیا تھا اور خصوصیت سے ہندوستانی اور مسلمین پر ان کے خراب اثرات کا اندازہ انھیں ہو چکا تھا۔ وہ اثنائے گفتگو میں کہا کرتے تھے کہ خلافت اور سوراج کے چرچے اس وقت ہونے چاہئیں تھے جب انگریزی مدرسوں کا افتتاح ہو رہا تھا۔ ریلیں جاری ہو رہی تھیں اور دوسری سائنٹفک اشیا کو رواج دیا جا رہا تھا۔

بہر نوع اکبر شاعر تھے اور صاحب فکر۔ عمل خالص ان کے احاطہ سے باہر تھا۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ خرابیوں کو دکھا کر سیدھا راستہ بتا دیں۔ مختصر یہ ہے کہ وہ واعظ محض تھے

مگر دوسرے واعظین اور ان کے مواعظ کا انجام دیکھ کر انھوں نے کھلے بندوں یہ فرض بھی انجام نہیں دیا اور وعظ پند کی جگہ زیادہ دلچسپ اور زیادہ موثر پیرایہ اختیار کرلیا۔

بزرگیوں پر ہر اک طرف سے فلک کے برچھے تنے ہوئے ہیں
یہی سبب ہے جناب اکبر جو طفل ناداں بنے ہوئے ہیں

اور انھیں طفلانہ جملوں میں وہ تضحیک و تردید کے طوفان اُٹھایا کرتے تھے مگر ان کے لہجہ میں تلخی نام کو بھی نہ تھی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو نشانۂ ملامت ہوتے تھے وہ بھی ان کی عزت اور ان سے محبت کرتے تھے۔ اگر وہ ایک عصائے کرمتعصب ملّا کی طرح لوگوں کے سر پر آ ٹوٹتے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہی ہوتا۔ مگر حالت موجودہ میں وہ بزرگ سے بزرگ اور خورد سے خورد کسی کو بھی نہ چھوڑتے۔ جہاں کہیں ذرا سی خرابی نظر آئی فوراً سنا بیٹھے مگر ان کی تنقید ظرافت کی شیرینی سے ملکران کی گردن کو شکنجہ قانون سے محفوظ رکھتی تھی۔

وطن پرست

اگرچہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست معاون تھے مگر ان کا فرض اولیں مسلمین کی اصلاح تھا۔ بالغ نظر فلسفی کی طرح وہ ابنائے وطن کی عام ذلت و غلامی کے مشاہدہ سے اثر پذیر ہوتے تھے اور ان کی رائے میں، سلسلۂ ذلت میں مسلمین کی حالت نسبتاً سب سے زیادہ خراب ہے۔ سوال نہایت نازک تھا اور اکبر ہی ایسے قادر الکلام کا یہ کام تھا کہ اس مسئلہ کو چھیڑے اور کسی گروہ کی کوئی دل آزاری نہ ہو۔

رہبر

اکبر کے چشم و گوش تحریکات حاضرہ کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے وہ نہایت ہوشیار ناظر تھے۔ طرّہ یہ کہ وہ بہت پہلے ان چیزوں کو نگاہ پیش بیں سے دیکھ لیتے تھے جو آج کل ہو رہی ہیں۔ آج کل ہر شخص ہندوستان کی آزادی مطلق کا غلغلہ مچا رہا ہے۔ اکبر کو اس امر کا الہام بہت پہلے ہو چکا تھا اور جن لفظوں میں اُنھوں نے اپنے خیال کو ادا کیا ہے وہ سوائے الہام کے اور

کسی ذریعہ سے حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔

جو مسرت تیری محتاج نگاہ غیر ہے　　اس مسرت میں نہ خوبی ہے نہ کوئی خیر ہے

مغربی تعلیم

اکبر فطرتاً اس خیال کی تردید میں نہایت مصمم تھے کہ مغربی طرز تعلیم کے ذریعہ قومی ترقی ہو سکتی ہے۔ قومی احساس اور طرق رواداری اکبر کے نزدیک مغربی روش سے بالکل جدا چیزیں تھیں اور مغربی تعلیم کے ماتحت نفس شناسی ناممکن تھی۔

پردہ یا آزادی

وہ طبعاً قدامت پرست تھے لہذا ان کو صنف لطیف کی آزادی ہرگز پسند نہ تھی اور وہ پردہ کے زبردست حامی تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے مخالف نہ تھے مگر ان کی خواہش یہ ضرور تھی کہ تعلیم حدود و شرائط کے ساتھ دی جائے۔

مذہبی نصب العین

وہ نہایت روشن دماغ اور پاک باطن مسلمان تھے۔ جن کو مذہبی مباحث سے نفرت تھی اور جن کی ہستی ہر قسم کے تعصب سے پاک تھی۔

ان کا معیار واحد محض character اخلاق تھا اور وہ ہندو مسلم میں بہ حیثیت خود کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔

فلسفہ

ہیگل اور جرمن کے دوسرے فلاسفہ اس خاکسار شاعر کے سامنے آئینہ حیرت اور تصویر خموشی بن جائیں گے جو سنگم سے سیراب ہوتا تھا اور جس کی پرواز خود فلسفہ سے بھی زیادہ بلند تھی۔

بحوالہ رسالہ مخزن لاہور دسمبر ۱۹۲۷ء

حضرت اکبر الہ آبادی

ازڈاکٹر اعظم کُریوی سابق مدیر رسالہ اکبر الہ آباد

ڈاکٹر اعظم صاحب کا مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر نہایت جامع اور معنی خیز ہے۔ ذیل کے سطور میں خلاصہ مضمون پیش کرتا ہوں جس سے آپ خود ہی اندازہ فرمالیں گے کہ کس پایہ کا مضمون ہوگا۔

آپ دورموجودہ کے ان چند باکمال شعرائے منتخب میں سے تھے جن کی جدت طرازی اور معجز بیانی نے اُردو شاعری کے مردہ قالب میں نئی روح پھونکی۔ آپ نے نیچرل اور ایشیائی رنگ کو ایسی دلکش ترکیب سے شیر وشکر کیا کہ اس میں ایک عجیب شیرینی پیدا ہوگئی اور چمنستان شاعری میں ایک نئی کیاری ظریفانہ رنگ سخن کی نکل آئی۔

ظرافت کے پہلو میں تعلیم وتہذیب مغربی کے اثرات کا خاکہ اُڑانا آپ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔

آپ روزمرّہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کرجاتے تھے جو دوسروں کو غوروفکر کے بعد بھی نہ سوجھتے تھے۔

آپ سید رضوی تھے۔ سلسلۂ نسب امام ہشتم امام رضاؑ سے ملتا ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید علی عرب مع اپنے فرزند سید زید اور اپنے بھائی سید اسمٰعیل نیشاپور خراسان سے ۹۳۲ھ ہجری میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ سید علی عرب کی اولاد کی قرابت سادات بلگرام سے ہوئی تھی۔ حضرت اکبر کے دادا سید محمد زماں فوج بنگال میں صوبہ دار تھے۔ لارڈ کلایو کے ہمراہ جنگ پلاسی میں آپ بڑی بہادری سے لڑے تھے۔ چنانچہ حسن خدمات کے صلہ میں آپ کو پنشن اور بنگال میں معافی عطا ہوئی تھی اور آپ نے وہیں توطّن بھی اختیار کیا۔

لسان العصر کے دادا سید فضل محمد بڑے پائے کے عالم تھے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ حکومت کے اثر یا صحبت سے متاثّر ہوکر آپ نے

اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا اور شیعہ ہو گئے تھے اور سرکار اودھ کی طرف سے مجتہد العصر کے لقب سے ملقّب ہو کر جاگیر پائی تھی۔

حضرت اکبر کے والد سید تفضل حسین رضوی صوفی ابو العلائی جن کو حضرت مولانا شاہ محمد قاسم دانا پوری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت و خلافت حاصل تھا۔ بڑے جیّد عالم تھے۔ چونکہ آپ کے والد نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا اس لئے آپ بھی بچپن سے زمانہ طالب علمی تک شیعہ رہے لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد پھر سنّی ہو گئے تھے۔ آپ ابتدائے عمر میں کچھ عرصہ تک نائب تحصیلدار رہے۔ لیکن بہت جلد ترک ملازمت کر کے بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کی۔ ۱۸۶۷ء میں جب حضرت اکبر نے وکالت کا امتحان دیا۔ اُس زمانے میں مولانا تفضل حسین آگرے میں حضرت سیدنا امیر ابو العلاء کے مزار اقدس پر معتکف تھے۔ امتحان ہوتے ہی آپ نے جواباً خط میں تحریر فرمایا۔ کہ "الحمد للہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے" دو مہینے بعد امتحان کا نتیجہ نکلا۔ جس میں حسب پیشین گوئی کامیابی تھی۔

آپ ۹۔ شعبان ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۴۔ مئی ۱۸۸۵ء یوم جمعہ کو بوقت ۱۱ بجے دن اس دار فانی سے رحلت فرما کر واصل ذات رب ۱۳۰۲ ہوئے۔

غرض ایسے قدیم اور علم و فضل سے بھرے ہوئے خاندان میں سید اکبر حسین ۱۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام الہ آباد پیدا ہوئے۔ ذکاوت۔ شوخی اور زندہ دلی خالق اکبر نے پیدائش ہی سے آپ میں ودیعت کر رکھی تھی۔ مولانا ولایت حسین عربی و فارسی میں زبردست عالم ہونے کے ساتھ ہی بڑے ریاضی داں تھے۔ انھوں نے اپنے اس ہونہار بچے کو اس زمانے کے قاعدے کے مطابق عربی۔ فارسی اور ریاضی کا درس دیا۔ حضرت اکبر ۱۵ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ انگریزی کا شوق آپ نے خود فرمایا اور رفتہ رفتہ انگریزی میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر لی۔

۱۸۶۴ء میں جب ایسٹ انڈین ریلوے کی طرف سے الہ آباد میں جمنا پر پل تیار ہو رہا تھا تو ایک دن حضرت اکبر اس محکمہ کے افسر اعلےٰ سے ملے۔ وہ آپ کی ذہانت اور قابلیت دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ فوراً اپنی ماتحتی میں ملازم رکھ لیا۔ اس وقت آپ کی عمر قریباً سولہ سال کی تھی آپ خاص علمی قابلیت کے مجسمہ تھے۔ بھلا اس اینٹ پتھر کے محکمہ میں آپ کی طبیعت کیا لگتی۔

چنانچہ بہت جلد آپ نے وہ ملازمت ترک کردی اور ہمہ تن مطالعہ کتب قانون میں مصروف ہو گئے۔ ۱۸۶۶ء میں آپ نے درجہ ادنیٰ کا امتحان وکالت پاس کیا اور ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مستعفی ہو کر پھر وکالت شروع کر دی اور اس عرصہ میں امتحان وکالت ہائی کورٹ بھی پاس کر لیا۔ آپ نے اپنی رطب اللسانی جرح اور مدلل طریقہ وکالت سے جلد ہی اس قدر نام پیدا کر لیا کہ آپ کا شمار اُس وقت کے مشہور وکلا میں ہونے لگا ۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف۔ ۱۸۸۱ء میں مستقل منصف درجۂ دوئم اور ۱۸۸۴ء میں منصف درجہ اوّل ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں سب ججی کے عہدہ پر ترقی کی اور ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ درجہ اول اور اسی سال سشن ججی کے لئے منتخب ہوئے۔

۲۱۔ مئی ۱۸۹۸ء کو گورنمنٹ نے آپ کے حسن خدمات کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ اس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی فیلو اور اکثر ممتحن مقرر ہوئے۔

۱۹۰۳ء میں پنشن لے کر آپ نے قناعت اور گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور معزز اصحاب کی درخواست اور اصرار پر بھی کسی ہندوستانی ریاست کے ممتاز عہدہ پر جانا قبول نہ فرمایا۔ بلکہ اپنی عالیشان کوٹھی "عشرت منزل" الہ آباد ہی میں باقی ماندہ زندگی عبادت الٰہی میں گذار دی۔ آپ صوم وصلوٰۃ کے ہمیشہ بڑے پابند تھے۔ ایک منزل روزانہ قرآن شریف کی تلاوت نہایت خشوع وخضوع سے بالاستقلال کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ داناپوری سے ابتدائی عمر میں شرف بیعت بھی آپ کو حاصل تھا۔

آپ ہر طبقہ میں نہایت ہر دل عزیز تھے۔ ہمعصر نامی شعرا میں بھی آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الہ آباد کا نام آپ کی ذات سے بہت ہوا۔ چنانچہ حضرت صفی لکھنوی کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کا اظہار ہو رہا ہے:۔

اے الہ آباد اے جولاں گہ گنگ وجمن — تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن
سیکھتی ہے قوم تجھ سے میل وملت کا چلن — اتحاد باہمی سنگم سے تیری موج زن

بذلہ سنجی کا جواہر خیز اک معدن ہے تو
حضرت اکبر لسان العصر کا مسکن ہے تو

حضرت اکبر نے بھی ایک موقع پر خود فرمایا ہے۔ کہ

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے　　یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

آپ نہایت خوش گو۔ خوش مزاج اور ظریف طبع تھے۔ مگر ظرافت میں تہذیب و شایستگی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ بڑی سادگی سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں تصنع بالکل نہ تھا۔ ہر شخص سے نہایت خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ آپ کی خدمت میں ہر قسم کے لوگ مسلمان۔ ہندو۔ عیسائی نہایت خصوصیت کے ساتھ معتقدانہ حاضر ہوتے تھے۔ آپ میانہ قد۔ لاغر اندام اور گندمی رنگ تھے۔ آواز میں نرمی اور متانت تھی۔ لیکن عموماً سادی پوشاک میں رہتے تھے۔ سر پر ہمیشہ ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ آخر عمر میں آپ کو آنکھوں کی بہت شکایت رہتی تھی اور اسی کا ذکر اپنے احباب کے خطوط میں بڑی حسرت سے کرتے تھے۔ اپنے اشعار میں بھی اس کی شکایت کی ہے :-

بصارت نے کمی کی۔ انحطاط عمر میں اکبر　　بصیرت ہے تو آنکھیں مجھ سے اب آنکھیں چراتی ہیں

کونسل سے ہر طرح کا قانون آرہا ہے　　مطبع سے ہر طرح کا مضمون آرہا ہے

لیکن پڑھوں میں کیونکر آنکھوں کی ہے یہ حالت　　اشک آرہے تھے پہلے اب خون آرہا ہے

حضرت اکبر کو ہاشم مرحوم سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ہاشم کے انتقال کے بعد سے آپ کی صحت خراب ہونے لگی۔ آپ نے اپنے رنج و غم کا اظہار کلیات اکبر میں کئی جگہ کیا ہے۔ ہاشم کی جواں مرگی پر آپ نے جناب دلگیر اکبر آبادی کو خط لکھا "کس قلم سے لکھوں۔ کس زبان سے کہوں۔ کہ میرے پیارے زندگی کے سہارے ہاشم جو آپ کا معتقد اور نیاز مند تھا اور میری طبیعت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ ۵۔ جون ۱۹۱۳ء کو بیس دن کی علالت کے بعد اللہ اللہ کرتا دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ بجز اس کے کہ ہوش میں ہوں اور یہ کارڈ لکھ سکا اور کوئی حالت مجھ میں نہیں۔ دعا فرمائیے کہ خدا صبر عطا فرمائے۔ کوشش کر رہا ہوں اور مذہب اور تصوّف سے مدد چاہتا ہوں۔

آپ شوخی وزندہ دلی حکمت وروحانیت کے متضاد اوصاف کا مجموعہ تھے۔

حضرت اکبر ۷۵ سال کی عمر میں دس بارہ روز بخار و پیچش میں مبتلا رہ کر ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء یوم جمعہ بوقت ۴ بجے شام عین اُس وقت کہ آپ کے حسب خواہش خواجہ حسن نظامی تلاوت قرآن پاک فرما رہے تھے اور ذکر پاک آپ کی زبان پر جاری تھا۔ راہی ملک بقا ہوئے ہندوستان کے ہر گوشہ سے آپ کے انتقال پر ملال پر اظہار افسوس کیا گیا۔

آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی کی یادگار سید عابد حسین صاحب ہیں۔ جو افسوس ہے۔ کہ اوائل عمر ہی سے دماغی امراض میں مبتلا ہیں۔ دوسری بیوی کی یادگار سید عشرت حسین بی۔اے (کیمبرج) ہیں۔ جو شیخ احمد حسین خان بہادر تعلقہ دار پریانواں کے داماد ہیں اور آج کل ضلع ہردوئی میں مدرسہ قانون گویاں کے پرنسپل ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا شہرہ جج یا خان بہادر ہونے کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ آپ کا اخلاق آپ کا سبق آموز ظریفانہ اور فلسفیانہ کلام آپ کی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہوا اور آپ کو لسان العصر کا خطاب ملک سے ملا۔ شعر و سخن کا مذاق آپ کی طبیعت میں بچپن ہی سے تھا۔ بیس برس سے کم عمر کے اشعار اور اس کے بعد سے آخر عمر تک کے اشعار کلیات اکبر میں موجود ہیں۔ جس کے تین حصے طبع ہو چکے ہیں۔ باقی ماندہ کلام کی اشاعت کا انتظام سید عشرت حسین صاحب کر رہے ہیں۔

آپ حضرت مولانا وحید کڑوی الٰہ آبادی کے مایۂ ناز تلامذہ میں تھے۔ شروع میں آپ نے قدیم رنگ تغزل کو اختیار کیا تھا اور حسن و عشق وغیرہ پر خوب خوب طبع آزمائیاں کی تھیں چنانچہ وہ تمام خوبیاں جو ایک کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر کے کلام میں ہونا چاہئیں آپ کے قدیم رنگ میں موجود ہیں۔ ابتدائے شباب ہی میں آپ کا کلام ملک کے مشہور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے لگا تھا۔ اس کا ثبوت مخزن۔ ادیب۔ اودھ پنچ۔ زمانہ وغیرہ کے پرانے فائل دے سکتے ہیں۔

خطوط

دیباچہ مکاتیب اکبر از محبوب علی صاحب

ارائے - خواجہ حسن نظامی ——— ہر خط کلیات اکبر کی ایک نظم کا ہم پلہ ہے

"حضرت اکبر الہ آبادی ادیبان دور حاضرہ کے سرتاج ہیں - ان کی ہر ادا خود ایجاد ہے بندش بولتی ہوئی تصویر مانی و بہزاد ہے۔ ان کی تحریر مختصر ہوتی ہے مگر اپنے اندر جذبات کے سمندر اور واقعات کے زمین و آسمان رکھتی ہے اس پر جدت۔ ذہن افگنی۔ عام فہمی کے جوہروں سے لبالب"

"آزاد کا درجۂ انشا پردازی سوائے اکبر الہ آبادی کے اپنے عہد میں سب ادیبوں سے بڑھا ہوا ہے۔

خود حضرت اکبر کی رائے

شرف الدین احمد صاحب مجھ کو بھی برابر لکھ رہے ہیں کہ آپ کے مزاج اور شان کے خلاف کوئی نہو گا میں نے لکھا کہ یہ اہم اشان اور مزاج کی کیا بات ہے۔ تشویش مصلحت پولیٹیکل نزاکت۔ لٹریری صحت ان باتوں کا خیال ہے پرائیوٹ تحریروں میں زیادہ خیال نہیں رہتا۔"

"زیادہ تر خیال پولیٹیکل امور کا ہے دوسری بات یہ ہے کہ کسی پر طعن اور عیب جوئی نہ ہو احتیاطاً لکھتا ہوں مغلوب الاوہام ہو جاتا ہوں۔ ورنہ میں تو اظہار مصائب یا داد سخن دینے کے سوا خود کچھ نہیں لکھتا۔ جو بات دل ہی میں نہو کیا سامنے آئے"

سید محبوب علی صاحب

"پیش نظر مجموعہ مکاتیب، مرتب صورت میں بہت ہی قابل قدر چیز ہے۔ اس میں مرحوم کے معتد بہ عمر کے سادہ بے لوث خود نوشت سوانح ہیں۔ اخلاق وعادات ہیں۔ واردات وحالات زمانہ پر تبصرہ ہے کچھ سبق ہیں کچھ عبرتیں ہیں۔ علمی و ادبی مسائل پر سنجیدہ خیالات ہیں کچھ تحقیقیں ہیں کچھ سود مند قابل عمل اسکیمیں ہیں اور بے تکلف الفاظ دلنشین پیرایہ میں

خیالات ظاہر کرنے کی ایک وسیع شاہراہ ہے جس میں دریا سے بھی زیادہ اور بہتر سلاست وروانی ہے بزلہ سنجیاں ہیں۔ نکتہ نوازیاں ہیں۔ کہیں کہیں "مرگ طویل النزع اور عشرہ ہیجان رفارم" ایسی دلفریب و بے نظیر اختراعیں ہیں۔ ادب کے ہزاروں بانکپن اور سادگیاں ہیں جن کی گنجائش میرے ضبط تحریر میں نہیں۔

دیباچہ خطوط اکبر

خواجہ حسن نظامی :۔ "حضرت کی احتیاط اصول حیات کے موافق تھی"۔

"ناقابل اشاعت خطوط میں بڑا حصّہ میری تلقین باطنی کے متعلق ہے — دوسرا حصہ حکومت اور پبلک کے چند مخصوص اشخاص کے متعلق ہے۔ تیسرا حصہ ملک کی مخصوص مذہبی و تمدنی بحثوں کی نسبت تھا اور ان میں چند نامزد اشخاص کی ذاتیات کا ذکر آتا تھا"

غرض ایک بڑے دریا کا ایک چھوٹا قطرہ منتخب کر کے شائع کیا جاتا ہے جو باوجود کمی کے اس قدر دلچسپ، بلیغ اور سبق آموز ہے کہ اُردو زبان صدیوں اس کے وجود پر فخر کرے گی اور آیندہ نسلیں اس کو درس کے طور پر پڑھا کریں گی"

"شمس العلما مولوی محمّد حسین آزاد کے خطوط میں زبان کی خوبیاں ہیں اور بے ساختگی کا انداز ہے۔ مرزا غالب کے خطوط میں انتہا درجہ کی سادگی اور بے ساختگی ہے اور جدّت ہے اور فلسفیانہ باریکیاں خاص ودلچسپ انداز سے بیان کی گئی ہیں مگر اکبر کے خطوط میں یہ باتیں بھی ہیں اور ایک خصوصیت سب سے اعلیٰ ہے کہ بہت بڑے مضمون کو دو لفظوں میں ادا کر جاتے ہیں اور کسی بات یا کسی شخص سے اختلاف کرتے ہیں تو ان کی بلاغت ایسا کمال کرتی ہے کہ لطف آجاتا ہے — جس کے خلاف لکھتے ہیں وہ بُرا نہیں مانتا ۔ الفاظ کی بندش ہی اس قسم کی ہوتی ہے کہ ناگوار خاطر نہو"

"خطوط میں ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ ان کا ہر مخاطب یہ خیال کرنے لگتا تھا کہ مجھ پر

حضرت کی خاص نظر عنایت ہے۔ وہ خالص مشرقی آداب ورکھ رکھاو کے مطابق خطوط لکھتے تھے اور ہر شخص کو اُس کی حیثیت سے زیادہ خوش کرنا چاہتے تھے۔"

"ہندوستان میں مختلف الخیال حضرات کی کثرت ہے۔ اس واسطے خطوط کا مختلف الخیال ہونا لازمی ہے۔"

"حضرت اکبر دیسی قلم اور دیسی سیاہی سے خط لکھتے تھے اور جواب دینے میں دیر نہ کرتے تھے۔

دیباچہ رقعات اکبر

سر شیخ عبدالقادر:۔

مرحوم ایسے کثیر الاحباب اور بااخلاق بزرگ تھے کہ ملک کے ہر حصے سے شائقین ادب اُردو ان سے خط وکتابت رکھتے تھے اور وہ باوجود پیرانہ سالی اور ہجوم امراض کے رسم مراسلت میں خلل نہ آنے دیتے تھے۔ گو یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ نثر کی خوبی یا خیالات کی گوناگونی میں یہ مکتوبات اس پایہ کے ہیں جو غالب کے اُردو خطوط کو حاصل ہے یا ان میں مکتوبات آزاد کا سا لطف آتا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ جب کبھی حضرت اکبر کی طبیعت پریشانی اور افکار سے آزاد ہوتی ہے تو ان کے خطوط پڑھنے اور سنبھال کر رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ حضرت اکبر اپنے زمانہ میں ان معتنم حضرات میں تھے جن کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ آگے چل کر عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اُن کے ایک مختصر سے رقعے میں ان کی طبیعت کی جھلک غیر معمولی شخصیت کا پرتو اور ان کی محبت اور دوست پروری کا اظہار موجود ہے۔ مذہب کا صحیح مفہوم جو ان کے دماغ میں تھا اور جس طرف وہ جابجا اپنے رقعات میں اشارے کرتے ہیں انتہا درجے کا سبق آموز ہے۔ تاریخ ادب اور تحفظ سوانح عمری کے لحاظ سے یہ چھوٹے چھوٹے رقعے جو اس مجموعہ میں پیش کئے گئے ہیں آیندہ نسل کے صاحبان ذوق کے لئے بے بہا سرمایہ تنقید و استدلال ہوں گے۔"

اقتباسات

رقعات اکبر مرتبہ ہمایوں شائع شدہ لاہور

بنام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

(۱)

صفحہ ۱۰ ۲۵/۴ ۱۵

"زندگی ہے جس کا میں زیادہ مشتاق نہیں ہوں تو کبھی ملنا تو ہوگا"

(۲)

صفحہ ۱۲ ۵ر اکتوبر ۱۶ء

"مدت سے ارادہ تھا کہ داد سخن کی شکرگذاری کروں آج ساعت تھی کہ قلم اُٹھایا میرے خرافات نے مجلس علما و فقہا سے داد پائی۔ اس کو اپنی ارتقا سمجھتا ہوں۔"

(۳)

صفحہ ۱۳ ۵ر اکتوبر ۱۶ء

"شب گذشتہ آپ کا کارڈ مجھ کو ایسے وقت میں[1] ملا کہ میں دو مہینے کے قیام کے بعد یہاں آرہا تھا۔ گویا ٹکٹ بدست[2] تھا ــــ ماجد صاحب اس وقت تشریف فرما تھے۔ پیامِ شوق و حسرت اُن کے سپرد کیا۔

(۴)

صفحہ ۱۴ ۲۱ر فروری ۱۹۱۶ء

"آپ کے طرز سخن سے جو آگاہ ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ نے میرے ناچیز کلام کی نسبت جو ریمارک کسی تحریر سابق میں کئے تھے وہ میرے لئے باعث فخر ہیں۔ میں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ ممکن ہے کچھ غلط فہمی ہوئی ہو۔"

---

[1] میں زائد ہے اور فصاحت سے گرا ہوا ہے [2] پا بہ رکاب کی جگہ "محاورات کو بدلیں براہ ریل جناب ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پا بہ رکاب

(۵)

صفحہ ۱۵

"خواجہ حسن نظامی صاحب کے محرم نامے کے متعلق آپ کی تحریریں دیکھیں۔ اظہار مدعا میں جو لطافت و نزاکت ہے آپ ہی کا حصہ ہے۔ خواجہ صاحب صوفی نہاد بزرگ ہیں ان کے کاموں میں کچھ روک ہے۔ دنیا کا تعلق ضرور تھا مذہبی ہسٹری پر جھک پڑے۔ بسید عقیل میرا پوتا ہے۔ دس برس کا سن ہے۔ میں عشرت سے کہتا ہوں کہ اس کو عربی پڑھاؤ۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ندوے میں داخل ہو اور اس کی نگرانی کے لئے ایک مولوی صاحب بھی ساتھ رہیں۔ کوئی عزیز بھی رہے، کچھ انگریزی تعلیم بھی ہوتی رہے" میرا یہ حال ہے کہ زندگی بار ہے ؎

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا　　اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اب اس وقت ان کی عمر ۱۹۳۱ء میں ۲۲ کی ہے نہایت ذہین ہیں طباع ہیں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس ہو چکے ہیں۔

(۶)

صفحہ ۱۶ و ۱۷

"خدا جانے خواجہ صاحب کی غلطی ہے یا پالسی یا عقائد میں تبدیلی بہرکیف خواجہ صاحب میرے بڑے عنایت فرما ہیں۔ میں آپ کی مدح میں مبالغہ نہ کروں گا کہ آپ کو تصنیف شعر کی زحمت ہو۔ یہی کہوں گا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ اسی سبب سے آپ کا مشتاق رہتا ہوں کہ کچھ سیکھوں۔ میرے ایک دوست نے میرا حال دریافت کیا تھا میں نے یہ شعر لکھ دیا ؎

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑا ہے حال　　کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

انہوں نے بیحد پسند کیا۔ ہمدم میں میرے چند شعر چھپے ہیں صواب کی جگہ ثواب کردیا ہے۔

بس یہی فقرہ کہ شام ہجر نے مارا اسے + کوئی کہہ آتا تو کتنا مختصر پیغام تھا (ثاقب) کتابت کی غلطی سے موصوف کو بہت تکلیف ہوتی تھی

(۷)

صفحہ ۱۸　　۱۲ مئی ۱۹۱۶ء

آپ کے اشعار نے میرے داغ دل ہرے کردیئے، ہرے تو رہتے ہی ہیں یہ کچھ لہلہان کردیئے۔

جوش غم نے آپ سے ایسے مصرع کہلا دئے ع شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہوا ع وہ گیا اور بپا دہر میں محشر نہوا ـــــ ورنہ صرف علمی قابلیت اور قوت قافیہ پیمائی کافی نہیں۔

مکتوب الیہ کی بیوی نے ۱۹۳۰ء میں وفات پائی تھی انہیں کی یاد میں سلیمان صاحب نے یہ موتی بکھیرے تھے۔

حضرت اکبر کا معیار شعر گوئی کیا ہے ؟

(۸)

صفحہ ۱۹ ۲۸ مئی ۱۹۱۰ء

"انتخاب میں سخت الجھن ہوتی ہے۔ چند شعر مسودے سے نقل کرا کر بھیجتا ہوں بہ تدریج غور و ترمیم کے بعد شائع فرمائیے یا نا پسند کر دیجئے۔ بقول مولانا شبلی مرحوم کے جو کہنا تھا کہہ چکا۔

کوئی بیکس رہ نہیں سکتا زماں جارج میں لیڈیوں نے لے لیا واعظ کو اپنے چارج میں

منصف مزاجی اس کا نام ہے۔ (منجملہ اشعار مرسلہ)

(۹)

صفحہ ۲۱ ۱۷ جون ۱۹۱۰ء

"حواس پر اعتبار نہیں رہا ڈرتا تھا کہ کسی تحریر سے کچھ غلط فہمی ہوئی۔ شکر ہے کہ آپ کے خط سے اطمینان ہوا۔

(۱۰)

صفحہ ۲۲ و ۲۳

"کل جو نظم بھیجی ہے اس میں شعر اوّل کے مصرعہ ثانی پر نشان بنا کر حاشیہ پر یہ آیت دیجئے۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سیجعل لھم الرحمٰن ودّا۔

ترجمہ بھی کر دیجئے گا۔

اور اس مصرعہ پر

"کاٹو یہ وقت اپنا طعنوں میں اور گلوں میں" نشان بنا کر حاشیہ پر یہ آیت لکھ دیجئے

لا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔

(۱۱)

میری شاعری کا مزا تو آپ کے اُستاد مرحوم کے ساتھ اُٹھ گیا زمانہ بھی بدل گیا اور بدلتا جاتا ہے۔ (حضرت شبلی نعمانی)

(۱۲)

صفحہ ۲۳

اچھا کیا آپ نے ابھی وہ نظم رحماء بینہم شایع نہیں کی۔ دو چار مہینے التوا بہتر ہے۔ ہیجان نفسانیت اور بدگمانی ذرا کم ہو اگرچہ وہ نظم نہایت بے گناہ ہے۔

صفحہ ۲۴

"ستارہ صبح" بند ہو گیا "آفتاب" نکلا۔ لطیفہ ذہن میں آیا کہ ابراہیم اس سے بھی مطمئن نہیں وجاہت حسین صاحب (اخبار مذکور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر) کا خط آیا ہے آپ دیکھ رہے ہیں ہم لوگوں پر کیسا نازک وقت ہے۔

(ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستاروں کو پھر چاند سورج کو پھر اور مادی چیزوں کو خدا کہا اور ہر ایک کو اپنی خداداد قابلیت استدلال سے رد کرتے گئے آخر معرفت حاصل ہو گئی اسی طرف اشارہ ہے)

مولوی ظفر علی خاں نے نظربندی سے رہا ہو کر آفتاب نکالا زمانہ نظربندی میں ستارہ صبح نکالا تھا۔

(۱۴)

صفحہ ۲۸ ۱۳ر جون ۱۹۱۸ء

"غم نے جو میری حالت کر رکھی ہے اور جن آلام میں مبتلا ہوں اگر آپ کو معلوم ہوں تو تعجب کیجئے کہ جس قدر حواس باقی ہیں یہ بھی کیوں باقی ہیں"

(۱۵)

صفحہ ۲۹ و ۲۷ یکم ستمبر ۱۹۱۸ء

آپ کے حالات و خیالات آپ کو ترقی مراتب انسانی کی طرف لئے جاتے ہیں اور یوں تو کلرکوں کی لائن دنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے ——— آپ سے ملنا ہوتا تو انتخاب اشعار میں مدد ملتی مسودے بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں۔ مجھ کو تو ضعف و علالت نے بہت معذور کر رکھا ہے۔

جرأت سفر کم ہے۔ کیوں نہ ہفتے عشرے کو آئیے۔ بل سفر خرچ میرے ذمہ۔

(۱۶)

صفحہ ۲۷ و ۲۸ ۳ر دسمبر ۱۹۱۸ء

"تعلقات کی نزاکت اور پولٹیکل انتشار کی حالت نے بالکل افسردہ کر دیا ہے۔"

(۱۷)

صفحہ ۲۸ ۲۷ر مئی ۱۹۱۸ء

"آپ نے ملا و صوفی کی نظم کو خوب زندگی بخشی اقبال صاحب (سر محمد اقبال) اس سے خوش نہوے۔ خط آیا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کس حق سے وہ ملا بنتے ہیں۔ میں تو صوفی بنتا نہیں شاعری کا کچھ مذاق ہے اگرچہ بقول آپ کے شاعری اور تصوف اور فلسفہ سب ایک ہے۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں جس کے معنی ہوئے شخصی یہ لفظ مغربی معتوں نے استعمال کیا ہے بمقابلہ فلاسفہ کے خدا کے۔ جس کا وجود عالم ہی کے ساتھ اور اسی میں طاری و ساری ہے الگ نہیں ہے۔ اقبال صاحب کا مطلب ہے کہ ہندو فلاسفی الگ خدا کو نہیں مانتی اور صوفی بھی ہمہ اوست کہتے ہیں لیکن میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں۔ اس بات میں آپ نے صحیح لکھا ہے کہ یہ بحث ہی نہ کرنا چاہیئے اسی نے اختلاف ڈالا ہے۔ جو قرآن میں ہے وہی کہو، پرسنل گاڈ کہنا اتنا ہی بے جوڑ جس قدر ہمہ اوست کہنا۔ بلکہ ہمہ اوست میں تو ایک بات ہے۔ عربی الفاظ اور قرآن کی اصطلاح چھوڑ کر پرسنل گاڈ کیا معنی۔ اقبال صاحب نیک نیتی سے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ پروفیسر بھی تو ہیں اور تماشا سنئے کوئی صاحب آصف نامی ہیں انھوں نے مسز سروجنی نائیڈو کے اشعار کا ترجمہ چھپوایا ہے عنوان یہ ہے "ہمشیرہ محترمہ" سروجنی نائیڈو ہیں۔ "خطیب" سے پوچھتا ہوں کہ ہمشیرہ کس قاعدہ سے لکھا گیا ہے۔ یہ رمارک اپنے مروجہ مراسم تمدن کے لحاظ سے ہے ورنہ ماں بہن کہنا تو اچھی بات ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو تو بہت نامور اور قابل تعریف ہے اس کا نوٹس آپ بھی لے سکتے ہیں۔

سلیمان صاحب کے سلسلہ مضامین "اہل السنہ" کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۸)

صفحہ ۳۱

کلکتہ کے حالات معلوم ہوئے ہوں گے۔ مسلمانوں کی حالت پر بڑا افسوس ہے اللہ رحم کرے۔ ہوسکے تو کچھ لکھئے۔

کلکتہ کے ایک اینگلو انڈین اخبار نے روضۂ نبوی کے متعلق جو ناپاک الفاظ لکھے تھے اس سے مسلمانوں میں جوش پیدا ہوا اور قتل و غارت تک نوبت پہنچی اسی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

(۱۹)

صفحہ ۳۲ و ۳۳ ۱۰ر ستمبر ۱۸ء

میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کدھر جارہی ہے۔ بہرحال۔ جس بات کو اپنے حق میں بہتر سمجھیں بشرط امکان بعد امکان اس کو کئے جائیں۔ میں تو اب اُکتا گیا ہوں۔ مفقود الخبر ہونے کا آرزومند ہوں آپ کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اشعار کہے تھے۔

ادھر جوانوں کو ہے سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں ادھر خواتین جلوت آرا ہنوز مُرت اپنی نوچ میں ہیں
مگر یہ قید حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک کہ گبرو ترسا کی لیڈیاں بھی شریکِ اعظا کی نوچ میں ہیں

اسلام میں اتحاد اور ترقی دکھایئے

سلیمان صاحب نے آزادیٔ نسواں کے متعلق معارف میں کچھ نوٹ لکھے ہیں۔

(۲۰)

صفحہ ۳۳ و ۳۴ ۲۸ر جنوری ۱۹۱۹ء

"دنیا دار المحن ہے۔ میرے لئے تو ہے آپ بھی سمجھے ہوں گے۔ سکونت کے لئے مستقل جگہ کا ٹھکانا نہیں جہاں اطمینان سے بقیہ عبرت آگیں زندگی بسر کروں۔ زمانے کا رنگ دیکھ کر دل بجھ گیا ہے"۔

(۲۱)

صفحہ ۳۴ و ۳۵

دن سے بائیں پانوں میں درد پیدا ہوگیا ہے۔ چلنا دشوار ہے۔ ہنوز کوئی تدبیر

سودمند نہیں ہوئی۔ شاید جراحت کی ضرورت پڑے۔ افسوس کہ آپ سے ملنا نہیں ہوتا ورنہ کچھ بار دل اُترتا۔

(۲۲)

صفحہ ۳۵ و ۳۶ ۲۷ مارچ ۱۹ء

یہ شعر مجھ کو بہت پسند ہوا۔

دو سہ گام گر پے دل بر بنشیں و دیدہ باشی ز چہا گذشتہ باشی بہ چہا رسیدہ باشی

پنجاب کے ایک کرمفرما دوست دوسرے مصرع کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں "زچہا گذشتہ باشی بہماں رسیدہ باشی"۔

کیا آپ کا کتب خانہ اس کا پتہ لگا سکتا ہے۔ میں نے تو سنا اور یاد رکھا ہے بلیغ اور بامزہ سمجھتا ہوں اپنی رائے بھی لکھئے۔ پرچہ نظام لاہور سے نکلا ہے باوجود میری تحریر کے۔ نامہ نگار صاحب نے اس کو قائم رکھا ہے میں اچھا نہیں ہوں کھویا کھویا رہتا ہوں۔

(۲۳)

صفحہ ۳۶ و ۳۷ ۱۹ اپریل ۱۹ء

"دو سال ہوئے مسٹر برن چیف سکرٹیری گورنمنٹ سے بمجبوری ملنا پڑا تھا۔ ان کو فارسی لٹریچر کا شوق ہے۔ سلسلہ مکالمت میں میں نے یہ اشعار اُن کو سنائے اور یہ بھی کہہ دیا کہ آپ تو اس کو قبول نہ کریں گے اور شاید کوئی اس کی تصدیق نہ کرے گا لیکن میری حالت یہی ہوگئی ہے"

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں راز دہر شکوہ ہے تو یہ اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

انھوں نے فرمایا کہ آپ نے سچ کہا میں بھی یہی خیال کرتا ہوں

(۲۴)

صفحہ ۳۷ و ۳۸ ۱۹ ۲۵

تین ہزار سے زیادہ نظمیں بیاضوں میں موجود ہیں۔ حصہ سوم کے لئے پبلک کا بڑا تقاضا ہے حیران ہوں کہ ترتیب و انتخاب کیونکر ہو۔ سوسائٹی کی خاطر ہے ورنہ طبیعت

دنیا سے بالکل بے تعلق ہو گئی ہے۔ کوئی مونس و غمخوار نہیں رہ گیا۔

رقعات بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن

(۱)

صفحات ۴۱ و ۴۲   ۹؎

عشرت سلمہ کا عقد ۳۰ مارچ روز پنجشنبہ پریاواں ضلع پرتاب گڈھ میں ہوگا۔ میں قائم مقام (ہوکر) ڈسٹرکٹ و سشن جج بنارس پر جا رہا ہوں۔ ناکارہ ہوں مگر مجبور۔

(۲)

صفحہ ۴۳

ندوۃ العلما چمن ہے تو آپ اس کے پھول ہیں اور اگر زیادہ بامعنی ہونا چاہوں تو آپ اس کے بلبل ہیں۔ میں نے آپ کی تصنیف کی بہت قدر کی نہ صرف اس سبب سے کہ "وہ محض انڈکس نہیں ہے جس میں علما اور کتب اور دیار و امصار کے نام لکھ دئے گئے ہوں جن سے اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہو کہ مولف مصنف کو بہت سی کتابیں حوالہ دینے کے لئے میسر آئیں اور شاید ورق گردانی میں اس نے محنت بھی کی۔ لیکن پڑھنے والے کی عقل نہ بڑھے نہ دائرہ معلومات مفیدہ بجز اس کے کہ وہ مؤلف کو داد دے اور کچھ فائدہ حاصل نہ کرسکے"۔ بلکہ اس میں مغز بھی ہے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ مجھے تو فائدہ پہنچا۔ ارادہ کرلیا کہ زیادہ محنت کروں گا۔ آپ کی عبارت اکثر جگہ داد طلب ہے — اچھی جماعت کے ذکر سے آپ نے اپنی طبیعت کو بسا لیا اس کی خوشبو انشا اللہ آپ کی روح کو گود میں لئے رہے گی"۔

بنام سید افتخار حسین صاحب بی۔ اے رجسٹرار عدالت العالیہ جوڈیشلی اودھ

صفحہ ۴۴ و ۴۵ و ۴۶   (۱)   ۲۸ اکتوبر ۱۳؁ء

مستم از بادہ شبانہ ہنوز۔ بادہ شبانہ سے مطلب وہ حظ و لطف ہے جو تین چار دن

آپ کی برادرانہ بے تکلفی، مخلصانہ مہمان نوازی، عارفانہ خیالات، طالبعلمانہ ذوق تحقیق اور نستعلیق و بااوب زندگی سے حاصل ہوا حسرت ہوئی کہ اب تک ایسے بلند و پاکیزہ خیالات رکھنے والے قیصر باغ کے بلند و مصفا ایوانوں میں جاگزیں ہیں لیکن کُل شےءٍ یرجع الیٰ اصلہ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے) اس کی توجیہ کرتا ہے۔

مثل ہے کہ "تین دن مہمانی بعد ازاں صدقہ" آپ کی محبت برادرانہ اور نوازش کریمانہ اور قدر شناسی شاعرانہ کی لذت ایسی ہے کہ ایک دن صدقے کی مد میں رہا۔ ابنائے زمانہ کے مذاق و مشاغل کو دیکھ کر احتراز اولےٰ نظر آتا ہے لیکن آپ کی مجالست و مکالمت غذائے روح ہے۔ جب وایسرائے نے شفقت پدرانہ کا اظہار کیا تو والان اور زیرین زمیں کی بحث کیا ؎

لاٹ صاحب ہی جبکہ باپ بنے　　　خواہ مسجد ہو خواہ شاپ بنے
گا رہے ہیں خوشی میں یاد و خنگ　　　مولوی شد رہا ز قید فرنگ

صفحات ۴۷ و ۴۸　　　(۲)　　　۲۳ دسمبر ۱۳ء

آپ کے خط کی کیا اچھی نیچرل اور معنی خیز عبارت ہے آپ نے بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھا ہے لیکن مرقع بلاغت ہے کیوں نہو "زہر جنس در نفس پاکش علوم" علم بھی خوب ہے دل بھی خوب ہے آپ کے اس فقرے پر کہ توجہ الی الموت البتہ ہے مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا ؎

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو　　　حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

یاد مرگ تو عجب چیز ہے۔ کچھ نہ پوچھئے کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے۔

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا　　　شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

صفحہ ۴۹ و ۵۰　　　(۳)　　　۱۲ اپریل ۱۴ء

میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو شخص بادۂ غفلت سے مخمور نہیں ہے اپنے مستقبل کی تاریکی میں گم ہے ۔۔ اپنا کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ اپنا کوئی نہیں سب بیگانے ہیں دوسرے یہ کہ آپ اپنا منہ کھولئے پہلے میں نے آپ کے شعر کے اوّل معنی سمجھے اور متامل ہوا لیکن فوراً دوسرے معنی ذہن میں آ گئے اور پھر رک گیا۔۔ محمد نسیم صاحب (ایڈوکیٹ لکھنؤ) حال ہی میں آئے تھے مجھ کو مغموم دیکھ کر بہت اصرار سے لکھنؤ آنے کا وعدہ لے گئے۔"

صفحہ ۵۰ و ۵۱ (۴) ۲۷ مئی ۱۹۴۱ء

الہ آباد میں تو قیامت کی گرمی ہے۔ ان روزوں ایسی فکر میں ہوں کہ کلیات کا چوتھا اڈیشن چھپوا دوں تیسرا اڈیشن بھی ختم ہوگیا اور مانگ باقی ہے۔ تیسرے حصہ کے لئے بھی مواد تیار ہے اب تو اس سے بھی دل گھبراتا ہے۔ کہنے سے نہیں چھپوانے سے لیکن پبلک کی خواہش کی رعایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بزرگان دہلی نے دعوت و شرکت انجمن پر اصرار کیا تو یہ شعر ذہن میں آیا ؎

بگزار بحال خودم اے بزم تعلی	عبرت زدہ را کار بہ آرزدگاں نیست

آرزدہ کی ترکیب کو ملاحظہ فرمائیے گا۔

صفحات ۵۲ و ۵۳ (۵) ۱۸ جون ۱۹۴۱ء

آپ کے خط کے ساتھ ابر رحمت بھی پہنچا۔ وہ تکلیف خارجی گرمی کی تکلف جاتی رہی لیکن عفرائے محترقہ کا ہیجان ہوگیا ہے۔ ضعف ہے دل مایوس سے کچھ مدد نہیں ملتی ایک قدرتی مشین ہے چلی جاتی ہے ؎

اب میری زندگی میں نہیں نور انبساط	یہ شمع جل رہی ہے مگر ہے بجھی ہوئی

یہ شعر کل کہا تھا ایک شعر یہ بھی کہا تھا ؎

افسوس جیٹھ ہی میں ہم چل بسے تڑپ کر	پانی پڑا مگر کب ؟ آدھا اساڑھ تپ کر

صفحہ ۵۶ (۷)

اس وقت ایک صاحب دفتر صاف و مرتب کر رہے ہیں آپ کا خط انبار میں ملا جس میں آپ کا یہ شعر تھا ؎

مٹا دیا ہے زمانے نے اس قدر ہم کو	کہ اب حریف بھی اپنا نظر نہیں آتا

اس کے ساتھ آپ کے ریمارکس بھی تھے یہ شعر ۱۰ اپریل شاید ۱۹۴۰ء کے افتخار حسین صاحب کا ہے آج آپ خدا جانے کن حالات میں ہوں گے اور کہاں ہوں گے مجھ کو اپنا ایک مطلع یاد آیا ؎

معاذ اللہ دور چرخ کیا کیا رنگ لاتا ہے	جنھیں آتا تھا ہم پر رشک اب ان کو رحم آتا ہے

آپ کو اپنے شعر پر یہ شبہ تھا کہ تیر نشانے تک نہ پہنچا ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ میرا تیر نشانے سے آگے نکل گیا۔ لیکن اقتضائے حالات یہی ہے۔

صفحات ۵۸ و ۵۹ (۹) ۳۱ر اکتوبر ۱۸ء

حصہ سوم کلیات کا پبلک کی طرف سے تقاضا ہے۔ ہنوز منتخب و مرتب نہیں کر سکا۔ اس کے لئے ذی علم ماہر سخن اور زمانہ شناس کی ضرورت ہے۔ پھر چھپوانا بھی دردسر ہے۔ عشرت سلمہ کو میں نے کاپی رائٹ دے دیا ہے لیکن ان کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں ہے دہلی ولاہور میں کچھ لوگ خواستگار ہیں لیکن وہ بہت دور ہیں۔

صفحہ ۶۰ (۱۰) ۶ر دسمبر ۱۸ء

۷۵ سال قمری سے عمر متجاوز ہو چکی۔ چوں نگہ می کنم نماند بسے۔ صدہا اشعار آپ کے سننے کے قابل ہیں۔

سب کو یہ مسلم ہے کہ معبود وہی ہے کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے

۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔ کے نزدیک کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

صفحات ۶۱ و ۶۲ و ۶۳ (۱۱) ۵ر اپریل ۱۹ء

"مجھ کو تو اس بات پر فخر ہے کہ آپ نے محض قابلیت سے اعتبار پیدا کیا اور ترقی حاصل کی کبھی آپ کو تماشا گروں کے اسٹیج پر نہیں دیکھا۔ میرا اصول یہی تھا اور ہے۔۔۔

۔۔۔ جاورے اور حیدرآباد سے شدید تحریک و تشویق ہو رہی ہے دل ہی نہیں چاہتا لکھنؤ میں محض بخیال راحت الگ انتظام کرتا ہوں لیکن بسا اوقات ناخواستہ ملاقاتوں سے پریشان ہو جاتا ہوں۔۔۔ عمر ۷۵، آلام ایسے عوارض کا یہ حال کہ ۱۸ گھنٹے باوقات مختلف تکلیف وہ احساس بوجہ ضعف اعصاب کے ہوا کرتا ہے اور سمجھتا ہوں کہ نزع قریب ہے۔ ہمنشینوں کو یہ حالت نہیں معلوم ہوتی ہے ہنسی آتی ہے کہ رشتۂ حیات بھی تا نت ثابت ہوا کرتا ہے لیکن دم بھر کو بھی اس کا اعتبار نہیں۔ میرا تو یہ شعر میرے حسب حال ہے۔

دنیا سے تعلق کیا رکھوں کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لئے
دل کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کے دن کے لئے اور کس کے لئے

ایک صاحب شورش موجودہ پر نظم کے طالب ہیں بحق گورنمنٹ دل چاہتا ہے یہ لکھ کر بھیج دوں۔

کمر خموشی پہ ہم نے باندھی کماں کے روکٹ کہاں کے گاندھی غبار عبرت سے بند ہے آنکھ چل رہی ہے فنا کی آندھی

صفحات ۶۳ و ۶۴ (۱۴) ۱۰ر جولائی ۱۹ ء

آپ کا خط پڑھ کر اسی پر یہ شعر لکھ دیا۔

اس میں کیا شبہ ہے محنت تو ہے اور کام تو ہے ساتھ ہی اس کے مگر زر تو ہے اور نام تو ہے

مطلب تو اس سے یہ تھا مگر قافیوں نے اُلجھا لیا۔

شمع کافور کو گو لیمپ نے کافور کیا نور خاطر کو مگر پر تو اسلام تو ہے

فرق معنے نہیں اُردو ہو کہ ہندی ہو لغت ماگھ میں دھوپ تلفظاً سہی گھام تو ہے

کیوں ہو شیطاں کی طلب بہر سرور ہستی عشق کی مے تو ہے اور دل کا مرے جام تو ہے

حصہ سوئم کی تہذیب و ترتیب میں مصروف ہوں مشیر کوئی نہیں قریب ۲۶۰۰ کے نظمیں ہیں

یہ کے۔بی کا تعلق ہو گیا کیوں نام اکبر سے کھٹکتے ہیں فرشتے اس گزٹ آلود آنر سے

گزٹ آلود کی داد دیجئے۔"

کے لئے کی جگہ K. B. خان بہادر.. K. B. اکبر کے حروف بھی ہیں۔

صفحہ ۶۵ (۱۴)

"میں کھاتا کیا ہوں خوان احتیاط سے ریزہ چینی کرتا ہوں — لہٰذا کھانے کو تو ملتوی رکھئے۔

میں انشاءاللہ بشرط زندگی و توانائی و درستی ہوش و حواس اور نہ واقع ہونے کسی آفت ارضی و سماوی کے کل آٹھ نو بجے صبح کے حاضر ہوں گا۔"

اقرار نامہ قانونی کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔

صفحہ ۶۷ و ۶۸ (۱۵) ۷ر اکتوبر ۱۹ ء

"ضعف بہت ہے غذائے معمولی ہنوز نہیں ہوتی لیکن ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کچھ دن اور جینا ہے کم سے کم آیندہ کنوار تک میں نے ایک شعر کہا یہ لطیفہ ملاحظہ ہو۔

کمزوری مری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی اچھا رہا تو کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

مجھ سا مشکل پسند اور بے تعلق اور افسردہ دل بھی آپ کو نعمت سمجھتا ہے

صفحہ ۷۲ و ۷۳ (۱۶) ۹ر ستمبر ۲ ء

اختصار شب وصل کا آپ نے خوب خیال کیا۔ اس کے جواب میں یہ لطیفہ عرض کرتا ہوں

کہ اگر میرا خط شب وصل سے بھی زیادہ مختصر تھا تو یہ سبب ہے کہ وصل ملاقات ہے اور المکتوب نصف الملاقات مشہور ہے لہذا میرا خط نصف شب وصل تھا ـــــ زمانے کے انقلاب اور یاروں کے انتشار اور وابستگی کی راہوں کے انسداد نے دیوانہ کر رکھا ہے۔

رقعات بنام ہز اکسیلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب بہادر سی آئی ای۔ جی سی آئی ای۔ یمین السلطنت پیشکار و مدار المہام دولت آصفیہ نظام المتخلص بہ شادؔ

صفحہ ۷۵ (۱) ۲۷ راکتوبر ۱۹۱۴ء

"یہاں بھی ہندو مسلمان شیعہ سنی کی بحثوں نے پریشان کر رکھا ہے توحید اور صلح کل کے مسائل کو برابر بیان کرتے رہیئے اور ان پر زور دیجئے ـــــ پرسوں ایک مطلع ذہن میں آیا تھا۔ عرض کرتا ہوں شاید پسند فرمائیے۔

نہ مستقبل کی سنتے ہیں نہ کچھ ماضی کی کہتے ہیں ۔۔۔ جو اہل وجد ہیں وہ حال ہی کے ساتھ رہتے ہیں

یا یوں پڑھیے" حال ہی میں مست رہتے ہیں۔

صفحہ ۷۷ و ۷۸ (۳) ۷ رنومبر ۱۹۱۴ء

" دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ شرک ہے۔ اسی نے غیر خدا کو خدا بنا کر انسانوں میں تقسیم کر رکھا ہے ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا ۔۔۔ میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اس غزل کے دو تین شعر اور عرض کر دوں۔ ایسا سامع کہاں پاؤں گا۔

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں ۔۔۔ آرزو کوئی دل نے کی ہی نہیں

چاہتا تھا بہت سی باتوں کو ۔۔۔ لیکن افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأت عرض حال کیا ہوتی ۔۔۔ نظر لطف اس نے کی ہی نہیں

وقت ایسا نازک ہے کہ بدگمانیوں سے محفوظ رہنے کو لوگوں نے مکالمت و مجالست و زیارت احباب سے کنارہ کشی کو اولےٰ سمجھا ہے۔ خصوصًا وہ زبانیں اور وہ طبیعتیں جن پر

یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے　　بات کرنے میں عیب لگتا ہے

صفحہ ۸۹　　(۶)　　۲۶ نومبر ۱۴ء

بنی آدم ہمیشہ لڑیں گے مگر موحد دل ٹھکانے رہے گا۔ اور کیا کچھ ترقیاں ہوں اگر ول لگا رہے

صفحہ ۸۳　　(۷)　　۲۷ دسمبر ۱۴ء

"دُنیا کا کیا پوچھنا شان ظہور تو یہی ہے لیکن غفلت شکن اسباب اکثر عالم دل کو بدل دیتے ہیں

خواجہ صاحب کی خدمت میں تسلیم اسی کے ساتھ ایک لطیفہ بھی۔

خواجہ سے کیونکر نہ ہوتا پادری کو سوئے ظن　　پیر ہی بے دخل کرتا ہے سدا اتوار کو

اس زمانہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب شاد صاحب کے پاس تھے۔

صفحہ ۸۴ و ۸۵ و ۸۶　　(۸)　　۱۱ ستمبر ۱۲ - ۱۹

دنیا سے میں ایسا دل برداشتہ ہو گیا ہوں کہ کیا عرض کروں ۔اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے ؎

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا

مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

اڈیٹروں سے ناک میں دم ہے۔ بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا۔ ع بحمد للہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے

یہ اس وقت کہا تھا جب سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی دوسرا شعر صاف تھا ؎

بہت کی سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر　　بالآخر چرخ ان کے سر کو زیر سنگ لایا ہے

اڈیٹر نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلان جنگ منجانب برٹش ہو گیا۔ ان پر اعتراض ہوا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ہنوز کچھ نہیں کہا گیا۔ تاہم کلفت ہوتی ہے۔ اڈیٹر صاحب کی یہ بھی رکاکت ہے کہ ان کے نام پرائیوٹ چٹھی آئی تھی۔ انھوں نے اس کو چھاپ دیا۔ خدا ان بلاؤں سے نجات دے سوسائٹی کا تعلق خوامخواہ مجبور کرتا ہے اگر تندرست ہوتا تو جنگل اور پہاڑوں میں بھاگ جاتا مجھ کو اب کرنا کیا ہے ؎

فکریں کبھی تھیں اس کی راحت مجھے بڑی ہو　　اب کہہ رہا ہوں یارب تکلیف میں کمی ہو

آپ کا ساتھ ہوتا تو عافیت میں گذرتی ـــــ اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ
دل کی جو خواہش ہے وہ سامان ہونے کا نہیں   الغرض دنیا میں اطمینان ہونے کا نہیں

صفحہ ۸۸   (۱۰)   ۱۴ر جون ۱۵ء

میری ایک نو تصنیف غزل کا ایک شعر یہ ہے۔
گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ لیکن   کس سے کہئے کوئی مستفسر حالات تو ہو
دعا فرماتے رہئے کہ سکون خاطر میسر ہو اصل چیز یہی ہے۔

رقعات بنام شرف الدین احمد خاں صاحب مصنف خیالات مؤلف سرگذشت بو علی سینا

صفحہ ۹۳، ۹۴   (۳)

"آنکھوں کی شکایت نے معذور کر رکھا ہے۔ حرف صاف دکھائی نہیں دیتے۔ بہ ضرورت شدید قلم اُٹھاتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ اپنے مزخرفات پر اب تک نظر ثانی نہیں کر سکا۔ جو کلام میرا شایع ہو چکا ہے اس کو ادھر ادھر سے چھاپ دینے میں اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور شاید کسی مطبع کو حق اعتراض بھی نہیں ہے۔"

صفحہ ۹۴   (۴)

آپ کا ترجمہ بہت اچھا ہے۔ میرے خط کی کیا ضرورت ہے ناظرین خود ہی دیکھ لیں گے۔

صفحہ ۱۰۲   (۱۴)   ۲۱ر اپریل ۲۰ء

جہاں تک نوشت و خواند کو تعلق ہے پوری روشنی آ گئی۔ سوسائٹی سے ملنے جلنے اور چلنے پھرنے کے لئے کافی روشنی ہے۔

صفحہ ۱۰۳   (۱۵)   ۲۶ر جون ۲۰ء

وحید کی ناکامیابی کا سخت افسوس ہوا۔ اس بے چارے پر جو الزام چاہئے لگائیے میں تو اس قدر زیادہ ناکامیابیوں کو سررشتہ تعلیم کی پولٹیکل پالیسی سمجھتا ہوں۔
سیاسی مصلحت۔

صفحہ ۱۱۰ (۲۲) ۱۶ر اگست ۱۳ء

"لیٹر فرام دی ہل" Letters from the Hell کا ترجمہ آپ نے کہاں تک
کیا — اب تو ان مضامین سے مجھ کو زیادہ دلچسپی ہے۔

جہنم سے آئے ہوئے خطوط۔

صفحہ ۱۱۴ (۲۷) ۱۶ر جنوری ۱۵ء

"کیا بتاؤں کس عالم میں رہتا ہوں ہر روز دس پانچ مرتبہ ایک شعلۂ حسرت سینہ میں مشتعل ہو کر دل کو جلاتا اور مجھ کو تڑپاتا ہے۔ خودکشی ناجائز اور زندگی بے حلاوت!"

مرگ ہاشم کی وجہ سے صفحہ ۱۱۵ (۲۸)

"قرآن بہت پڑھا کیجئے اور تسکین حاصل کیجئے"

صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹ (۲۹) ۱۳ر جولائی ۱۶ء

"پانوں کے نیچے آگ ہے اور آگے اندھیرا۔ کھڑا رہوں تو پانوں جلتا ہے اور آگے بڑھوں تو معلوم نہیں کہاں جا پڑوں"۔

رقعات بنام آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا
سابق وزیر تعلیم پنجاب

صفحہ ۱۲۱ (۱) ۲۱ر جون ۱۰ء

کوئی ذرہ تو اس کا تا بہ دامن اُڑ کے پہنچے گا   یہ مشت خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں (آتش)

کوئی تو ان میں کا پہنچے گا اس دست مبارک تک   یہ دو اک کارڈ اس کی راہ میں برباد کرتے ہیں

صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴ (۳) ۲۰ر نومبر ۱۱ء

"الحمد للہ کہ قرآن مونس تنہائی ہے — اس وقت اشعار ذیل گذارش کئے جاتے ہیں کہیں چھپے نہیں لیکن بعض صاحبوں نے ان میں بعض کو سنا اور بہت پسند کیا۔

مشرقی کو ہے ذوق روحانی   مغربی میں ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱ (۹) ۱۲ اپریل ۲۱ء

مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی۔ مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا ؎

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی او لے

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں ؎

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی گیاہ کا سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کے واہ کا

میں تو زندگی ختم کر چکا اور ہمیشہ ادھر سے بے نیاز رہا ؎

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے حسن بے حد ہے خودی محدود ہے

میرا مطلع پیش نظر رکھے۔

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے — خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے اور باہم ہمدردی عطا فرمائے۔

مکاتیب اکبر بنام جناب مولانا عبدالماجد صاحب ۔ بی ۔ اے
مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ

صفحہ ۵۰۴ (۲) یکم دسمبر ۱۳ء

آپ ملا نوخیز ہیں شعر کی قدر زیادہ نہو گی لیکن واقعات موجودہ کے لحاظ سے شاید ان اشعار کو ناپسند نہ کیجئے

شیخ صاحب تو یہاں فکر مساوات میں ہیں بھائی صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں
قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں حرف آخر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف بس ہمیں اس زرولیوشن کی خرافات میں ہیں

مسجد کانپور کے متعلق بلوہ اور گرفتاریاں۔

صفحہ ۷ (۴) ۱۴ ستمبر ۱۹۱۳ء

"لوگ کہتے ہیں ابوالفضل کیوں نہیں پیدا ہوتے میں کہتا ہوں کہ اکبر پیدا ہوں تو وہ بھی پیدا ہوں۔ یہ میرا خیال ضرور ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جائے زیادہ تبحر چاہیئے کیونکہ سمجھنے سے سمجھانا مشکل ہے۔"

منطقی شاید کہتے ہیں کہ بلامدد الفاظ خیال نہیں ہو سکتا لیکن مجھ کو تو غم بلامدد الفاظ ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۱ (۶) ۲۴ ستمبر ۱۳ء

آپ کے دوست الہلال کا زر ضمانت ضبط ہوگیا ؎

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر دور فلک ہلال کو لایا صلیب پر

صفحہ ۱۴ (۱۱) ۱۱ اکتوبر ۱۳ء

"نہیں معلوم اس وقت کیا پہلو اختیار کرنا چاہیئے کہ قوم و گورنمنٹ دونوں کی بدگمانی سے حفاظت ہو۔"

صفحہ ۱۷ (۱۴) ۲۸ مئی ۱۴ء

"سخن دلکش بہت ہیں، سخن سنجیدہ کے لئے بہت سمجھ چاہیئے۔ میرا ایک مطلع سن لیجئے ہے تو اور ہی رنگ لیکن آپ کچھ حظ حاصل کر سکیں گے۔

بہت دشوار ہے شائستۂ راہ طلب ہونا نظر کو حد میں رکھنا شوق دل کا باادب ہونا

صفحہ ۱۷ (۱۵) ۳۱ مئی ۱۴ء

"امانت رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے اس رقم کی بساط ہی کیا ہے۔ اپنے دلی خلوص اور ہمدردی کو میرے لئے امانت رہنے دیجئے۔

الحمد للہ کہ آپ صرف تحریر میں خط اقلیدس ہیں برتاؤ میں شاخ گل ہیں۔"

صفحہ ۲۱ (۱۶) ۱۱ نومبر ۱۴ء

میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

لہ فلسفہ جذبات کی قسمت۔

صفحہ ۲۲ و ۲۳ (۲۷) ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء

"براہ کرم تکلف کو دخل نہ دیا جائے - سادہ غذا شوربا چپاتی کھاتا ہوں اور وہ بھی بہت کم"

صفحہ ۲۳ (۲۵) ۲ جنوری ۱۹۱۲ء

"الغرض سب شعر اچھے ہیں - البتہ افزائش حسن کی گنجائش ہے طبیعت کا ذوق خود اس کو پیدا کرے گا جب عالم معنی کے استغراق سے طبیعت آسودہ و بے فکر ہو کر حسن و صورت کا مذاق پیدا کرے گی۔

ماجد صاحب کی دوسری غزل

صفحہ ۲۶ (۳۲) ۱۵

مرا ایک شعر ہے ؎

دنیا میں جیسے جو پیش آیا اکبر — بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

حالت میں خیالات اور میلان طبع کو داخل سمجھئے - پازیٹو سائنس مشغولی کے لئے خوب ہے لیکن ہمارے حصے میں نہیں آیا۔

۳۳

صفحہ ۲۶ و ۲۷

اس وقت آپ کا کارڈ دیکھ کر آپ کے ریمارک پر بے ساختہ ماشاء اللہ چشم بد دور کہتا ہوں اوّل تو یہ کہ وہ مسئلہ فلسفہ آپ کے ذہن میں تھا دوسرے (اور یہ بڑی بات ہے) یہ کہ آپ نے آپ کے ذہن نے میرے شعر کو فوراً اس فلسفے کے مطابق کر لیا۔

جب میں نے یہ شعر کہا تھا اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ ابتداءً ایک یونانی فلاسفر نے یہ مسئلہ بیان کیا تھا۔ اسی طرح جب میں نے یہ شعر کہا ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں — عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اور جس کی داد ڈاکٹر اقبال صاحب نے دی اس وقت مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ ہیگل نے اس خیال کو وسعت دی ہے لیکن فلسفہ ہے کیا۔

نتیجہ غور و فکر کا آپ نے صفائی بیان کی مجھ کو داد دی ہے — یہ صفائی بیان غالباً بلکہ یقیناً اس سبب سے آئی کہ میرا اوریجنل خیال تھا اگر تقلید یا ترجمہ کا سانچہ اس کو پیدا کرتا تو یہ بے تکلفی نہ ہوتی۔

Original = اصلی - اچھوتا - نیا -

صفحہ ۲۸ (۳۵) ۱۰ر ستمبر ۱۵ء

مثنوی اسرار خودی مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹاتے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت بڑا اثر ہوا صحیح نہیں ہے۔ خودی کو بڑھانا چاہئے مثنوی کی نسبت تو کچھ زیادہ کہنا نہ چاہئے کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے اشعار نہایت اچھے ہیں۔

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

یہ خودی ہستی و تصوف ہے۔ دیباچہ میں پولٹیکل دانشمندی بھی ہے۔ خطیب دہلی میں کسی صاحب نے میرے اشعار پر ایک بڑا ریویو لکھنا شروع کیا ہے۔ بہت مدح کی ہے لیکن میں اس کو غیر ضروری اور مضر سمجھتا ہوں۔"

صفحہ ۳۰ (۳۹) ۲ر فروری ۱۶ء

فلسفۂ اجتماع کا شکر گذار ہوں ــــ آخری فقرے خوب ہیں ان کو دیکھ کر میں نے یہ مطلع کہا۔

زباں پہ کیا ہو تری حمد اور ثنا کے سوا
مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں فنا کے سوا

قرب شادی میں فلسفہ اجتماع کی تصنیف خوب موزوں ہے۔ میں آپ کی اوریجنیلٹی Originality کو اصل چیز سمجھتا ہوں آپ کی کیا بلکہ سب کی۔

صفحہ ۳۲ و ۳۳ (۴۲) ۱۱ر فروری ۱۶ء

"قرآن شوق سے دیکھئے خوب دیکھئے، بہت دیکھئے یہانتک کہ بلا مدد ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگئے۔ تفسیروں کی تو حد نہیں۔ مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جائیے اور پھر پڑھئے، زیادہ نہ رکئے، پڑھتے چلے جائیے۔ ثواب کا عقیدہ نہ سہی۔ لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرے گی، مزا آئے گا، یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا جو اس وقت اور ان روزوں ذہن میں ہے کسی وقت اسی طرح کوئی اور آیت دامن دل کو کھینچے گی۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم + کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔

غور اور اسٹڈی اور کریٹیزم (Criticism تنقید) اور مضمون نگاری کے لئے قرآن مجید کو خاص طور پر جا بجا حسب مرضی دیکھنے کا کوئی اور وقت نکالئے۔

خدا قرآن کے رو سے قادر مطلق اور خالق کائنات ہے (ماجد صاحب نے لکھا تھا کہ ارسطو کے ایک خیال کے مطابق خدا کو محض علت العلل یا علت اولے ماننے پر کیوں نہ اکتفا کی جائے۔ قرآن سے غالبًا یہ پہلو تہی نکل آئے یہ سارا مکتوب اور اس کے بعد والا مکتوب اسی خیال کی تردید میں ہے)

ارسطو نے خدا سے کیا واسطہ ارسطو میں Classification اور Generalisation کی بے حد قوت ہے لیکن لیکن میں نے کسی فلاسوفر کو نہ دیکھا کہ اس کے معاصرین نے یا پیچھے آنے والوں نے اس کی تردید نہ کی ہو ؎

صدیوں فلاسوفی کی چناں اور چنیں رہی　　لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

میں خدا کا نام تو جانتا ہوں۔ خدا کا خیال ناممکن پاتا ہوں، ماسوا پیش نظر ہے، جہاں اس کا خیال آیا خیال خدا غائب ہو گیا۔ عبرت فنا اس سے دل کو ایک حزا ہے۔ مزاحسب استعداد بہت بڑھ جاتا ہے۔ مقر چپ ہے۔ منکر کو خبر نہیں۔

صفحہ ۴۴　　(۴۳)　　۲ر فروری ۱۶ء

کل میں نے بہت بے تکلفانہ آپ کو ایک خط لکھا۔ لیکن معافی چاہتا ہوں بہت کچھ اررلیونٹ (غیر متعلق) ہے آپ اپنا کورس خود خوب سمجھتے ہیں جو کچھ لکھا وہ سب واپس لیتا ہوں بجز اس کے کہ قرآن مجید میں صرف پرائم مودر ہمیں بلکہ خدا قادر مطلق ہے سورہ رحمان میں کل یوم ھو فی شان ملاحظہ فرمائیے اس کے سوا صدہا آیتیں ہیں۔ ثواب کے یہ معنی بھی سمجھئے کہ دل کو انبساط ہوا۔ کسی مسئلہ کا انکشاف ہوا۔ مجھے تو روزے کا ثواب افطار کے وقت مل جاتا تھا اب تو رکھ ہی نہیں سکتا۔

صفحہ ۴۸　　(۵۰)　　۲۴ر جون ۱۶ء

فلسفہ نے اگرچہ آپ کے اجزائے طبیعت کو مستحکم و مضبوط کر دیا ہے لیکن آپ موتی ہیں پتھر نہیں خدا موتی کی آب کو برقرار رکھے۔

صفحہ ۴۵　　(۶۱)　　۸ر دسمبر ۱۶ء

"انسائیکلو پیڈیا کا خیال مجھ کو مدت سے ہے لیکن ذرا اورجنیلٹی Originality ہونا چاہئے"

ماجد صاحب و سلیمان صاحب نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی تحریک کی ہے۔

صفحہ ۴۵ (۶۲) ۱۸ر دسمبر ۱۶ء

انسائیکلو پیڈیا کی خبر اخباروں میں چھپ گئی۔ پہلے مجھ کو اپنا یہ مصرعہ یاد آیا تھا ع

فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور مکاں کوئی نہیں

پھر میں نے اپنا یہ مطلع یاد کیا ؎

دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو لمبا قصہ ہے ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے

اس لحاظ سے آپ اور سید سلیمان صاحب راہ پر ہیں، سب کچھ ہو جائے یہ خدا کے ہاتھ ہے۔

یہ دو شعر بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے

خدا نے جو عبرت عطا کی ہو تم کو تو ملت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو

الوالعزمی راجہ صاحب کو سمجھو مذاق سلیمان و ماجد کو دیکھو

راجہ صاحب محمود آباد نے اُردو انسائیکلو پیڈیا کی تالیف و اشاعت کے لئے گرانقدر امداد کا وعدہ کیا تھا۔

صفحہ ۵۰ (۶۸) ۱۳/۲

بلینک ورس ؎ شیعہ سنی کا شغل تھا پہلے پھر مسلمان ہو گیا بندہ پھر رہا چند دن فقط انسان

اور بالفعل صرف نیٹو ہوں خرافات ہے مگر اسی سے دن کاٹتا ہوں۔

صفحہ ۵۳ و ۵۴ (۷۳) ۲۳ر مئی ۱۷ء

فلسفۂ نظام کا مضمون بہت صاف ہے ایسی بحثیں کہ خدا اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں مجھے ہمیشہ تعجب میں ڈالتی ہیں کیوں نہ یہ بھی پوچھا جائے کہ اللہ میاں خودکشی کر سکتے ہیں یا نہیں۔

صفحہ ۵۵ (۷۴) جون ۱۸ء

”آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ کوشش کیجئے گا کہ بیان صاف ہو۔ ابوالکلامی نہو۔ یہ سچ ہے کہ مباحث ہی پیچیدہ ہوں تو کوئی کیا کرے“۔

ہندوستان کا پالیٹکس بہت پیچیدہ اور مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے اُردو یونیورسٹی بھی اس میں داخل ہے ہندو کا ہوم رول اور ذوق ہندی بھی اسی میں داخل ہے انڈین کا فوج میں داخل ہونا بھی اسی میں داخل ہے۔ خدا وقت لائے کہ آپ کی تصنیفات الماریوں سے سینوں میں اور سینوں سے زبانوں پر پہنچیں۔

صفحہ ۶۵ و ۶۶ (۸۸)

"ظفر علی خاں صاحب سے ملئے تو میرا اسلام شوق کہئے وہ پر جوش مسلمان ہیں لیکن قوم کی ناک بھی ہیں"

صفحہ ۶۹ ۶ / جولائی ۱۸ئہ

۱۳ئہ ۱۹۱۳ء میں برگسن کا اکسپوزلشن شائع ہوا ہے۔ میرا تو دل اب نہیں لگتا کہاں تک ذہن کو قلا بازیاں کھلاوے افلاطون سے لے کر کانٹ ہیگل تک اور ہکسلے تک سب کا عروج وزوال دیکھا۔ لفاظیاں اور خیال آرائیاں میں برگسن کی یہی عمر ہے جو دلنشین ہو جائے وہی سب کچھ ہے۔ کہتا کہ اے دوست (برگسان مشہور فرنچ فلسفی) کی طرف سے جواب لکھئے مگر نہ موقع نہ ضرورت نہ تعلق آپ میں تو خود ریویو کی قوت ہے۔

صفحہ ۷۵ (۱۰۲) ۱۲/ مارچ ۱۹ئہ ء

فنا کا خیال گم کئے دیتا ہے شاید وہی اچھے ہیں جو یہ کہتے ہیں۔

ذہن صاحب رہیں قیاس کے ساتھ ہم تو فطرت میں ہیں حواس کے ساتھ

بہرحال بہت پیچیدہ مباحث ہیں۔

صفحہ ۷۹ (۲۸) ۱۰/ جون ۱۹۱۹ئہ ء

خبر آئی اسلامیہ میل میں اخوت کو جانا پڑا جیل میں

ابھی یہ شعر موزوں ہو گیا الفاظ کی مناسبت اور معانی کے پہلو ملاحظہ فرمائیے۔ میں تو بہت Innocent سمجھتا ہوں۔

معصوم بے ضرر۔ سادہ جو ہر سیاسی گرفت سے آزاد ہو۔

صفحہ ۸۰ (۱۱۰)

یہ فلسفہ کہ وجود در حقیقت ذہن ہی میں ہے۔ علم باری میں سب کچھ ہے ایسا صحیح فلسفہ ہے کہ میں اس کو کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام کی ایک صوفیانہ تفسیر سمجھ سکتا ہوں۔ کل من علیہا فان میں لفظ فنا سے ظاہرا یہی سمجھا جاتا ہے کہ بالآخر ہر شے کو فنا ہے لیکن ذہن کہتا ہے کہ بالآخر کیسا جب غور کرو اور حقیقت پر نظر ڈالو تو کل پر فنا حاوی ہے

ہو جاتی ہے صرف علم باری رہ جاتا ہے۔

صفحہ ۸۲ (۱۱۴) ۳ر جولائی ۱۹ء

آپ کے سامنے دو شعر پیش کرتا ہوں ؎

موت سے وحشت بشر کا اک خیال خام ہے — اصل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے

اس شعر کے متعلق ایک طویل بحث ہوئی ہے۔

غم میں بھی قانون فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں — یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

صفحہ ۸۵ (۱۱۹) $\frac{۲۷}{۸}$ ۱۹

لڑکی کو بہ نسبت لڑکے کے اس زمانہ میں بہتر سمجھتا ہوں۔ داماد اپنا ہوتا ہے بیٹا غیر کا ہو جاتا ہے

(ماجد صاحب کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی)

صفحہ ۹۰ (۱۲۶) $\frac{۵}{۱۰}$ ۱۹

ناتندرستی زندگی تلخ کر دیتی ہے میں تو اس کی نذر ہو گیا ہوں ؎

خلق مجھ سے طالب پابندی اخلاق ہے — میری یہ حالت کہ مجھ پر تھینک یو بھی شاق ہے

صفحہ ۹۰ (۱۲) $\frac{۱۳}{۱۰}$ ۱۹ء

"دیکھئے ہاتھ کانپ گیا ہندسہ کی شکل بگڑ گئی، لیکن دماغ میں بھی غلط قیاس پیدا ہوتے ہیں۔"

صفحہ ۹۲ (۱۲۹) ۱۵ر اکتوبر ۱۹ء

ینگ رالڈ سے مجھ کو گرمجوشی کی خواہش دیوانگی معلوم ہوتی ہے — ؎

زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت — مرجاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

صفحات ۹۳، ۹۴ (۳) دہلی $\frac{۲۵}{۱۰}$ ۱۹ء

Continuity of Soul (بقائے و سلسلہ روح) کا مضمون آپ نے خوب سمجھا۔ میں تو مانتا ہوں چند دہریوں کے سوا سب اس بات پر متفق ہیں کہ روح معدوم نہیں ہوتی۔ ہاں مسلم کہتے ہیں کہ برزخ میں رہے گی، ہندو تناسخ کے قائل ہیں۔

صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۴ (۱۴۸)

صادق الملک صاحب نے بھی حراوالے شعر کو بہت پسند گیا۔ لیکن آپ صاحبوں کو مشاغل حرا کا بھی کچھ خیال چاہیئے۔

رفتار اور سمت میں موج ہوا کی ہے اے قصہ گوے بدر ضرورت حرا کی ہے

صفحہ ۱۰۲ (۱۴۹) ۹ر جون ۲۰ء

چند روز ہوئے یہ شعر موزوں ہوا تھا ؎

حسن بت دیر میں کھینچے لئے جاتا ہے ہمیں کیا نتیجہ ہے برہمن سے کھنچے رہنے کا

جب انگریزیت ہم پر ہر طور سے چھائی ہوئی ہے تو ترک موالات سے کیا نتیجہ۔

صفحہ ۱۱۰ (۱۵۹) ۱۵ر اکتوبر ۲۰ء

حصہ چہارم میں اپنی ایک نظم دیکھی ؎

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
کافی ہے بس یہ وعظ کہ عزت ضرور ہے تقوے بہت ضرور ہے اللہ سے ڈرو
حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

صفحہ ۱۱۴ ۱۶۷ ۲۱ $\frac{۲}{۴}$

"آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں اگرچہ بہت علیل ہوں ایسا کہ حواس کو انجواے نہیں کر سکتا"

صفحہ ۱۱۸ (۱۶۳)

"حوادث نے اسی حلقہ میں رہنے پر مجبور کیا ہے جس کو ہم سے مذاق وخیال میں تباین کلی ہے"

مکاتیب اکبر بنام لسان الہند عزیز لکھنوی

صفحہ ۴۳ (۱۰) ۵ر مئی ۱۰ء

"میری زیادہ تر توجہ تردید الحاد پر رہی جو اس زمانہ میں کھیل گیا ہے۔ بہت پولٹیکل اشعار ہیں، بہت اخلاقی ہیں ــــ اکثر اشعار شرح طلب ہیں، اس میں میں عام قواعد کا پابند ہوں اگر ظاہرا کہیں تجاوز ہے تو وہ دلیل کے ساتھ ہے"۔

صفحہ ۵۳ (۲۴) ۲۴ر نومبر ۱۹۱۰ء

"کیا کہوں کیا گذری اور کیا گذر رہی ہے، اس حادثہ کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ مرحومہ کے ساتھ عشرت منزل کا خاتمہ ہوگیا۔ ہاشم گیارہ سال کا ہے اگر زندہ رہا تو اُس کی شادی کے بعد شاید یہ گھر پھر زندہ ہو، عشرت تو پردیس کے ہو رہے"۔

ہائے اکبر کی اکبری نہ رہی۔

صفحہ ۵۸ (۲۶) ۷ر فروری ۱۹۱۱ء

یونیورسٹی کی دھوم ہے۔ ایگزیبیشن کی دھوم ہے۔ دہلی دربار کی دھوم ہے۔ لندن میں مسجد کی دھوم ہے۔ ہماری آپ کی ترقی کی دھوم ہے۔ ہز ہائینس آغا خاں کی دھوم ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را می شناسم

Exhibition = نمائش۔

صفحہ ۵۹ (۲۸) ۶ر مئی ۱۹۱۱ء

"اسکولی شاعری مشکل ہے۔ ملازمان سررشتہ تعلیم کا حق ہے۔ آپ جب ارادہ کریں گے مشکل پڑے گی ہاں بلاارادہ بہت ایسے اشعار نکل آئیں گے جو منتخب ہو سکیں"۔

صفحہ ۶۴و۶۵ (۳۲) ۴ر اکتوبر ۱۹۱۱ء

نئی پرانی روشنی کی مکالمت کے عنوان سے چھپوا دیجئے آخر میں ایک بریکیٹ میں (وہ بھی ننھا سا بریکیٹ) صرف اکبر لکھوا دیجئے، نہ حضرت نہ سلامت نہ خان بہادر پھر دیکھا جائے گا۔

یونیورسٹی کا میں ایسا ہی خیر خواہ ہوں جیسا انگریزی عملداری کا۔ یونیورسٹی ہماری تکمیل نفس بلکہ تکمیل انسانیت کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جس طرح انگریزی عملداری ہم کو مہذب انسان بنانے کے لئے ضروری تھی۔ یونیورسٹی قوم کے لئے ضروری نہ ہوتی تو لندن سے کیوں صدا اُٹھتی اور ہمارے رئیس اُس کے لئے کیوں دوڑتے ہماری سمجھ جو مشرقی لٹریچر اور ہمارا مذاق جو دیرینہ عادات پر مبنی ہے معیار صحیح نہیں ہے اس رنگ کو نیا خون خوب سمجھتا ہے۔ اسی کو مزا بھی آئے گا ہم تو قبر میں پانوں لٹکائے بیٹھے ہیں۔

صفحہ ۶۵، ۶۶ و ۶۷ (۳۴۳) ۶/ نومبر ۱۱ء

سید صاحب کا ارادہ تھا کہ علی گڈھ یونیورسٹی ہو جائے وہ ارادہ اب پورا ہوگا میرے ذہن میں یہ چار مصرعے آئے تھے۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

لیکن میری شاعری کا ضعف تھا کہ اس نظم سے کام پورا ہونے کے معنی نہ پیدا ہوئے بلکہ ایک اور پہلو نکل آیا نئی روشنی کی پبلک سے داد ملنے کی امید نہ رہی۔

یونیورسٹی سے پرانی روشنی کی وحشت بھی بجا ہے اور نئی روشنی کا ادھر میلان بھی قانون فطرت کے مطابق ہے۔ پرانی روشنی اپنی مجموعی لیکن خیالی حالت کی شیفتہ ہے نئی روشنی اپنی منفردہ (یعنی ہر شخص بالانفراد) لیکن واقعی حالت کی شائق ہے۔ نیچر نئی روشنی کے ساتھ ہے۔ کوئی زبردست طاقت نہیں ہے کہ نیچر کو پرانی روشنی کے مطابق کا تابع کر کے مجموعی حالت میں لائے آپ کا خیال صحیح ہے کہ پرانے بزرگ لکیر کے فقیر اور ضرورت زمانہ سے بے خبر ہیں، بیشک نئی روشنی کا ساتھ دنیا کو دینا چاہئے ورنہ کس کے ہو کے رہیں گے اور کدھر جائیں گے اسی بات پر صبر کرنا چاہئے کہ نئی روشنی میں گو ہر شخص باخبر ہے لیکن اپنی ہی ضرورت سے الفاظ کچھ ہوں مطلب اپنا ہے ؎

دلا دے ہم کو بھی حاجت سے لائلٹی کا پروانہ قیامت تک رہے سید ترے آنر کا افسانہ

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ؎

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ ادھر حالت فقیرانہ ادھر سامان شاہانہ

لیکن جن کو یارانے کا شوق ہے وہ یہی کہتے ہیں۔

مبارک شیخ کو نان جویں کے ساتھ یہ قراءت ہمیں تو دیر میں پرشاد کھانا اور بھجن گانا

بعض لوگ یہ معذرت کرتے ہیں اور ان کی معذرت کسی قدر بجا ہے ؎

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سید سے نفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں

Nature = فطرت

صفحہ ۲۹ (۳۶) ۱۳ر جنوری ۱۱ء

ان ایڈیٹروں کے اصرار سے پریشان ہوتا ہوں پھر آپس میں ایسی تلخ فیلنگس پیدا ہوتی ہیں۔ اخلاقی حالت ملک روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہے۔ دولت اور علم باطن کی کمی کا اقتضا ہی یہ ہے۔ کل ایک عجیب شعر ذہن میں گزرا، ملاحظہ فرمائیے گا کیا پہلو ہیں۔

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولے

Feelings = جذبات حسیات۔

صفحہ ۷۰-۷۱ (۳۸) ۲۳ر جنوری ۱۹۱۲ء

ایک صاحب نے جالندھر سے رسالہ اُردو نکالا ہے اُردو زبان کی درستی کے لئے ٹائٹل پیج پر یہ شعر پاتا ہوں

خال رخ علم بے گماں ہے اُردو معنی کی زمیں کا آسماں ہے اُردو

مجھ کو تامل ہے کہ "آسمان اُردو" ہے یا "اُردو آسمان" ہے صریح ظاہر ہے کہ اُردو کو آسمان کہا ہے پس علامت اضافت اُردو کی تابع اور تانیث ہونا چاہیے معنی کی زمین کی آسمان ہے اُردو اگر اُردو کو خبر نہ کریں اور دو فقرے ہوں یعنی یوں کہیں کہ "معنی کی زمین کا آسماں کوئی ہے"؟ اور جواب دیا جائے کہ اُردو اس وقت زمین کا آسمان صحیح ہے لیکن اس وقت بھی جوابی فقرہ اُردو میں مقدر ہوگا کہ "معنی کی زمیں کا آسمان اُردو ہے۔ میں کہوں گا یہ عورت اس جنگل کی شیر ہے نہ یہ کہ جنگل کا شیر ہے۔ تاہم بحث نازک ہے آپ کیا کہتے ہیں ــــ ہاں صاحب آپ ازمانوں اور افسانوں کو قافیہ کریں گے اور ایوانوں اور ویرانوں کو قافیہ کریں گے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ایطائے خفی ہے۔ ازمان اور افسانہ میں واو نون جمع لگا دیا اسی طرح ایوان اور ویرانہ میں واو نون جمع لگا دیا۔

صفحہ ۷۲ (۴۰) ۲۷ر جنوری ۱۲ء

میرے سوالات سے آپ متردد اور متامل ہوں گے۔ یہ بحثیں ایسی ہی ہیں۔ اب میں اپنا خیال عرض کئے دیتا ہوں۔ امر اوّل قاعدے کے رو سے وہی صحیح ہے جو میں نے عرض کیا "اس جنگل کا شیر بلی ہے"۔ــ "اس جنگل کی شیر بلی ہے" اس مثال سے معانی مختلفہ صاف ظاہر ہیں

لیکن روک ٹوک نہ جائے۔ جو ترکیب سامعین پر گراں نہو جائز ہے۔ امر دوئم میرے نزدیک یہ قافیہ جائز ہے گو مستحسن نہو، لفظ مکتوبہ کا اعتبار کیا جائے تو بعد حذف علامت جمع ارماں و افساں رہ جاتا ہے یہ دونوں لفظ خود قافیہ یکدگر ہیں۔ فارسی والوں نے الف نون کا خیال کیا تھا اُردو کے واو نون کا خیال نہیں کیا۔

صفحہ ۴۳، و ۴۷ (۴۱) ۳ر فروری ۱۲؁ء

آپ سے نظر ثانی کی درخواست ہے ان فقرات کو ملاحظہ فرمائیے۔ "اس جنگل کا شیر بلی ہے" "اس جنگل کی شیر بلی ہے"۔ شیر دونوں جگہ مضاف ہے۔ لیکن دیکھئے دونوں فقروں کے معنی الگ ہیں جب مضاف مشبہ بہ ہو تو مشبہ کے تابع ہو جاتا ہے اور علامت اضافت کی تانیث و تذکیر مشبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے اِلّا اس صورت میں کہ مشبہ صراحتاً مذکور نہو۔۔ چونکہ یہ رسالہ قواعد کی ترتیب و تعین کا مدعی تھا۔ اس طرف نظر گئی ۔۔ توالی اضافت مخل فصاحت ضرور ہے لیکن یہ محل بے چارگی ہے ع جمال پاک رخ شاہ بحر و بر دیکھا + کیا صاف مصرعہ ہے اُردو میں کہئے بحر و بر کے شاہ کے پاک رخ کے جمال کو دیکھا۔ کے کے کی صدا کیا بُری ہے۔ (کس قدر۔ بہت)

صفحہ ۷۶، ۷۷ (۴۴) ۱۳ر جولائی ۱۲؁ء

"مخزن میں میرے چند شعر چھپے ہیں۔ میرا مصرعہ تھا ع اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ع کیا خوش جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا + بنا دیا ہے۔ خوش کو خشک کے ساتھ انھوں نے مناسب سمجھا لیکن شاید زبان تو وہی ہے جو میں نے لکھا تھا۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ فارسی میں تو خوش گفتی" خوب ہے لیکن اُردو میں کیا خوش آپ نے کہا مجھے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا"۔

صفحہ ۷۸، و ۸۰ (۴۶) ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

"زمیندار نے ایک پرچے میں اس عنوان سے "لسان العصر کے ۲۰ نشتر" بہت سے شعر چھاپے لیکن یہ نہ لکھا کہ کلیات دوئم سے منتخب ہوئے ہیں میں نے ان کو لکھا کہ ۱۴ واں نشتر ملاحظہ ہو سہ

کھلا دیوان مرا تو شور تحسیں بزم میں اُٹھا   مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

غالباً اب وہ اشتہار چھاپ دیں ۔۔ آج کل یہاں یہ حال ہو رہا ہے جس پر یہ کہنا پڑا

گئے وہ دن کہ جنوں تھا مجھے پری کے لئے ٭ حواس باختہ ہوں اب تو عمری کے لئے

صفحہ ۹۵ و ۹۶ (۶۶) ۵ مارچ ۱۹۱۴ء

حال میں دو چار شعر کہے تھے۔ بعض حضرات نے ان کو بہت پسند کیا نقلیں لے گئے ؎

تو وضع پہ اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر ٭ دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر

گر تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے ٭ رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اُس پہ در تاثیر نہ کر

دو شعر اور ہیں۔

باطن میں ابھر کر ضبط فغاں ـــ لے اپنی نظر سے کار زباں ٭ دل جوش میں لا فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے ٭ ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

ایک تازہ شعر اور سناتا ہوں

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو ٭ پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

صفحہ ۹۸ (۶۷) ۶ مئی ۱۴ء

افسوس ہے کہ آپ کا مکان سڑک میں آگیا۔ عجب اتفاق ہے تھوڑا زمانہ گذرا میں نے مطلع کہا تھا ؎

تنگ دنیا سے دل اس دور فلک میں آگیا ٭ جس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آگیا

صفحہ ۹۹ و ۱۰۰ و ۱۰۱ و ۱۰۲ (۷۰)

آپ کے شعر پر شاعرانہ وجد آیا کیا بات پیدا کی ہے ؎ میں نے پردہ جو اُٹھایا تو قیامت دیکھی۔

(دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے ٭ میں نے پردہ جو اُٹھایا تو قیامت دیکھی)

واہ ـــ معترض صاحب کا اعتراض اگر میں یہ نہ سنتا تو کبھی یہ وہم بھی نہ آتا۔ اوّل مصرعہ میں جو ضمیر غائب ہے سارا مدار معنی اور انحصار رجوع خیال سامع اسی پر ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ "وہ ہوں گے تنہا" وہ کے لفظ سے اگر خواہ مخواہ اور ضرورتاً اور بلا ارادہ اور فطرت سامع کی زبردستی سے خیال بی گوہر جان کی طرف رجوع ہو گیا تو دوسرا مصرعہ نہ معلوم کیا کرو وہ منظر اس کے سامنے پیش کرے لیکن عارفانہ مذاق اور بلند خیالی اس ضمیر کو "شاید تنہا نشین مسند حسن" (عرفی) کی طرف رجوع کرے گی۔

یہ فقرہ کہ خلوت میں وہ ہوں گے تنہا۔ پہلے مصرعہ میں صریحًا اس کی تائید کر رہا ہے اور کسی رقیب کا گذر ہے اور اُس سے ہم آغوش ہے تو باوجود دوسرے مصرعے یہ الفاظ مصراؤں کے ہوتے بلکہ یوں کہا جاتا کہ میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں رقیب ان سے کچھ باتیں کر رہا ہے لیکن پردہ اُٹھایا تو وہ ظالم مشغول .... شرت تھا یعنی قیامت ہو رہی ہے۔ یا یہ کہا جاتا میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہیں لیکن جاکر دیکھا تو رقیب بھی موجود تھا حالت علیحدگی اور مبا ـــ کا تقابل یا حالت تنہائی اور حالت موجودگی غیر کا تقابل ہو سکتا ہے۔ تنہائی اور ـــ شرت کا کوئی منطقی تقابل نہیں جیساکہ میں نے عرض کیا خیال سامع کا میلان ہے کہ فورًا اسفل کی طرف رجوع ہوا

بگویم سماع اے برادر کہ چیست اگر مستمع را بدانم کہ کیست

گراز برج معنی بود طیراو فرشتہ بود ماند از سیراو

وگر مرد شہوست و بازی و لاغ قوی تر شود لوش اندر دماغ

لیکن معترض صاحب معذور ہیں سوسائٹی کا یہی مذاق ہے۔ انھوں نے نیک نیتی سے ایسا خیال کیا ہوگا۔ قیامت کے لفظ سے شاعر جو مراد چاہے لے۔ لیکن اُردو زبان یا کسی زبان میں یہ لفظ مباشرت کے معنی نہیں پیدا کرے گا" اس نے صرف دیکھ لینے کی اجازت دی آپ نے قیامت کی کہ بوسہ لے لیا" یہاں بوسہ ہی قیامت ہوا ـــ میں آپ کے معترض صاحب کی خاطر یا سوسائٹی کی خاص حالت کے لحاظ سے، مشورہ دے سکتا ہوں کہ شعر پڑھنے سے پہلے یہ کہہ دیجے، کہ عارفانہ یا حقیقت کا رنگ ہے۔ لیکن عام طور پر ضرورت نہیں شعر صاف ہے" میں سمجھتا تھا کہ آخرت میں خدا اکیلا نظر آئے گا۔ لیکن وہاں تو قیامت نظر آئی۔ قیامت کا لفظ قابل داد ہے۔ اور بھی نازک مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ بیان میں لطف آجاتا ہے۔ کیا یہ اعتراض نہیں ہو سکتا ہے قیامت کی خبر تو خدا نے پہلے ہی دے دی ہے آپ کو اس پر حیرت کیا ہوئی، لیکن کیا یہ جواب نہیں دیا جا سکتا کہ یہ شعر مولوی صاحب نے نہیں کہا ایک عاشق نے کہا ہے وہ تو معشوق کو تنہا ہی تصور کرتا ہے اور تنہا ہی پسند کرتا ہے۔ کسی ایرانی نے خوب کہا ہے ؎

جہانے مختصر خواہم کہ در وے ہمیں جاے من و جاے تو باشد

شاعر کے خیالات کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے ـــ اور بھی مزے ہیں۔ میرا یہ مطلع ملاحظہ

فرمائیے حشر سے بھی آگے بڑھ گیا ہوں ؎

میرے دل سے امتیاز دی و فردا اُٹھ گیا　　حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اُٹھ گیا

میں نے شاید بے ضرورت خامہ فرسائی کی ہے سوال یہی ہے کہ لفظ قیامت بمعنی معاشرت ہے یا نہیں - دوسرے شعر کیسا ہے؟ جواب یہ ہے کہ قیامت بمعنی مباشرت نہیں، شاعر جو مراد چاہے اس سے لے بشرطیکہ صاف طور پر اس کا اظہار ہو - اور شعر اچھا خاصہ پر تکلف معنی خیز ہے لفظ قیامت کی داد دینی چاہئے -

صفحہ ۱۱۰　　(۸۲)　　۳۰ر جنوری ۱۹۱۶ء

سانس لیتا ہوں تو اب خوں کی بو آتی ہے - قیامت کا مصرعہ ہے - مجھ کو کہنا چاہئے تھا آپ کی زبان سے کیونکر نکل گیا - آپ لکھتے ہیں کہ خدا جانے یہ شعر صحیح ہے یا نہیں - ایسے شبہات کی میں بہت قدر کرتا ہوں - معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کمال ارادی اور ساری دنیا کے مذاق ادراک فہم سے مستغنی ہو کر اپنا جذب دلی ظاہر کیا ہے اور اب اس کو خیال آیا کہ آیا یہ آواز اُس عالم گرد و پیش کے موافق ہے یا نہیں جس میں فطرت نے اس کو جگہ دی ہے -

کانفرنس کے باب میں آپ نے پوچھا ہے زمانے کی موجیں ہیں دیکھتے رہئے - یکجائی میں کیا قوت تھی - افتراق سے کیا ضعف ہو گا -

؎ شیعہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم دلو خواہ ہیں　　سنّی یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بے گناہ ہیں
ممبر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اہل جاہ ہیں　　لیڈر یہ کہہ رہے کہ ہم رو براہ ہیں
صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بادشاہ ہیں　　کس کو خبر کہ حضرت اکبر تباہ ہیں

صفحہ ۱۱۴　　(۸۷)　　۸ر اپریل ۱۹۱۶ء

استغفر اللہ - نہ میری زبان - نہ میرا خیال - کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں - خرافات بک کر میرے نام سے منسوب کر دیتے ہیں - مجھ کو اس لغو کی مطلق خبر نہیں - آپ فوراً تردید کر دیجئے - بلکہ اخبار میں چھپوا دیجئے - مجھ کو بے حد غصہ آیا - اور افسوس ہوا - آپ کو تو فی الفور تکذیب و تردید کر دینی چاہئے تھی - کہ اسلوب سخن پکار نہیں رہا ہے کہ میں اس کا مصنف نہیں ہو سکتا - میں تو پڑھ بھی نہیں سکا نہ سمجھ سکا -

صفحہ ۱۱۴ (۸۸) ۱۰؍اپریل ۱۶ء

جو قطعہ میرے نام سے آپ کے پاس پہنچا تھا اور آپ نے مجھ سے دریافت کیا تھا میں اس کو پڑھ نہ سکا تھا۔ طبیعت اچھی نہ تھی اور ہنوز دل و دماغ پر قابو نہیں۔ تبخیر کی شدت تھی۔ بدگمانی اور سوءِ خیال کے جوش میں سمجھا کہ اس میں کچھ توہین یا استہزا ہے خوب دہائی تہائی دی اور آپ کو لکھا کہ معاذاللہ اس خرافات سے مجھ کو کیا تعلق۔ اس وقت عشرت نے پڑھ کر سنایا مصنف نے کچھ بدنیتی نہیں کی۔ بارہ کی رعایت لفظی کی ہے۔ لیکن نہیں معلوم کہ میرے نام سے کیوں منسوب کیا مجھ کو اصلاً تعلق نہیں ہے۔ مصنف جو صاحب ہوں اپنے مضمون پر مستحق داد ہیں بہر حال خرافات بھی میرے نام سے مشہور ہیں خیال رکھئے گا

صفحہ ۱۱۶ (۹۱) ۱۵؍مئی ۱۶ء

آپ کے لئے موجودہ شغل کالج ضرور دلچسپ ہوگا۔ البتہ بے سود مباحث نفس نواز سے احتراز اولیٰ ہے بلکہ فرض لیکن سب آپ کے خیال کے ہوتے تو کالج کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ امید ہے کہ کالج سے تہذیب کی ترقی ہو میں تو کبھی ایسے خیالات سے دل کو تسکین دے لیتا ہوں

جنجھوٹی میں یہ مصرعہ گا رہی تھیں رات بی منّی — شگوفے نفس ہی کے ہیں نہ یہ شیعہ نہ یہ سنّی

صفحہ ۱۲۲ (۹۷) جولائی ۱۹۱۶ء

تعمیل ارشاد نہ کر سکا صرف ایک شعر جو معما کی صورت میں ہے عرض کرتا ہوں

انا مدینۃ العلم و علیؑ بابہا

دکھا رہی ہے یہ ترکیب حسن طبع سلیم — علی کی تم میں جگہ ہو تو بس وہ ہے تعلیم

ت علی م = یعنی ت اور م کے اندر علی کو جگہ دیجئے۔

صفحہ ۱۲۳ (۹۸) ۱۶ء

"عارضی ہیجان نفس کو میں اصلی باطنی اور روحانی ترقی نہیں کہہ سکتا پالیٹکس میں یہ دیکھتا ہوں کہ

اے صبا مایہ سودا نہ تو داری و نہ من — بوے آں زلف چلیپا نہ تو داری نہ من

اور یوں تو دنیا چلی ہی جائے گی"۔

صفحہ ۱۲۷ و ۱۲۸ (۱۰۵) ۲۰؍اکتوبر سنہ ۱۱ء

معلوم نہیں "فریاد بھرنے" کا کیا ہوا۔ اشعار سنے ہوں تو مجھے بھی سنائیے۔ میں نے بھی قافیہ پیمائی کی ہے ؎

ساغرِ دل میں شراب طرب ایجاد بھرے ۔۔۔ نہ ڈرے شوق کہ غصے میں ہیں حسّاد بھرے
دوست رکھتا ہوں میں ایذا کو یہ ممکن ہی نہیں ۔۔۔ آپ کے ظلم سے میرا دل ناشاد بھرے
خون بسمل کو پہنچنے دے ذرا دامن تک ۔۔۔ یوں طرارے نہ عبث توسن جلاد بھرے
وعظ ایسا نہ ہو جو دل کو مکدر کر دے ۔۔۔ خاک اس شیشہ میں کیوں صاحب ارشاد بھرے
چاہیئے سینۂ شاگرد میں بھر دے وہ علوم ۔۔۔ کیوں کتابوں سے عبث بکس کو استاد بھرے
وہ بھی کیا دن تھے جوانی و جنوں کے اکبر ۔۔۔ رہتے تھے جب مری محفل میں پری زاد بھرے

صفحہ ۱۳۲ (۱۱۴) ۳؍اپریل سنہ ۱۲ء

میرے چند اشعار ہمدم میں چھپے ہیں لیکن صواب کی جگہ ثواب لکھ دیا ہے۔ بے معنی یہ بھی نہیں بے جوڑ ہے۔

صفحہ ۱۳۶ (۱۲۰) ۶؍ستمبر سنہ ۱۲ء

"اگر میری یاد صحیح ہے تو زہرِ عشق میں یہ شعر ہے ؎

میں اکسنے تلک نہیں پاتی ۔۔۔ ورنہ اپنے کئے کو خود آتی

یعنی ذرا سر بھی اُٹھانے نہیں پاتی اس سے ظاہر ہے کہ اکسنا اور اکسانا لازم و متعدی دونوں ہیں اسکانا تو بتی کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن چراغ کی بتی۔ اب تو اس لفظ کا چراغ ہی گُل ہے۔ لمپ کی بتی کو چڑھاتے ہیں یا پیچ اوپر کو گھماتے ہیں۔ اکسانا۔ تحریک کرنا۔ زیادہ عمل کرنا میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ کوئی شعر یاد نہیں یہ مصرعہ کہہ سکتا ہوں ع خود تو دبکے ہوئے ہیں قوم کو اکساتے ہیں بتّی کو اکسانا تاکہ روشن ہونے کی استعداد اس میں زیادہ ہو جائے معناً تو صحیح ہو گا لیکن محاورہ اسکانا ہی تھا۔ شعرا میں یہ لفظ زیادہ رائج نہ تھا وہ تو شمع اور گل گیری کے پروانے تھے۔

صفحہ ۱۳۷ (۱۲۳) ۳۰ ستمبر ۱۷ء

اپیل بہ جناب عزیز

ادھر میں نے آپ سے یاس صاحب کا پتہ پوچھا - ادھر نظارہ میرٹھ میں ان کا ایک مضمون نظر سے گذرا جس میں انھوں نے میرے چند اشعار لکھے ہیں اور بہت مبالغہ آمیز مدح کی ہے اس کے پہلے بھی مجھ کو انھوں نے بہت داد دی - چراغ سخن میں بھی بہت کچھ تحریر فرمایا - ان کی محبت و مہربانی ہے کہ میری ایسی مدح کرتے ہیں جس کا میں مستحق نہیں ہوں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایسی مدح سے جس سے لوگوں میں بددلی پھیلے اور بدگوئی اور مخالفت پر آمادگی ضروری سمجھی جائے کیونکر لائق مسرت متصور ہو - غالب کو میرے سامنے طفل مکتب کہنا کیا معنی رکھتا ہے - یاس صاحب کے سامنے غالباً طفل مکتب ہوں گے لیکن میرے سامنے وہ استاد ہیں میں اندیشہ ناک ہوں کہ ناواقف حضرات یہ سمجھیں گے کہ میرے اشارے سے ایسا لکھا جاتا ہے یا فی الواقع میرا ایسا خیال ہے - حاشا و کلا غالب تو غالب ہی تھے اس وقت بھی چند حضرات کے سامنے میں بالکل بے علم و مبتدی ہوں یہ خط آپ کو اس واسطے لکھتا ہوں کہ ہو سکے تو کسی مناسب طریقہ سے کوئی مضمون لکھئے - شائع کر دیجئے - مجھ کو بدگمانیوں سے بچائیے - میں نے یاس صاحب کو بھی سابق میں لکھا تھا اب تو ان کا پتہ ہی نہیں معلوم - لکھئے کہ یہ پیرایہ بیان قابل تسلیم نہیں - فتنہ انگیز ہے اور وہ خود یقیناً اس کو سخت ناپسند کرتے ہوں گے ان کو مطلق دعوےٰ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ -

صفحہ ۱۴۲ (۱۳۰) ۲۵ فروری ۱۹۱۹ء

رات بے ساختہ یہ مضمون دل میں آیا

اللہ کی تلاش جو ہو کھو بھی جائیے
جو آپ کہہ رہے ہیں یہی ہو بھی جائیے

بیداری حواس ہے ظلمت کدہ میں یار
افسانہ سن لیا ہے تو اب سو بھی جائیے

صفحہ ۱۴۲ (۱۳۱) ۲۷ فروری ۱۹ء

زندگی باوجود ان داغہائے دل کے اگر بار نہو تو اس کی زبردستی اور فطرت کا طلسمی اثر ہے لیکن زندگی شیریں نہ رہی -

صفحہ ۱۵۴ (۱۴۹) ۵ رنومبر ۱۸ء

تنہائی میں دل دنیوی اندیشوں کو پیش کر دیتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ اسی خیال کو نظم کر دیا ہے ؎

خواہش یہ ہے خواہش اس میں بھری ہر لحظہ ہے اک شورید گی
اندیشوں کی کثرت اور غضب اک آتا ہے اک جاتا ہے
دنیا کی جاش جب نفس میں ہو پھر لطف سکون طبع کہاں
صحبت میں ہے غوغا دشمن جاں تنہائی میں دل سر کھاتا ہے

دل کے سر کھانے کو دیکھئے گا۔

صفحہ ۱۵۵ (۱۵۱) ۲۰ رنومبر ۱۸ء

اشعار کے ضمن میں کبھی کبھی چیستاں اور معمّا پر بھی طبع آزمائی کر لیتا تھا از انجملہ یہ ہے

وہ کون چیز ہے کہ اس کو دل میں رکھو تو ازل میں پہنچ جاؤ

اس کا جواب راز دل کے اندر داخل کیجئے یعنی راز کے اوّل دٓ اور آخر میں لٓ رکھئے تو دراز ل ہو

صفحہ ۱۵۷ (۱۵۴)

وہی املا ہے جو آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ شطرنج کی بساط ظاہر ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی چیزیں کسی تختہ وغیرہ پر پھیلا کر بیچتے تھے۔ لفظ بساطی وضع کر لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے بہر کیف بساطی کو ط سے لکھتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۵ (۱۶۲) ۲۶ رجون ۱۹۱۹ء

میں خیال کرتا ہوں کہ مستی کا لفظ اس وقت میں مکروہ ہے جب ذم کا پہلو نکلے۔ شراب کی مستی گناہ ہے مگر شعرا میں بہت دل پسند ہے۔

صفحہ ۱۶۶ و ۱۶۸ (۱۶۶) ۹ رجولائی ۱۹۱۹ء

کئی دن ہوئے یہ دو شعر بے ساختہ موزوں ہو گئے۔ غلط یا صحیح لیکن میرے حسب حال ہیں ؎

دنیا سے تعلق جن کو ہے وہ خوش نہ سہی مشغول تو ہیں
پژمردہ سراپا بھی ہیں اگر شاخوں میں لگے ہیں پھول تو ہیں۔

آفت تو ہماری جان پہ ہے دنیا سے تعلق چھوٹ گیا
بس طوق گلو ہے رشتۂ جاں امید سے رشتہ ٹوٹ گیا

ہوش میں لائی ہیں اب یوسیاں نشۂ امید فردا ہو چکا

صفحہ ۱۷۵ (۱۸۸) ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۹ء

خواجہ صاحب نے سرسری طور پر نوٹ لکھ دیئے۔ ان مضامین میں جس طور پر کہ نوٹ کئے گئے ہیں بہت کسر ہے۔ میں آپ کے حسن عقیدت کو دیکھتا ہوں کہ آپ نے بے دریغ مدح کردی ہر چیز میں ایک یہ قول فیثاغورث کا تھا اس کی تشریح ذرا اور ہونی چاہیئے۔ آغوش فطرت بھی تشریح طلب ہے ؎

خیالِ وسعت تحقیق تا کجا اکبر کہ ہر نگاہ ہے محتاج اک فسانے کی

صفحہ ۱۷۶ (۱۸۹) ۱۶/اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں نہیں سمجھتا کہ فرد کو کس محل میں استعمال کرتا ہے کہ تذکیر و تانیث کی ضرورت ہے دوسرے مفہومات کے تابع خیال میں آیا۔ لکھنو کی فرد میں زبان پر ہے۔ یہ شخص اپنے وقت کا فرد ہے۔

مثلاً بلبل مذکر واحد۔ بلبلیں مؤنث جمع۔

صفحہ ۱۷۷ (۱۹۱) ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۹ء

بہ اعتبار ذات مشارٌالیہ کے میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ بہرحال یہ صفت ہے تو خیال موصوف کا ضرور ہے اور جب ایسا نہیں ہے تو بلحاظ زبان کے میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں اُردو میں تو بعض صفتوں کے ساتھ مذکر و مؤنث موجود ہے۔ بڑا بڑی چھوٹا چھوٹی۔ اس کے متعلق ذرا طویل گفتگو ہے لکھنا بار ہے ملنا ہوتا تو آپ میرا بیان سنتے اور یقیناً پسند کرتے خیالات کو وسعت ہوتی دہلی میں بحث تھی "اس کا نظیر نہیں اُس کی نظیر نہیں" جو کچھ میں نے کہا سب نے قبول کیا۔ میں نہیں سمجھا کہ خطوط کے چھپنے سے کیا فائدہ۔ میں اہل زبان تو ہوں نہیں اور اس وقت زبان خود معرض تغیر میں ہے۔ رہا اخلاقی اور فلسفیانہ پہلو چند خطوں سے کوئی مکمل مضمون پیدا نہیں ہوسکتا۔ خیر دنیا ہے۔ چلنے دیجئے۔

صفحہ ۱۷۹ ۱۹۲ ۵/نومبر ۱۹۱۹ء

خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک پرچہ اپنی بیوی کی اڈیٹری میں نکالا ہے "اُستانی" آج وہ پرچہ میرے پاس آیا کیا کہوں استانی آئی ہے یا آیا ہے۔ استانی کی تانیث میں کیا شبہ ہے

لیکن خیال پرچے کا ہے۔ خیر یہ تو گویا یہاں عَلَم ہو گیا ہے۔ چند الفاظ وہ ہیں کہ تانیث و تذکیر باعتبار ان الفاظ کے ہے جن پر دلالت مقصود ہے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک مستند شاعر کی جو رائے ہو جائے وہ سند ہے ورنہ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ مرحوم جس کو خدا ہی نے مذکر مؤنث نہیں بنایا اُس کو کون مذکر مؤنث کر سکتا ہے۔

صفحہ ۱۸ (۱۹۴) نومبر ۱۹۱۹ء

اوّل تو یہ مضمون کسی قدر دلچسپ ہے۔ اگرچہ میں اپنا وقت ان مباحث میں ضائع نہیں کرتا۔ دوسرے اتفاقاً لفظ فرد مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے نشان کر دیا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید ہوئی ہے کہ مدلول فرد کی تذکیر و تانیث پر قائل کی نظر ہوتی ہے۔ یہاں کوئی تخصیص عورت و مرد کی نہیں ہے۔ لیکن ایسی حالت میں مذکر ہی بولتے ہیں البتہ اگر کسی خاص چیز کو فرد کہنے لگیں تو میں آپ سے متفق ہوں۔ "اچھی فردیں ہیں"

پچھی ہوئی رضائیوں کے ابرے۔

صفحہ ۱۸۹ (۲۰۹) ۷ر فروری ۲۰ء

۷ر فروری کے ہمدم میں دیکھتا ہوں "مخمّس بر غزل حضرت اکبر الہ آبادی از مولوی ظہور محمد تقریب صاحب۔

اپنی خوشی نظام کو واپس برار دے

یہ میری غزل نہیں ہے کوئی اور صاحب ہوں گے۔ مصنّف صاحب براے مہربانی تصیح فرمائیں ہمدم کو یہی لکھ دیجئے۔

صفحہ ۱۹۳ (۲۱۵) ۱۰ر مارچ ۱۹۲۰ء

گور غریباں تانیث ہے یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔

صفحہ ۱۹۶ (۲۲۱) ۴ر جون ۲۰ء

"سالونیکا" کی داد پر اپنا یہ شعر یاد آیا ؎

وہ خرافات پر ہیں داد طلب   واہ وا پر عجب مصیبت ہے

نہایت دقت ہے کہ برسوں کے کہے ہوئے اشعار جو بیاض میں لکھے ہیں لوگ نقل

کردیتے ہیں سمجھا جاتا ہے کہ یہ تازہ فکر ہے۔ سالونیکا والا شعر شاید جنگ طرابلس کے وقت کا ہے اس وقت تو کچھ معنی بھی تھے اب محض لغویت ہے میں نے خواجہ صاحب کو شکایت لکھی کہ آپ نے شعر کہاں پایا۔ کیوں چھاپا۔ انھوں نے معذرت لکھی۔ اڈیٹر مشرق نے مجھ کو لکھا کہ نہ طبع ہونا چاہئے تھا۔ بہرحال اس کو فکر تازہ نہ خیال فرمائیے گا وہ سب شعر پرانے ہیں بجز اس شعر کے ؎

جو رب سے پھر رہے ہیں اہل دل روتے ہوئے　　جائے حیرت ہے یہ بات اللہ کے ہوتے ہوئے

صفحہ ۱۹۹　　(۱۹۲)　　۱۸ر جولائی ۱۹۲۰ء

ناتوانی اور افسردگی کی حد نہیں صرف فردائے آخرت پیش نظر ہے ؎

کیا کروں عہد وفا اپنے خیالات کے ساتھ　　کہ خیالات بدل جاتے ہیں حالات کے ساتھ

دیکھ کر حضرت اکبر کو خدا یاد آیا　　یہ مصائب یہ ہجوم ایسے کمالات کے ساتھ

صفحہ ۲۰۱　　(۲۳۰)　　۱۳ر ستمبر ۱۹۲۰ء

اپنی حالت دیکھ کر اکبر یہ آتا ہے خیال　　زندگی کیا ہے یہ اک مرگ طویل النزع ہے

صفحہ ۲۰۸　　(۲۳۸)　　۲۷ر دسمبر ۱۹۲۰ء

میری حسن عاقبت اور رفع ترددات کے لئے دعا فرماتے رہئے ایک مطلع ملاحظہ ہو ؎

آئیں طرازیاں ہوں کہاں تک شعور کی　　کچھ حد نہیں ہے وسعت شان ظہور کی

صفحہ ۲۱۰　　(۲۴۳)　　۱۳ر فروری ۱۹۲۱ء

بیگانہ فروشی سے میرے نزدیک عمدہ اور صاف معنی پیدا نہیں ہوتے۔ میں اس وقت اس کو پسند کرنے پر آمادہ نہیں ہوں اظہار خیال کے لئے آزادی سے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے لیکن ہر ایک کا مذاق اور انتخاب خلعت قبول نہیں پاتا۔ جلوہ فروش تو البتہ دل پسند ترکیب ہے

جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو　　خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم

لیکن مقصد کو بیگانہ فروش کہنا کھٹکتا ہے۔

صفحہ ۲۱۱　　(۲۴۴)　　۱۷ر مارچ ۱۹۲۱ء

مزاج پرسی کا ممنون ہوں اپنا حال کیا کہوں

میں تو سمجھتا ہوں کہ بس اب مرا　　لوگ یہ کہتے ہیں ابھی دیر ہے

صفحہ ۲۱۳ (۲۴۹) پرتاب گڈھ ۱۲ر جون ۲۱ء

گرمی کی ایسی تکلیف اُٹھائی اور اُٹھا رہا ہوں کہ سال آیندہ اگر زندہ رہا تو دہرہ دون میں بسر کروں گا۔

صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ (۲۵۰) ۱۹ر جون ۲۱ء پرتاب گڈھ

اس حوادث سے آپ کی تکمیل ہوتی جاتی ہے مجھ کو تو ایسے حوادث کا سامنا ہے کہ تصوف مبدل بہ جنون ہو جانے کا خوف ہے۔

عمر گذری تب کھلا دنیا کا حال اور ہی کچھ دل میں اب آنے لگا
پہلے تنہائی سے گھبراتا تھا دل زندگی سے اب تو گھبرانے لگا

آخری خط (۲۵۳) الٰہ آباد ۲ر اگست ۲۱ء

سہل نہیں کہ اپنا حال لکھوں۔ زندہ رہا حواس درست رہے تو ستمبر میں قصد لکھنؤ کروں گا عشرت پھر میرے بعد شاید کچھ بار اُٹھائیں اور ذمہ داریاں محسوس کریں۔ حصہ اوّل و دوئم کی بہت مانگ ہے۔ کیا آپ یہ محنت اپنے ذمہ لے سکتے ہیں کہ دونوں حصے چھپوائیے۔ پروف دیکھئے۔ حساب کرکے تخمینے سے اطلاع دیجئے اور وقتاً فوقتاً جس قدر ضرورت ہو مطبع کو دیجئے۔ دو دو ہزار کاپیاں ہوں۔ جواب جلد عنایت ہو تاکہ بعد انتظام سفر کام شروع ہو جائے۔

صفحہ ۹ ۱۶ر دسمبر ۱۱ء

قدم انگریز کلکتے سے دہلی میں جو دھرتے ہیں تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسی کرتے ہیں

صفحہ ۹ ۳ر مارچ ۱۲ء

حضرت اقبال کی مشغولی فی الطاعتہ سے نہایت خوشی ہوئی اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے۔ جب لیلےٰ کی تصویر میں یہ محویت تھی تو لیلےٰ آفریں کی محبت میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ان کو مبارکباد لکھوں گا۔

میر نیرنگ صاحب کو بھی مبارکباد دوں گا خطاب لسان العصر تو انھیں کا عطا کیا ہوا ہے اللہ ان کو فریدعصر کرے۔ زمیندار نے مجھ کو بھی ایک اسامی سمجھ رکھا ہے تار پر تار آئے کہ بیمہ نمبر کے لئے کچھ بھیجئے اوّل تو بیمہ نمبر کیسا لیکن اس خیال سے چپ ہو رہا

عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر   کیا تعجب ہے جو نکلا ہے یہ نمبر نمبر

اچھا نہ تھا طبیعت حاضر نہ تھی بالاخر چار مصرع لکھ بھیجے۔

مہر و مہ خوش ہیں روز خوش شب خوش   وحشی وحشت خوش مہذب خوش

ہیں غرض آپ کی ولادت سے   مسٹر ابلیس کے سوا سب خوش

۲۲ رمئی ۱۹۱۲ء صفحہ ۹

فارسی بھول جائیے غصّہ کم ہو جائے۔ نواب صاحب کے موٹر سے گرنے کا افسوس ہوا اور اپنا شعر یاد آیا۔

ع بم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے   لطف کیا ہے لدلئے موٹر پہ زر کے زور سے

نواب صاحب کو آپ نے فرشتہ صفت لکھا ہے میں کہتا ہوں اس سے بھی زیادہ۔ فرشتے صرف نیک اور مقدس ہوتے ہیں عقل کی ان کو ضرورت نہیں کیونکہ صرف حکم خدا کی تعمیل کر دیتے ہیں نواب صاحب عقلمند بھی ہیں۔

۳ راگست ۱۹۱۴ء صفحہ ۱۴ و ۱۵

ایک خط لکھ چکا ہوں یہ کیا معلوم کہ جو کچھ لکھنا تھا سب لکھ دیا۔ قلم کے ساتھ رہیں تو ادائے مطلب ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ قلم کہیں اور ہم کہیں۔ بار بار حواس کو مجتمع کرنا ہوتا ہے پھر کیا سلسلہ قائم رہے کیا بیان مدعا کی تکمیل ہو اکثر یہ ہوا ہے جوش دل سے کہا یا اللہ ایک سکنڈ میں دل ہی سے جواب سنا کہو کیا کہنا ہے اب بالکل بھول گئے، کیوں پکار اٹھا کیا گزارش کریں سبحان اللہ و بحمدہ کہہ کر رہ گئے۔ اس وقت مزاج پرسی کا کارڈ پہنچا۔ غش تو نہیں آتا لیکن یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ تجربے نے دماغ کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ (اثر مرگ ہاشم)

۳ رمئی ۱۴ء صفحہ ۱۵

تولیا جو آپ نے مرحمت فرمایا اس کو بروزن اولیا پا کر دلی پاکی کے حق میں شگون لیتا ہوں۔ (اچھا سمجھتا ہوں)

۳ راگست ۱۴ء صفحہ ۱۷

شدت غیرت نے بہت کچھ خاموش کر دیا ہے ذہن کو نہیں بلکہ زبان قلم کو وہ زبان قلم

نہیں جو حالات کو نوٹ کر لیتی ہے بلکہ وہ زبان قلم جو چل کر ایڈیٹروں تک پہنچتی ہے۔ رات جب تبخیر کی شدت تھی جیسا قریباً ہر شب ہوا کرتا ہے ذہن بھی غافل نہ تھا یہ شعر کہا

ہو سخن کا جب اثر ظاہر تو روک اپنی زباں   شعلہ زن ہو جائے جب آتش تو پھر کیوں پھونکئے

خیر یہ تو سخن کے متعلق تھا عام سوشل حالت اس وقت نہایت نازک ہے بالخصوص میری حدیں کچھ ایسی معین ہیں کہ وہم کو ان کی توسیع ہر طرف ہر فاصلے تک جائز ہے۔ یہ حالت سوہان روح ہے مگر تابکے۔ جن واقعات پر یہ حالت مبنی ہے ان کی تفصیل کی نہ فرصت نہ طاقت نہ تحریر میں موقع۔

صفحہ ۱۹   ۲۵ر ستمبر ۱۵ء

تصوف اور بیخودی کے ذکر میں جو لذت ہے اسی لذت کی گود میں میرا خیال پلا ہے اور میرے نزدیک تو سارے معانی اُسی میں ہیں۔

۳ر اکتوبر ۱۵ء صفحہ ۲۱

بعض حکما کا خیال ہے کہ نیکی اور عقلمندی ایک ہی چیز ہے سر علی امام صاحب کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہوتی ہے بہت شیریں نفس شخص ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۱۶ء صفحہ ۲۲

واحدی صاحب کو میں نے ایک مطلع لکھ بھیجا ہے۔

سخن میں یوں تو بہت موقع تکلف ہے   خودی خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے

۱۲ر جنوری ۱۹۱۶ء صفحہ ۲۴

آپ کو عذر نہو تو ہم کو عذر نہیں کہ یہ اشعار شائع ہوں۔ ثقالت نہیں ہے

حضرت اقبال اور خواجہ حسن   پہلوانی اُن میں اِن میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے   آؤ گتھ جائیں خداہی کے لئے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی   ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

۲۰ر فروری ۱۹۱۶ء صفحہ ۲۵

ع از کلید دیں در دنیا کشاد - اگر رسول اللہ کے رنگ میں لیا جائے تو لیسنس کی ضرورت ہے اگر دین صرف حصول دنیا کا ذریعہ سمجھا جائے تو بے دینی ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ کالج کے ذریعہ سے فکر معاش کی جائے جیسا کہ خود مصنف نے کیا ہے اور سب کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن کالج کو کلید دیں کیوں کہا ؟

صفحہ ۲۶ ۱۴ر فروری ۱۶ء

ماجد میاں کے باب میں آپ کے خیال سے مجھ کو اتفاق ہے ماجد کے اس کہنے پر کہ میں خدا کو نہیں جانتا اتنا غصہ نہیں آتا جتنا غیر ماجد کے اس کہنے پر غصہ آتا ہے کہ میں آپ سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ میں خدا کو جانتا ہوں لیکن مانتا نہیں ادھر بھولا پن ہے ادھر خیرہ سری -

تو و طوبے و ما و قامت یار فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

صفحہ ۳۲ ۱۸ر مئی ۱۶ء

میں خود ہنگامہ مصائب میں مبتلا ہوں - کیا حالت اس زخمی کی ہوگی جس کے زخم مہلک ہیں اور ہنوز کچھ قوت رفتار باقی ہے وہ گوشہ عافیت ڈھونڈھ رہا ہے کہ مرنے کے لئے بستر لگائے لیکن گوشہ نہیں ملتا اور قوت رفتار جاتی رہتی ہے ؎

مطالب ہیں بہت وقت دعا کچھ کہہ نہیں سکتا الٰہی فضل کر اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتا
رنج آسمان میں ہے نہ راحت زمیں میں ہے اپنے ہی جس کا جوش ہے سب کچھ ہمیں میں ہے

صفحہ ۳۲ و ۳۳ ۲۵ر مئی ۱۶ء

مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ نے کبھی مراقبہ کیا ہے میں نے کہا کہ میں ہر شعر مراقبہ کے بعد کہتا ہوں - یہ تو لطیفہ تھا لیکن عموماً یہی ہے کہ قافیہ پیمائی کے عوض زیادہ تر میری زبان بیان احساس میں مشغول رہتی ہے لیکن یہ مصرعہ جو آپ کو پسند آیا ہے ع اپنے ہی جس کا جوش ہے سب کچھ ہمیں میں ہے " سچی بات یہ ہے کہ میرا ابتدائی احساس نہیں تھا - یہ درحقیقت اسی کتاب انگریزی کے ایک باب کا بلکہ کل کا خلاصہ ہے جس کا ذکر میں نے آپ کو لکھا تھا

ایک شعر بیاض میں نظر آیا یاد نہیں کس عالم میں زبان سے نکل گیا تھا ؎

ہے بدگماں جو وہ بت پروا نہیں کچھ اس کی
ہر برہمن ہے شیدا اکبر کی کافری کا

۵؍ جون ۱۶ء صفحہ ۳۴

کل دوپہر کو میں نے چند شعر کہے کیا بے اختیار ذہن میں داخل ہو کر زبان پر آ گئے۔

صبح کو کہتا ہوں دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن
شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا

عمر یوں ہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ
عرصۂ ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

یکم اگست ۱۶ء صفحہ ۲۷

میں نے حال ہی میں ایک غزل کہی ہے دو شعر یہ ہیں۔

صورت فانی سے آخر کیوں یہ پہچانے گئے
مجھ کو حیرت ہے کہ یہ بت کیوں خدا مانے گئے

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہم کو لوگ
اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے

آپ کا مضمون "غم نہ کرو" بھی لائق غور ہے اگر خوشی و غم اختیاری ہے تو بے شبہ غم نہ کرنا چاہئے۔ میں تو یہیں تک ترقی کر سکا ہوں (وہ بھی پوری ترقی نہیں) کہ غم میں خوش رہوں اور اس کو اپنے حق میں مفید سمجھوں آپ کا بھی اصلی مقصود یہی ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ سر پر پتھر گرے تو چوٹ نہ لگنے دو یہی مطلب ہوگا کہ خوشی سے ہائے ہائے کرو یہ ٹھیک مصیبت میں دل لگی پیدا ہو جائے — میرا ایک نیا مطلع ہے کچھ واقعہ کچھ ظرافت

قید میں زیست کی بنیا وہلی جاتی ہے
پھر بھی ہے شکر کہ روٹی تو ملی جاتی ہے

۹؍ اگست ۱۶ء صفحہ ۳۹

میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا میں نے اُن کا خط دیکھ کر آپ کو مخاطب کرکے چند شعر کہے۔

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد
قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی

تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر
ہیں دشمن فتنۂ رقیباں وہ بھی

پریوں کے لئے جنون ہے تم کو اگر
دیوؤں کے لئے ہیں سلیماں وہ بھی

۱۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۵۲

آپ کے قبلہ وکعبہ کے مضمون پر اخبار مشرق میں کسی صاحب نے بہت کچھ فضول لکھ ڈالا ہے۔ جی چاہتا ہے جواب لکھوں۔ میں نے تو ایک دفعہ لکھا تھا۔ جناب جامع مسجد دہلی مدظلہ یہ کیا جناب من بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بلحاظ مرتبہ خطاب مناسب ہے بالفعل جامع مسجد دہلی آیندہ ترقی کیجئے گا تو کعبہ بھی لکھوں گا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۲ و ۵۳

عشرت سلمہٗ کو میرے یہ اشعار بہت پسند آئے ہیں۔

گو سعیٔ ہوائے شوق نے کی بو اس کی نہ نکلی محفل سے	مجنوں نے اڑائی خاک بہت لیلےٰ نے نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال باری کو	پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگ محفل سے
ایذا کا مجھے حس ہی نہ ہو فریاد و فغاں میں کیا کرتا	جس وقت نہ خنجر تھا گلا آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

۳ نومبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۷

"رات مولوی احسان اللہ صاحب عباسی گورکھپوری جنھوں نے بلا اصل متن کے قرآن مجید کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے اور میرے مکرم اور آپ کے بھائی احسان کے اسوۂ حسنہ کے نامہ نگار ہیں مجھ سے ملنے تشریف لائے تھے۔ فرماتے تھے کہ درود جو نماز میں پڑھتے ہیں کما صلیت علی ابراہیم وعلےٰ آل ابراہیم کما بارکت علی ابراہیم وعلےٰ آل ابراہیم اس سے امامت بارہ اماموں کی ثابت ہے اور میں تو لکھنؤ جاتا ہوں تو شیعہ مجتہدوں کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں البتہ ہاتھ باندھ کر پڑھتا ہوں کیونکہ عادت پڑی ہوئی ہے اور اس میں کچھ ہرج بھی نہیں ہے تبرّا پر مزاحمت نہیں کرتا کیونکہ مزاحمت سے ضد بڑھتی ہے خلفائے ثلاثہ کو دنیوی بادشاہی حاصل تھی روحانی سلطنت بارہ اماموں میں تھی۔

آپ کے دوست اسوۂ حسنہ کے لئے یہ مضمون مفید عام مولانا سے کیوں نہیں حاصل کرتے؟"

۲۳ نومبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۶۰

اقبال صاحب نے تو مجھ کو خط میں لکھا ہے کہ مسئلہ امامت کو انھوں نے مان لیا لیکن یہ نہیں اقرار کیا کہ میں شیعہ ہو گیا خانہ ساز عقائد سے دوسرا مذہب تو قائم نہیں ہو سکتا شغل زندگی سمجھئے۔

اپنا حال کیا لکھوں - لاالہ الاّ اللہ اور خفقان - ہسٹری پر نظر کرنے کی نہ فرصت نہ ضرورت شیعہ سنّی کو حلوا پلاؤ مبارک ہم کھا ہی نہیں سکتے ہضم ہی نہیں ہوتا زندگی سے مجبور ہوں - ہوا جو ہم نفس قطرہ بن گئی دم بھر - حباب نے بھی خودی کا مزا اُٹھا ہی لیا — علاوہ بریں ؎

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا غور جب ہم نے کیا سائنس کو دنیا پایا

۲۸ر نومبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۶۱

اس وقت شیعہ و سنی کے الفاظ بالکل بے معنی ہیں عملی پہلو کے لحاظ سے صرف ڈھانچے کا رکھ رکھاؤ سوشل مجبوری سے ہو رہا ہے - میرے دادا شیعہ تھے پردادا کی خبر نہیں غالباً سنی سپاہی تھے اب تو میں یہ کہتا ہوں ؎

شیعہ کو مجھ سے کچھ بھی خوف و خطر نہیں ہے ہو وہ علی تو باشد بندہ عمر نہیں ہے

آپ خدا کو مقدم رکھیں گے یعنی اللہ کو تو اکبر کو کیوں چھوڑنے لگے"

۴ر دسمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۶۵

اپنی بیاض میں یہ ایک شعر پاتا ہوں

ٹھیک ہے مصرع کا مضموں قافیہ گو سخت ہے اس دل نالاں ہوں جس سے وہ بڑا کمبخت ہے

مضموں میں خفت تو محل تامل ہے -

۶ر دسمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۶۵

میرا حال یہ ہے جہاں تک دنیاوی زندگی کو تعلق ہے ؎

جان مردہ ہے بدن افسردہ ہے مانند خاک میں رہا ہوں گا کبھی لیکن اب اپنی قبر ہوں

۲۰ر دسمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۷۱

آج صبح میں نے ایک مطلع کہا تھا ؎

فلسفۂ غم کا جسے معلوم ہے ہو مبارک وہ اگر مغموم ہے

۲۶ر دسمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۷۴

آج صبح میں نے یہ دو شعر اپنے حسب حال موزوں کئے تھے ؎

نہیں ہے جنبش کی اُنہیں قوت جو گفتگو کو کھڑے ہوئے ہیں

بندھے ہوئے اُن کے ہاتھ دیکھے ہیں پانوں اُن کے گڑے ہوئے ہیں
معاف رکھیں ہمیں خدارا انہی کو ہولیڈری مبارک
ہم ایک گوشہ میں اپنے اچھے دبے دبائے پڑے ہوئے ہیں

۲۴ر جنوری ۱۹۱۶ء صفحہ ۷۷

حالت طبعی تو بہرحال قابل شکر ہے ع بہے جاتے ہیں بے مقصود بحرِ زندگانی میں +
جینا بُرا نہیں ہے لیکن اللہ جینے میں دل لگا دے ؎
خودی کے جس سے بھی ہوتا ہے انتشار اکبر کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتہ نہ چلے
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی + کچھ ہماری خبر نہیں آتی + (غالب)

۴ر فروری ۱۹۱۶ء صفحہ ۸۰

مجھے اپنا یہ مطلع اکثر یاد آتا ہے اور اُس کے معنی پر غور کرتا ہوں ؎
اگرچہ تلخ ملا جام عمرِ فانی کا مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

یکم مئی ۱۹۱۶ء صفحہ ۸۲

مجموعۂ خطوط کا دیباچہ دیکھ کر مصرع کہا ہے ع
زمانہ مجھ کو گھٹا رہا ہے اور آپ مجھ کو بڑھا رہے ہیں

۳ر مئی ۱۹۱۶ء صفحہ ۸۲

خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا نہ لکھ سکا لیکن کلک اندیشہ صفحہ خاطر پر ہر وقت آپ کو خط لکھا کرتا ہے۔

۸ر مئی ۱۹۱۶ء صفحہ ۸۳ و ۸۴

میں کچھ نہیں جانتا کہ معاملات کہاں ہیں۔ خیالات کا کیا رخ ہے۔ گوشۂ عزلت و بیخبری میں رہتا ہوں۔ صرف قیاس کر لیا ہے کہ آسمان وہی ہے۔ رات ہے یا دن ہے، اللہ جانے۔
طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ ہمہ تن تبخیر سوداوی ہوا جاتا ہوں ؎
اظہار عقل میں ہیں احباب گرم کوشش
اور مجھ کو فکر یہ ہے اپنا جنوں چھپاؤں

۸ر جون ۱۹۱۷ء صفحہ ۸۷

پرسوں ایک قطعہ موزوں ہو گیا - شاید آپ کو بھی چوتھے مصرعہ پر لطف آجائے ؎

جویائے رازِ حسنِ ازل سے کہے کوئی — سن صوتِ سرمدی کو کلامِ مبیں کو دیکھ
ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ — معنی یہ ہیں کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

۲۷ر جون ۱۹۱۷ء صفحہ ۸۷ و ۸۸

خوب ہے اُردو میں لکھے جس نے حالاتِ کرشن — اُس مصنف کو مگر دلّی ہی پیدا کر سکی
وہ بگولا خاکِ خسروہی کے پہلو سے اُٹھا — جس کی گردش طبع کو اکبر جنوں سے بھر سکی
یہ اُمنگ آخر نظام الدین سے اُٹھی کہ جو — باسلیقہ ہاتھ سازِ عشقِ حق پر دھر سکی

پھر لکھوں گا اس وقت دست و دل دونوں بیکار ہیں - حور کو ذوقِ طاعت مبارک - خواجہ بانو کو حسین کی خدمت مبارک اور دونوں کو کرشن بیتی کا مصنف مبارک -

۱۴ر جولائی ۱۹۱۷ء صفحات ۸۹ و ۹۰ و ۹۱

مجکو تو اسی شاعرانہ خیال میں مزا آتا ہے ؎

ہوں عرب میں تو اک بزن بھی سہی — ہند میں ہوں تو اک بھون بھی سہی

ہوم رول کی نسبت میں نے بے ساختہ اشعار کہے اکثر بہت دلچسپ ہیں ؎

جو گایوں کے سینگوں میں ہو زور کچھ — تو شیروں کو روکیں بہت بن کے دوست
مگر اونٹ کا قول تو ہے یہی — تواضع زگردن فرازاں نکوست

ایک نظم اور ہے جس کی نقل ملفوف ہے فرمائیے کیسی ہے لیکن اور بہت اشعار بہت زیادہ دلچسپ ہیں شاید بھیج سکوں - کہہ تو لیتا ہوں لیکن صاف کرنا ادھر اُدھر بھیجنا اس دردِ سر کا تحمل مشکل ہوتا ہے ؎

مشرق کی کمیٹی دیکھی ہے مغرب کی اجازت سن لی ہے — نیٹو کی فقط اک مشق ہے یہ صاحب کی فقط خوش طبعی ہے
پبلک میں وہ ملکی حس ہی نہیں آزاد کوئی مجلس ہی نہیں — وہ جہل و تعصب مذہب کا سینوں میں ہر اک سو مخفی ہے
اردو بھی یہاں ہے گائے بھی ہے لعنت بھی ہے اور آمین بھی ہے — کچھ صلح کل انساں ہوں بھی اگر تعداد ہی ان کی کتنی ہے
ہم کو تو یہ خطرہ رہتا ہے آپس ہی میں جھگڑ جائے نہ کہیں — اونٹے بھی ہے اک تحریک بہت پوشیدہ اشارا کافی ہے

ضد اور عداوت چھوڑ کے تم لو عقل سے کام اور مرد بنو
بے اس کے حکومت ہو بھی اگر کون اس کو کہے گا اچھی ہے
لفظوں کا تموج کچھ بھی نہیں اک کھیل ہے یہ اک نقل ہے یہ
بازو کی بھی طاقت شامل ہو اس وقت میں وہ بامعنی ہے
نعمت ہے یہاں راحت کی گھڑی ہے من کی کہ یہ سب سے بڑی
نیچر بھی اسی سے راضی ہے اللہ کی بھی منظوری ہے
جو نقص ہے اس کو دور کرے ہر ہندو و مسلم غور کرے
احساس ہمارا کیسا ہے تعلیم ہماری کیسی ہے
جب ہوم بنے تو رول بھی ہو ہٹنی جو ہے تو پھول بھی ہو
اللہ کی مرضی جو کچھ ہو میں نے تو نصیحت کر دی ہے
اخلاق کی دیوی کہتی ہے یا مالوی ہوں یا مولوی ہوں
نیچے ہیں بہت اس درجہ سے کہتے ہیں جسے سلطانی ہے

Home = گھر rule حکومت۔ ہوم رول = حکومت خود اختیاری۔

۱۴ر جنوری ۱۸ء صفحہ ۹۴

خوش ہوا کہ آپ حضرت غوث اعظم کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں آپ نے دانشمندی کی کہ اس وقت گذشتہ صدیوں میں قیام اختیار کیا۔

۷ر فروری ۱۸ء صفحہ ۹۶

تاجرانہ اور اڈیٹرانہ اور لیڈرانہ اظہار علم کچھ اثر نہیں رکھتا۔ قرآن ہی کی نقل کیوں نہ ہو ؎

لاکھ چھانٹیں وہ مذہبی باتیں
فرق ہے شیخ و کلرک کی میں

۱۷ر مارچ ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۰۲

فلسفیانہ تصوف۔ عاشقانہ تصوف۔ پولیٹکل تصوف میں فرق بھی ہے میں نے صرف تذکرتاً لکھدیا تھا۔

دنیا چل رہی ہے اور ہنوز چلتی رہے گی کہ ہم چل چکیں گے
قافیہ خوب ملا ولی حسین پوچھتے ہیں کوٹھی کو آئیں گے
کب کس تاریخ کو
میں کہتا ہوں چوتھی کو۔

۱۲ر جون ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۰۶

جو مجھ پر گذری ہے جس پر یہ گذرے ایسا ہی ہو جائے — لٹریری مذاق کی کرامت ہے کہ زبان اور قلم سے۔ مجھ کو نہ صرف زندہ بلکہ بیداری کے ساتھ زندہ ظاہر کرتی ہے ورنہ اگر زندہ ہوں بھی تو عبرت اور دنیا سے[1] مایوسی کی گہری نیند میں سو رہا ہوں۔ کبھی پھر ملئے[2] کیا مزا ہو

[1] ادبی [2] کے اثر سے۔

اگر جواب دیجئے کہ "جب کہئے" اقبال صاحب سے بھی بڑا لطف تھا لیکن افسوس کہ اب ان کے سامنے شراب نہیں پی سکتا۔

شراب تصوف اور مے عرفاں۔

یکم جنوری ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۳۱

چاہتا ہوں کہ زندہ بھی رہوں تو زندگی سے چھپ کر زندہ رہوں۔ کیا مشکل آرزو ہے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۱۹ء

"غالباً تلاوت قرآن کی برکت ہے کہ حواس میں ہوں ورنہ اندرونی و بیرونی اسباب انتشار طبع مہلک نہوں تو جنوں انگیز ضرور ہیں ۔۔ ان صاحب کو کچھ قوت دی گئی ہے وہ ابھارے گئے ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ اگر شورش رفارم میں بے اعتدالی ہوئی اور چند نوخیزوں نے پبلک میں صلح کل اور سوشل آمیزش کا کھو کھلا اور ناپائدار رنگ دکھایا تو دوسری طرف مذہبی تعصب جو زبردست اور مقدس بڑے میاں کے لقب کا مستحق ہے مضموم کہا جائے گا اور فرق مختلفہ میں شدید جنگ شروع ہوگی جس سے روشن ضمیر نوجوان بھی بالاخر نہ بچ سکیں گے۔ میں خود عجیب دقت میں ہوں پبلک نے فرض کر لیا ہے کہ میں بڑا محب قوم اور اول درجہ کا رفارم خواہ ہوں حالانکہ میں قوم ہی کے وجود کو نہیں تسلیم کرتا میں نے لامذہبی اور تبدیل وضع کے خلاف قلم اُٹھایا تھا نہ کہ گورنمنٹ کے خلاف ۔۔ میرا وعظ محنت، توکل، سکوت، عبادت ہے لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا کہ رفتار فطرت کس جانب ہے ہر شخص کو اپنی حد جاننا چاہئے میں نہ معین نہ مزاحم"۔

میں اب ہرگز شہرت و نمود کا طالب نہ رہا　　محل امن یہی ہے کہ سب بھلائے رہیں

۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۳۹

برن صاحب کمشنر بنارس کلکٹر الٰہ آباد کے پاس آئے تھے مجھ کو لکھا تھا کہ ۱۷ر کو ۸½ صبح کو ملئے گا۔ تیار ہوا۔ خبر آئی کہ سواری نہیں ملتی نہ ایکہ نہ تانگا نہ گاڑی بلکہ سواری کو سڑک پر سے گذرنے ہی نہیں دیتے ۔۔ میں نے چٹھی بھیج دی کہ یہ حالت ہے کیونکر آؤں صاحب نے افسوس ظاہر کیا کہ ملاقات کی اور تاریخ مقرر ہوگی ۔۔ یہ بھی لکھا کہ اس واقعہ پر آپ کچھ لکھئے میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ آپ تو خود مصنف ان واقعات کے ہیں۔

۹؍فروری سنہ۱۹۲۰ء

محبت قائم رہے۔کیوں؟ اللہ کے لئے۔یہی ملاقات ہے ورنہ ملاقات وقت کا ضائع کرنا یاسوشل ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔

ٹیلیفون سے آپ کو آرام ملے گا — اگرچہ آج کل کون کس کی سنتا ہے

۲۰؍اپریل سنہ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۰

گرمی تیز ہوگئی سہ پہر کو اضطراب اعضاسے گرفت قلم دشوار ہوتی ہے۔امریکن پھر جفت برہمن۔اس دوآتشہ لیڈی نے صرف نیکی بدی کے تمیز کو حسن قرار دیا۔یہ یوروپین پالسی ہیں ہوسکتا ہے ہم اگر معصیت کریں اور جانیں کہ یہ معصیت ہے لیکن اس کو مخفی رکھیں تو نفس لوامہ سے کیونکر بچیں اور جب اس اندرونی ملامت کی تکلیف رہی تو پھر حسن کہاں۔

ایک امریکن لیڈی برہمن سے منسوب تھی اسنے خواجہ صاحب سے کچھ علمی گفتگو کی تھی۔

۲۰؍اپریل سنہ۲۰ء صفحہ ۱۵۱

ماتا پتا والا شعر محض ایک بے گناہ لطیفہ تھا۔معترض صاحب نے بدگمانی کرکے فقط اپنی کمزوری ظاہر کی تاہم میں نے معذرت کا عریضہ ان کی خدمت میں اسی وقت روانہ کردیا اس شعر کا ایسا پہلو تھا توکسی اخبار نے اس کو چھاپا کیوں مضمون نگار نے بھیجا کیوں مطلق خبر نہیں۔ناک میں دم ہے پوری بات منہ سے نکلنے نہیں پاتی نظر ثانی کا موقع نہیں ملتا اور وہ بات غرب سے شرق اور شمال سے جنوب تک جا پہنچتی ہے۔ظریفانہ پہلو طفل طبعوں کو بہت پسند ہے بہرحال امید ہے کہ میرا معذرت نامہ اڈیٹر صاحب ویش قبول فرمالیں۔

امام صاحب خطاب واپس کردیں تو کیا حرج ہے۔گورنمنٹ پر ظاہر ہو جائے گا کہ جبراً یہ بات ہوئی ہے۔بہت جلد یہ باتیں داخل افسانہ ہو جائیں گی۔

۲۶؍اپریل سنہ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۱و۱۵۲

ویش کو حسب ارشاد آپ کے لکھ دیا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ان اشعار میں کیا توہین کی گئی ہے اونٹ کا یہ کہنا کہ میں بھی عرب میں بے حد مفید جانور ہوں مجکو کیوں ذبح کیا کرتے ہو، دیکھو ہندوؤں نے گائے کو ماتا بنا رکھا ہے تم بھی میری تقدیس کرو باپ بناؤ

یہ صرف ایک شاعرانہ اخلاقی لطیفہ ہے۔ دلیش بھائی کیوں خفا ہو گئے ضبط و تحمل سے کام لیتے۔ مجھ سے پوچھتے میں نے ان اشعار کو کبھی پاس نہیں کیا معلوم نہیں کس نے کس اخبار میں لکھ بھیجا اگر یہ اشعار قابل اعتراض تھے تو اخبار والے نے چھاپا کیوں جو انگریزی تعلیم اور زمانہ کے اثر نے طبائع کو بہت بے ادب اور بدگمان کر دیا ہے میں تو اپنی تصنیف میں اس قسم کے اشعار پاتا ہوں ؎

قومی حالت میں ہندو اور تم یکساں کیا روک ہے پھر کہ ان کو بھائی نہ کہو
بے شک اس بات پر تعجب ہے بجا گنگا سے پلو اور اس کو مائی نہ کہو

کٹار پور والے معاملہ میں میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

افسوس ہے کہ شاعرانہ لطائف پر دلیش بھائی نے ایسا مورد الزام کیا آپ میری یہ تحریر اُن تک پہنچا دیں۔ میں نے یہ اشعار اپنی بیاض سے خارج کر دئے ہیں۔ میں پولیٹیکل رنگ کا مذاق تو کم رکھتا ہوں کیونکہ اپنا قانون ہی نافذ نہیں ہے لیکن صوفیانہ رنگ میں ہندو فلاسوفی اور ہندو میلان طبع سے بہت مانوس ہوں ــ دلیش بھائی سے میں انعام کا طالب نہیں ہوں۔ بڑی بات یہی ہے کہ ان کو رنج نہ پہنچے۔ بدگمانی نہ کریں معذرت چھاپ دیں اعتراض واپس لیں ان کو ذرا زیادہ زمانہ شناس اور عالی ظرف ہونا چاہئے۔ نیازمندان قدیم کو چشم زدن میں ساقط کر دینا بڑائی کی بات نہیں ہے صاحب لوگوں کا اقبال جو چاہے کرے مجھ سے تو ایک صاحب فرماتے تھے کہ ان اشعار میں شیخ صاحب کی ایک گونہ توہین ہے۔

۴ر مئی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۳

اس مضمون سے میرا مقصود یہ بھی تھا:۔

عرب کے لئے اونٹ اس سے زیادہ ضروری ہے جس قدر گائے ہند کے لئے باوجود اس کے عرب اس کو ذبح کرتے ہیں۔ ضروری اور مفید ہونے سے ان کے نزدیک کسی جانور کی تقدیس نہیں لازم آتی رہا حکم مذہب وہ اس باب میں ان کی کتاب میں بہت صاف ہے باوجود اس کے جو اس وقت مسلمانوں نے گائے کی قربانی سے احتراز کرنے کا میلان ظاہر کیا ہے تو برادران ہند کو خیال کر لینا چاہئے کہ یہ محض یہ خیال حسن معاشرت اور پاس ہمسایہ اور

از دیاد محبت باہمی و ہمدردی کے لئے ہے۔

وہ مضمون ناتمام تھا کسی صاحب نے بلا میری اطلاع کے اخبار میں بھیجدیا اور چھپ گیا دیش بھائی بدگمان ہوئے ماتا پتا کے الفاظ صرف شاعرانہ بندش تھی لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ رومی لوگ دریائے طبرس کو باپ کہتے ہیں " فادر ٹائیبر" انگریز لوگ شاید دریائے ٹیمز کو بھی باپ کہتے ہیں لہذا ماتا پتا میں کچھ ہنسی کی بات نہیں ہے۔

ہم لوگوں کے لئے رونے اور دعا کرنے اور عاجزی کرنے اور محبت بڑھانے کا وقت ہے، ہنسنا اور توہین کرنا کیا معنی۔ مجھ کو ویش صاحب نے خط بھی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ اب آپ کی وقعت و محبت میرے دل میں چہار چند ہوگئی کیونکہ آپ نے معذرت کی بہرکیف میں ان کا نیاز مند ہوں۔ میں مفصلہ بالا مضمون ان کو نہیں لکھ سکا۔

۲۶ رمئی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۴ و ۱۵۵

اس وقت آپ کے مضمون ذاتی عمل پر اعتماد دیکھ کر گو افسوس جاتا تو نہیں رہا لیکن اس کے زیادہ اظہار کی جراءت نہ ہوئی۔ آپ نے میرے یہ اشعار جو چھاپے کہاں پائے میں تو اس وقت بہت احتیاط و سکوت سے کام لیتا ہوں آپ کو میری نزاکت تعلقات کا خیال نہ رہا اب یہ اشعار ترجمہ ہو کر مشتہر ہوں گے بے نتیجہ اور ضرر انگیز بات سے بچتا ہوں ورنہ کیا بات ہے۔ آپ کو تو بڑا خیال رہتا تھا معلوم نہیں اس وقت آپ کہاں تھے۔ ہمدردی نہ سہی ضرر رسانی سے احتراز چاہئے۔ کم سے کم پوچھ لینا چاہئے۔ میں ضعیف اور تبخیر کے سبب سے اکثر اوقات ٹھیک نہیں کہہ سکتا سالونیکا کا ذکر اب ترکوں کو چڑانا ہے آپ کو شاید میری ظرافت کا اظہار مقصود ہوا۔ میری کوئی خطا ہو تو للہ معاف فرمائیے چراغ سحری ہو رہا ہوں (رعیت میں ایک پرانا شعر "سالونیکا والا چھپ گیا تھا)۔

۲۹ رمئی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۶

مجھ کو اپنا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے   شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے

پیٹ بڑا لیڈر ہے چاہتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈروں لیکن بیوقوف مشہور ہونے سے بھی ڈرتا ہوں۔

۱۲ر جون ۱۹۲۰ء

میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

یہ تو سچ ہے جی لگا کر چاہیئے پڑھنا نماز — یہ بھی سن لو جی لگا کر سانس لینا چاہیئے

مضمون ایسا ہے جہانتک لکھئے گنجائش ہے

جناب من۔ گھوڑا مر گیا۔ تانگا ٹوٹ گیا۔ کیا اچھے فقرے تھے مزا آ گیا۔ شکستہ حالی بحال داتا کا خیال فقر کا رنگ۔ طاعت کی امنگ۔ اللہ ہی کے آگے ہاتھ۔ زندگی کے لئے دنیا کا زبانی ساتھ۔ درویشوں کا جتھا۔ حق حق اور برہم کتھا۔ خواجہ جئیں لاکھ برس۔ اللہ بس باقی ہوس محمد حسین میاں رات کو کوچ کر گئے۔ ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ ہمہ تن پُرانا مضمون۔ اوپر خدا نیچے افیون۔ دل عبرت زدہ ہے دنیا غم کدہ ہے۔

حسن نظامی نے لکھا تھا گھوڑا مر گیا تانگہ ٹوٹ گیا۔

۲۶ر جولائی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۶۱ ر ۱۶۲

(واحدی صاحب کے نام)

خواجہ صاحب کی نئی تصنیف میں گیارہ برس باقی ہیں کسی یوروپین کی تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مجکو اپنا ایک شعر یاد آیا۔ میں نے ایک دوسری دلیل قرب قیامت کی پیش کی ہے ایک اور شعر بھی اس کے ساتھ ہے ؎

ہوش میں لائی ہیں اب بوسیاں — نشۂ امید فردا ہو چکا

عشق سے کہدو قیامت ہے قریب — حسن کا سنتے ہیں پردا ہو چکا

(بے پردگی کا رواج) ایک اور شعر یاد آیا ؎

علمی خبروں میں یہ خبر بھی ہے عجیب — شیطان کو ارتقا نے دجال کیا

اس کی تائید بھی اسی تالیف سے ہوتی ہے۔ شاعرانہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ کسی حسین کی عمر اس وقت تین سال کی ہے لہذا گیارہ سال قیامت کو باقی ہیں۔ ایک پرانہ مصرعہ یہ بھی ہے

ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

ممکن ہے اس کی تکمیل کو گیارہ سال باقی ہوں۔

۱۰راگست ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۶۲

خود اپنی ہستی کا احساس بار ہے نہ کہ ساری دنیا کے تعلقات۔ اس وقت مسلمانوں کو عظیم خطرات کا مقابلہ ہے ع اے قصہ گوے بد رضرورت حرا کی ہے۔

پولٹیکل پہلو کو چھوڑ کر روحانی مذاق کی حفاظت کے لئے ایک جماعت قائم کیجئے۔

۱۱راگست ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۶۴

کل نماز مغرب کے فرض کی دوسری رکعت میں ایک سرخ بھیڑ نے بائیں چھنگلیا میں اس زور سے کاٹا کہ سارے بدن میں درد اور تکلیف کی بجلی دوڑنے لگی۔ (لوگ) کہتے ہیں کہ فرشتوں نے بچالیا میں کہتا ہوں فرشتوں نے کاٹنے ہی کیوں دیا۔ حسن عقیدت کا یہ خیال ہے کہ کسی بیماری کی آمد تھی خدا کی طرف سے یہ اپریشن ہو گیا۔ خیر جو کچھ ہو۔ دنیا تکلیف کا گھر ہے امید فردا وقت ضائع کرنے کے لئے ایک نسخہ ہے۔

اگر ہم لوگ اس قدر نہ بلبلائیں لائڈ جارج اور پوپ کے حضور میں رونا نہ روئیں تو ان کو اپنی دست درازیوں اور فتاحیوں کا پورا مزا نہ ملے۔ اس تصور سے بہت افسوس ہوتا ہے حوادث اپنا کورس پورا کر رہے ہیں۔

۱۶راکتوبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۶۷ و ۱۶۸

حسین کی لکنت زبان کی کچھ پروانہ کیجئے انشاء اللہ اس کی آیندہ عظمت میں خلل نہ پڑے گا دل لغزش سے محفوظ رہے گا۔ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب نے ہندی پڑھانا اس کا علاج بتایا تھا۔ میرا دل تو اس بات پر جما نہیں۔ ہندو ڈاکٹر تھے سمجھے کہ شین قاف میں پیچ پاچ ہے کا کھا گا گھا سیدھی راہ زبان کی ہے کیا ہندی میں لکنت نہیں ہوتی۔ یہ لطیفہ سنئے گاندھی کے ساتھیوں میں جو ہیں وہ نیک بھی ہیں۔ مہراج اور مہاجر کے حروف ایک ہی ہیں لوگ پوچھتے ہیں ان ہنگاموں کا کیا نتیجہ ہو گا؟

یہ دھوتی سے باہر وہ پتلون سے　　　غرض کس کو ہے آج قانون سے

شاید اچھا جواب یہ ہے کہ دنیا نتیجے کی جگہ نہیں ہے نتیجہ آخرت میں معلوم ہو گا۔

یکم فروری ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۷۰

مولوی صاحب نے بزور علم خوب تاریخ کہی۔ حور کے لئے پری ان کو داد دیتا ہوں۔ لیکن شاعرانہ داد نہیں دے سکتا۔ مرد کے لئے پری چہر کچھ خوب نہیں۔ مصرعے جو لگائے گئے ہیں پری چہرہ کے ساتھ قافئے صحیح نہیں بہر حال مولوی صاحب مستحق داد ہیں۔ خوشی کا موقع ہے۔ ہیچے لگانے کی ضرورت نہیں۔

حور بانو کی لڑکی کی ولادت پر ایک صاحب نے تاریخ کہی تھی جس میں پری چہرہ کا لفظ آیا تھا۔

۳۰ مارچ ۲۱ء صفحہ ۱۷۱

زمیندار کا یہ اندھیر دیکھئے۔ دو تین اشعار میں مجھ پر بدگمانی ہے کہ پنشن کی لالچ سے چپ ہوں یا ادھر سے سازش ہے۔

میں تو چپ نہیں ہوں۔ پولٹیکل[1] کبھی نہیں رہا۔ فلاسوفیکل[2] صوفیانہ طرز ہے میرے مضامین کی ان کو کیا خبر خواہ مخواہ کی کد ہے۔ اگر ایسوں کی گواہی پر فیصلہ ہو تو جنت غیر آباد رہ جائے گی۔

[1] سیاسی [2] فلسفیانہ۔

۱۳ اپریل ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۷۳

عزیز لکھنوی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میرے اس نئے شعر کی داد دی ع
انہی الفاظ سے اب ذہن خفتہ کو جگاتا ہے شریعت سر جھکاتا ہے طریقت دل لگاتا ہے

۱۶ جون ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۷۵

میری دنیا ہو چکی ہے زندگی باقی ہے اس کا بسر کرنا دشوار ہے ع بہے جاتے ہیں بے مقصود بحر زندگانی میں ایک خط میں ایک فقرہ لکھ گیا ہوں اختصار اور معنی کو دیکھئے عشرت میاں چاہتے ہیں کہ آرام سے رہوں خوش رہوں لیکن آرام کی عمر میں خوشی کی عملداری نہیں۔ غالباً اس فقرے کو آپ لٹریری اور پبلک مال قرار دیں۔

الہ آباد ۲۷ اگست ۲۱ء (آخری خط)

اپنا حال کیا لکھوں جس قدر میں زندگی سے تنگ ہوں زندگی کو اس کا اندازہ نہیں ورنہ میرے ساتھ ہمدردی کرتی اور ختم ہو جاتی۔

اخلاق و عادات

رات کو پچاس ساٹھ شعر کہہ لئے پوری ترتیب سے یاد رہ گئے تو ان کو صبح کے وقت جب کبھی موقعہ ملا لکھوا دیا۔

شوق مطالعہ بہت تھا۔ ہر مذاق کی کتابیں پڑھتے تھے خصوصاً ادب و زبان کی تحقیقات، فلسفہ و منطق کے مباحث، مختلف مذاہب کے رسائل، ان خطوط سے جو عبدالماجد صاحب کے نام ہیں اس کا پتہ چلتا ہے۔

اخلاق و عادات ہر شخص سے خلق مجسم ہو کر ملتے تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ یہی سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ مجھ پر مہربان ہیں۔ نماز اور روزے کے ہمیشہ پابند رہے اوامر و نواہی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آخر عمر میں اور خصوصاً مرگ ہاشم کے بعد گوشہ گیری اور عزلت نشینی اختیار کر لی تھی احباب کے نام جو خطوط بھیجے ہیں ان میں اکثر دنیا سے دل برداشتہ ہو جانے کا ذکر ہے۔

دیباچہ خطوط اکبر از خواجہ حسن نظامی صفحہ ۴ و ۵

تمام خطوط پر غور کرنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت کا حس بہت ہی نازک تھا اور وہ ایک معمولی بات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو جاتے تھے چنانچہ اخبار تہذیب نسواں کے ایک معمولی اعتراض کے نسبت ان کے متعدد خط اس مجموعہ میں ہیں اور اخبار درویش کے طعن پر بھی انھوں نے کئی خطوط لکھے ہیں۔

کچھ تو قدرتی طور پر وہ نازک مزاج تھے اور کچھ ذہن کی غیر معمولی تیزی ان کو پریشان کرتی تھی اور کچھ جسم کی کمزوری اور اعصاب دماغ و قلب کی ناتوانی کا بھی اس میں دخل تھا جس کو وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ شباب میں ایک مرض کے علاج کے لئے ان کو کوئی ایسی تیز دوا دی گئی تھی جس سے خلط سوداوی میں احتراق پیدا ہو گیا تھا جو وفات کے وقت تک کبھی کبھی عود کر آتا تھا۔

ذکی الاحساسی موصوف نہایت درجہ ذکی الاحساس تھے یہی وجہ ہے کہ جو بات کہتے تھے نہایت دور اندیشی اور احتیاط سے کہتے تھے۔ صرف سیاسی معاملات میں نہیں زندگی کے ہر شعبہ میں اُن کی احتیاط بہت تھی جو کبھی بڑھتے بڑھتے وہم کے درجہ تک پہنچ جاتی تھی الفاظ پورے طور پر معانی کے

تمام پہلو ظاہر نہیں کر سکتے اسی خیال سے اکثر خفیف باتوں کا اثر بہت لیتے تھے خود کہتے ہیں ؎

غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبر بڑی دشواریوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے

ماتا پتا کا ایک ظریفانہ شعر کہا تھا اُس پر اخبار وکیل نے اعتراضات کئے تھے۔ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی کے حصہ آخر میں آٹھ دس صفحے توضیح مطالب سے بھرے ہوئے ہیں اس معمولی سی بات کو موصوف نے نہایت درجہ اہمیت دی ہے۔

تحقیق الفاظ کے نہایت دل دادہ تھے اور تبادلہ خیالات میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ جس وقت مولانا عبدالماجد صاحب اپنی معرکتہ الارا کتاب فلسفہ جذبات کی تالیف میں مصروف تھے انھوں نے انگریزی مصطلحات فلسفہ Pain اور Pleasure کے لئے لذت والم کے الفاظ پیش کئے تھے۔ اسی تجویز پر الہلال کے صفحات میں مباحثہ چھڑ گیا۔ خطوط کے جو اقتباسات دئے جائے جاتے ہیں ان میں اسی طرف اشارہ ہے۔

مکاتیب اکبر صفحات ۱، ۲ و ۳ و ۴ و ۶ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۴

"مدتیں گذریں میں نے جسمانی آرام و تکلیف اور دلی خوشی اور رنج کا مضمون پیش نظر رکھ کر یہ خیال کیا تھا کہ آرام اور رنج کا ساتھ ہو سکتا ہے اور تکلیف اور خوشی کا ساتھ ہو سکتا ہے یہ کوئی نازک خیالی نہ تھی مگر اس بنیاد پر ایک سلسلہ مضمون چل نکلا تھا پورا نہ ہوا اور میں اور کاموں میں اُلجھ گیا اسی ضمن میں، پین، پلیژر، اور چند دیگر الفاظ کے متعلق کچھ نوٹ کئے تھے الہلال میں یہ بحث دیکھ کر میں نے بغیر زیادہ غور کئے ایک خط ایڈیٹر صاحب کو لکھ دیا جس کو انھوں نے چھاپ دیا جہاں کانکریٹ ایڈیار Concrete ideas (تصورات مادی۔ تصورات محسوسات) نہیں ہیں وہاں ایک زبان کے لفظ کے مقابلہ میں دوسری زبان میں کوئی لفظ پانا جو بلحاظ تمام Shades of meaning (نازک فروق معانی) بالکل مطابق ہو بہت مشکل ہے مجھ کو خیال آتا ہے کہ ہملٹن نے جو بلحاظ صفائی بیان کے بہت ممتاز سنا جاتا ہے (اب تو وہ داخل دفتر ہو گیا۔ Sir William Hamilton سر ولیم ہملٹن انیسویں صدی کے ربع اول میں اسکاٹلینڈ کا مشہور فلسفی گذرا ہے" عبدالماجد) افسوس ظاہر کیا ہے کہ انگریزی میں یونانی فلسفہ کے الفاظ کا پورا مفہوم ادا کرنے کو الفاظ نہیں ملتے جب یہ صورت ہے تو غیر ذمہ دار لوگوں کے مشورے پر

عمل کرنے میں آپ کا تامل حق بجانب ہے۔ بعد غور کے میں اپنے خط کو واپس لیتا ہوں۔ آپ نے کوئی شعر نہیں کہا، کہ میں کہہ سکوں کہ فلاں لفظ کے عوض میں فلاں لفظ ہو تو زیادہ معنی خیز ہو۔ آپ اصطلاحات علمی کی بنیاد قائم کرتے ہیں اگر ہماری زبان یا مشرقی لٹریچر میں اس نے رواج پالیا (جس کی امید بہت کم ہے) تو ان کی پابندی خواہ مخواہ لازم آئے گی بلحاظ Definitions ڈیفینیشن (تعریفات) کے ذہن مفہوم قائم کرنے میں خطا نہ کرے گا۔ راحت والم۔ راحت و اذیت۔ لذت و اذیت۔ حظ و کرب وغیرہ میں جو چاہیئے لے لیجئے۔ میں آپ کے شعر سُن کر بہت محظوظ ہوا۔ ان سے ملنے میں کچھ حظ آیا۔ حظ نفسانی سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اردو فارسی میں بلاشبہ یہ الفاظ پلیژر کے مفہوم میں مستعمل ہیں۔ کرب تو عربی میں بھی تکلیف و مصیبت کے معنی میں مستعمل معلوم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں پڑھتا ہوں۔ **ولقد مننا علی موسیٰ وھارون ونجینا ھما و قومھما من الکرب العظیم** البتہ کرب شاید بین کا پڑھا ہوا رجہ ہے لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں تعریفات لکھ کر جو اصطلاحات مقرر کر دیجئے گا اس کی پابندی ہو جائے گی۔ کم سے کم مفہومات میں اختلاف نہ ہوگا اور یوں تو ہر شخص کا دل ہے۔ کوئی عاشق آہ کرتے ہیں حضرت قیس کے سروں کا پابند نہیں۔ ہم لوگوں کو حق نہیں ہے کہ بغیر شرکت اور ذمہ داری کے آپ کو ٹوکیں۔

آپ کی کل تحریر سے مجھ کو اتفاق ہے بجز اس کے ہیپینس Happiness کا ترجمہ لذت میں ابھی نہیں سمجھا لیکن تھوڑی سی گفتگو کے بعد سمجھ لینے کو تیار ہوں گا الفاظ کو ہمارے مفہومات کا تابع ہونا چاہیئے مدت سے مجھ کو یہ آئیڈیا تھا لیکن کالکٹو سیکالوجی کا لفظ آپ سے سنا اور بہت خوش ہوا۔

(مضمون Article

میں نے الہلال کے آرٹیکل نہیں دیکھے تھے صرف اسی پر نظر پڑی ہے کہ حظ و کرب، لذت والم کس کو ترجیح ہے۔ پہلے دونوں لفظ بہت مانوس تھے، میں نے الہلال کو دو سطریں لکھ بھیجیں اس کے بعد میں نے آرٹیکل پڑھے آپ کی مشکلات کا خیال آیا لہذا میں نے دست برداری کی ؎

نہ گفتہ ندارد کسے با تو کار ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

"دانم چرا نگویم" کی تو افراط ہے لیکن مدد اور کام کی بات بہت کم ہے۔

عضویات (عبدالماجد صاحب نے لفظ مستعمل وظائف الاعضا کے بجاے فزیالوجی کے لئے عضویات کا لفظ پیش کیا تھا) مجھ کو بھی بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن یاے نسبت لگائیے تو الف اور ت کو حذف کر دینا ہی (یعنی عضوی) اولا نظر آتا ہے۔ طبیعات سے طبعی۔ لیکن متنازعہ لفظ تو حظا ہے اور شاید کرب بھی۔ اس کے متعلق کچھ نوٹ لکھ دئے ہیں (حضرت ماجد نے مصطلحات نفسیات کی فہرست راے زنی کے لئے بھیجی ہے) کتابیں بند پڑی ہیں اور بے ترتیب ہیں کچھ مدد نہ لے سکا۔"

غالباً علماے مصر نے ان علوم میں مغربی فلسفہ سے باخبر ہو کر تصنیفات کی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو کیوں ان سے بشرط امکان موافقت نہ کی جائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ان جملہ الفاظ کو پبلک کے سامنے بغرض کریٹیایز (Criticism تنقید مراد ہے) پیش کر دیں اور بعد کسی بحث کے جو پیش ہو فیصلہ ہو۔

آپ نے خط میں جو مضمون متعلق الفاظ سابقہ Prefix ولاحقہ Suffix وغیرہ کے لکھا ہے وہ نہایت صحیح ہے Happiness and misery کا ترجمہ دکھ سکھ بہت اچھا ہے لیکن یہ الفاظ اس انجمن میں بے وقعت ہیں۔

اتفاقاً مولوی حمید الدین صاحب سے ملاقات ہوئی (مولانا حمید الدین صاحب بی۔ اے۔ اعظمگڈھی جو اس وقت الٰہ آباد کالج میں عربی کے پروفیسر تھے) وہ فرماتے تھے کہ Prestige کا ترجمہ دھاک صحیح ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ خیال آیا کہ شاید رعب میں بھی مطلب پورا ہو جاتا ہے میں نے اُردو میں مفہوم کے اعتبار سے سطوت کو پاکیزہ لفظ سمجھا تھا البتہ خود تاثری کی ترکیب صحیح نہ معلوم ہوئی۔ یاے توصیفی اسم صفت میں بڑھاتے ہیں خود متاثری البتہ ہو سکتا ہے بعد استعمال غیر مانوس نہ رہے گا۔

Abstract ideas کا ترجمہ لوگوں نے منتزعہ کر رکھا ہے۔ انتزاع سے جن کے معنی کھینچنے اور نکالنے کے ہیں آپ نے شاید کوئی اور لفظ لکھا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہوگا ورنہ شاید میں نظر کرتا۔ لیکن آپ نے نہ خیال کیا ہو تو اب خیال کر لیجئے اگر لفظ موضوع موجود ہو تو عدول کا

کیا ضرورت۔

پرسٹج کے لئے ایک لفظ وقار رات میرے ذہن میں آیا لیکن صرف اُردو بول چال میں یہ لفظ آئیڈیا کے قریب ہے۔ تمہارا وقار جاتا رہا تمہارا بڑا وقار ہے حظ (بہرہ مندی) کا ٹھیک اپوزٹ ٹرم (لفظ مقابل Apposite term) کو سوائے حرمان (بے نصیبی) کے کوئی نہیں ملتا لیکن حرماں میں پین کا ائڈیا صریحی نہیں ہے اُردو میں مایوسی کے معنوں میں شعرا کی زبان پر ہے۔ یاس و حرماں غالباً کہ سکتے ہیں وہ محظوظ ہوئے میں محروم رہا لذت والم میں کچھ حرج نہیں لیکن واضع مصطلحات کو اختیار ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ لفظ وقار پرسٹج کے لئے نہایت اچھا بلکہ ٹھیک اسی سنس Sense (مفہوم) میں ہے جس میں انگریز پرسٹج کا لفظ یہاں استعمال کرتے ہیں۔ دھاک اور رعب اسٹرانگ ٹرمس (تیز الفاظ Strong terms) ہیں وقعت بہت ڈھیلا لفظ ہے وقار سطوت کی طرح سجل سڈول اور آپ کی پسند کے لائق ہے اور روزمرہ میں داخل ہے اس کے لغوی معنے میں بھی (وزن، دباؤ گراں ہونا) پرسٹج کے لغوی معنی کا آئڈیا تاویلاً موجود ہے۔

آپ نے محاورہ اُردو سے استدلال کرکے لفظ حظ و محظوظ کو میری نظر میں پلیژر سے ایسا موافق اور قریب کر دکھایا ہے کہ میں لذت کی سفارش اسی بنا پر کرسکتا ہوں کہ وہ بھی کام دیتا ہے اور شاید پاپلر (مانوس Popular) ہے۔

آپ مس ماڈ (ایک مشہور رقاصہ انگلستان) سے آگاہ ہوں گے، برہنہ ہو کر ایسا ناچتی ہیں کہ شائقین سائنس داں کو وجد آجاتا ہے ہندوستان آرہی ہیں لوگوں نے روکنا چاہا نہ رکیں پائنیر لکھتا ہے اگر اس ناچ کی اجازت ملی تو The prestige of white woman in India would be somewhat injured. اب ذرا دیکھئے پرسٹج یہاں کس سنس میں مستعمل ہوا ہے۔ دھاک کا لفظ موزوں نہیں شاید سطوت بھی بے موقع ہو بلکہ وقعت کا لفظ ٹھیک معلوم ہوتا ہے وقعت میں بھی دھاک کا ائڈیا موجود ہے۔ اطلاعاً لکھا گیا۔

میں نے پرسٹج کا ترجمہ وقار آپ کو لکھا اور اسی پر اطمینان ظاہر کیا۔ لیکن غور کے بعد معلوم ہوا کہ جہانتک "دھائٹ رومن" کے فقرہ سے تعلق ہے وقار نہایت ٹھیک ہے لیکن انگلش

ریس کا پرسٹج انڈیا مین وقار کے سینس میں ۔ بہت صحیح نہیں معلوم ہوتا ہم کبھی کہتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب کا حکام میں بہت وقار ہے اس سے رعب وسطوت کا مفہوم نہیں نکلتا۔ لہذا آپ کی سطوت (عبدالماجد صاحب کا لفظ مجوزہ) قائم رہتی ہے۔ رعب ہو یا سطوت رعب میں Intensity (گداز) زیادہ ہے سطوت کے معنی حملے کے ہیں لیکن رعب کا مفہوم بھی ہماری زبان میں تو ہے۔

مکاتیب اکبر بنام حضرت عزیز لکھنوی

صفحات ۴۸ و ۴۹ و ۵۰ و ۵۱ و ۵۲ و ۵۵

"آمن کو مؤنث بولتا ہوں ۔ قیاس ہے کہ میم مفتوح ہو مگر سنا ہے مکسور"۔

تنباکو کی بحث میں کلیم کے قلمی دیوان میں ایک شعر خوب مل گیا ؎

بزم عشرت روشنائی از کجا پیدا کند آتش مے رفت وجایش دود تنباکو گرفت

(رنجور صاحب)

اصلاح سخن کو ملاحظہ فرما کر دو چار دن میں واپس کیجئے۔ حضرت نامہ نگار کے نزدیک تمام الفاظ فارسی مثل شنبہ، عنبر وغیرہ کا املا غلط ہے۔ عرب کے تصرف بیجا کا نتیجہ ہے۔ تنبا کو پر رفارم کیا گیا ہے۔ شمبہ اور دمبہ بھی جائز ہے ۔ دمبے میں تو دم کی رعایت بھی ہے۔ شعر را بلا رسیہ کہ برو + کا حال ہے۔

تنباکو غیاث میں بھی موجود ہے اور تمام کتب فارسی میں یہی املا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایجاد اہل لکھنؤ میں تانیث ہے اور میری زبان پر بھی یہی ہے ۔

نوح صاحب (شاگرد داغ) نے مجھ سے یہ امر دریافت کیا تھا میں نے ۔ لکھ دیا کہ نون سے لکھنا صحیح ہے انھوں نے میرے حوالے سے اصلاح سخن میں ایک تحریر بھیج دی انھوں نے اور شواہد پیش کئے تھے ۔ میرا بھی ذکر تھا ۔ اگر کوئی یہ کہتا کہ اب تو لوگ تمباکو بھی لکھتے ہیں، صحیح ہو یا غلط، رواج بھی ایک سند ہے تو وہ سچ کہتا۔ چالیس برس بعد یہ اُردو نہ رہے گی۔ ایک صاحب نے تو کمال کیا کہ فارسی کے اس اصول املا ہی کو غلط ٹھہرا دیا معلوم نہیں عربی اور عبرانی کو کیوں چھوڑ دیا۔ انصاف اسی کا مقتضی ہے کہ کہدیں املا کی تحقیق مد نظر تھی چونکہ لوگ تمباکو لکھتے ہیں میں نے بھی

غلطی سے لکھ دیا لیکن پاس سخن کا مرض اور وہ اس سے محفوظ ہوں!! وہ ہرگز ایسا نہ کریں گے اور میں تو ڈرتا ہوں کہ جس نے تمباکو لکھا ہے وہ میم پر اڑ جائے گا۔ اصول رخصت، فارسی شکست کلکتے والے کی ڈگری لیکن زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔ میں نے جو لکھ دیا وہی ٹھیک۔ تمام لغات فارسی ن کے شاہد ہیں۔ ایک نہیں بیسیوں شعر شعرائے ایران کے جن میں یہ املا ہے اور بلا استثناء یہ قاعدہ جاری ہے۔ کم علمی۔ بے ہنری۔ عدم تحقیق کے ساتھ ضد اور حسد کا بھی زور ہے اگر یہ نہوتا تو حریف کی خوش اقبالی کیونکر ثابت ہوتی۔ اسی وجہ سے میرا دل نہیں چاہتا کہ میں زبان کھولوں یا قلم اُٹھاؤں۔ میرا علم بھی نہایت کم اور نہایت ناقص ہے۔ انگریزی میں علم الالسنہ کی کتابیں دیکھ کر وسعت اور مشکلات علمی کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ ہاں صاحب تین البکا کی ذرا تشریح و توضیح کیجئے تنبا کو کن اعتبارات سے اس لفظ کا مدلول ہو سکتا ہے اور تین البکا کے کیا معنی ہیں۔ رونے کی سوکھی گھاس یا کیا۔

مضمون در تحقیق لفظ تنباکو

اصلاح سخن کا پرچہ لاہور سے مدت کے بعد شایع ہوا ہے۔ کسی صاحب نے جو فارسی لٹریچر سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں خوب طبع آزمائی کی ہے لکھا ہے کہ ہم شکسپیر کی ڈکشنری کو نہیں مانتے۔ تمباکو ٹھیک ہے۔ میں تو ان مباحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ علم گُم ہو گیا ہے۔ مادہ تحقیق جاتا رہا ہے۔ محمد نوح صاحب رئیس تارہ ضلع الہ آباد نے جو حضرت داغ کے شاگرد ہیں مجھ سے ایک مرتبہ پوچھا کہ تنباکو کا املا کیا ہے، میں نے کہا ن سے ہے انھوں نے جلیل صاحب کا رسالہ تذکیر و تانیث دیکھ کر کہا اس میں تو میم سے لکھا ہے۔ میں نے کہا مجھ کو تو ن ہی سے لکھنا سکھایا گیا ہے اور حضرت جلیل کا رسالہ، تذکیر و تانیث کی سند ہو سکے املا کی تحقیق سے کیا تعلق بعد اس کے میں نے دیوان ناسخ دیکھا جو مطبع نولکشور میں چھپا ہے۔ شاید دس بارہ سال ہوئے اس میں یہ شعر ہے ؎

منہ لگاتے ہی نئے قلیان بنی ہے نے شکر
دود تنباکو نسیم باغ رضواں ہو گیا

ن سے املا ہے، شکسپیر ڈکشنری میں بھی یہی املا تھا۔ اسی بنا پر محمد نوح نے اصلاح سخن

میں کوئی مضمون لکھا تھا، اب اس کی تردید چھپی ہے ملاحظہ فرمائیے علاوہ ان سندوں کے
جن کا ذکر کیا گیا میں نے بہار عجم کو دیکھا جو ایک مشہور کتاب ہے اور مطبع نولکشور میں چھپی ہے اس میں
بھی لفظ تنباکو نؔ سے ہے فارسی دیوان کلیم میں جس کا قلمی نسخہ بخط ولایت کئی سو برس کا لکھا
ہوا مولوی شبلی صاحب کے پاس موجود ہے اس میں یہ شعر ہے ؎

بزم عشرت روشنائی از کجا پیدا کند　　آتش مے رفت و جایش دود تنباکو گرفت

صاف اور صریح طور پر نؔ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے لٹریچر میں تنباکو کا
یہی املا تھا۔ اگر ہم نے اُس کے مطابق لکھا تو کیا گناہ کیا۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کے
دلگداز میں تنباکو کا اشتہار ہے اس میں بھی نؔ ہی سے املا ہے۔ رسالہ لسان العصر میں بھی لائق
ایڈیٹر نے تنباکو کو نؔ ہی سے لکھا ہے۔ صرف شکسپیر ڈکشنری کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ قدیم
فارسی کتابوں میں تنباکو کا املا نؔ سے ہے۔ ترقی کا زمانہ ہے۔ زبان اور املا ستقل نہیں ہے،
لفظ پوچھنا (پرسیدن) کے معنی میں ہے۔ بہت لوگ پونچھنا لکھتے ہیں۔ سیکڑوں کو سینکڑوں
لکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جب بہت لوگ ایک طریق کو اختیار کر لیتے ہیں تو وہ امر برائے خود ایک سند ہے۔ بہرحال
گو اس وقت لاکھوں آدمی بہ صیغۂ تذکیر بولتے ہیں لیکن جو بہ تانیث بولتے ہیں ان پر
اعتراض نہیں ہے۔

صفحہ ۱۳۱

تنباکو کا شکر گزار ہوں۔ دیکھوں گا کیسا ہے۔ آپ کی رائے تنباکو کی تذکیر و تانیث
کی نسبت صحیح ہے لیکن ایک وقت میں مدعیان زباندانی اُردو کی لکھنؤ میں یہ رائے تھی کہ خوردنی
تنباکو تانیث کے ساتھ بولا جائے لہٰذا یہ کہنا چاہئے کہ وہ مختلف فیہ ہے دونوں جائز ہیں۔

اپریشن ۱۵؍ دسمبر ۱۹۰۹ء بمقام کلکتہ

لسان العصر کی آنکھ کا اپریشن ہوا معًا ان کے دل میں ایک مضمون پیدا ہوا اور اُسی وقت اشعار موزوں کرکے لکھوا دئے

MILTON ON HIS BLINDNESS.

When I consider how my life is spent
Ere half my days, in this dark world and wide,
And that one talent which is death to hide
Lodged with me useless, though my soul more bent
To serve therewith my Maker, and present
My true account, lest he returning chide,—
Doth God exact day-labour, light denied?
I fondly ask;—But Patience to prevent
That murmur, soon replies; God doth not need
Either man's work, or His own gifts! who best
Bear this mild yoke they serve Him best, His state
Is kingly; thousands at His bedding speed
And post over land and ocean without rest—
They also serve who only stand and wait.

میں نے مرشد سے کیا جا کر یہ اک دن التماس
کارِ دنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اُداس
جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر
آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر
فلسفہ نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ (واقعہ)
میری چشمِ طبع کو عارض ہے غربی کیٹرکٹ (موتیا بند)
میرے حق میں کوئی فکرِ سالوشن کیجئے
ہو سکے تو مذہبی ایک آپریشن کیجئے
کی توجہ حضرت مرشد نے میرے حال پر
اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہِ تیز کا
کٹ گیا وہ رنگ محسوسات کفر انگیز کا
پھر درِ دل پر مرے تقویٰ کی ٹٹی باندھ دی
آنکھ پر شوقِ لقائے حق کی پٹی باندھ دی

(اپریشن نے بٹھایا ہے مجھے گوشہ میں)

اپریشن کے سبب سے ہوں پڑا گوشہ میں — اے ہجوم ہوس دید نہ تو روند مجھے
پہلے تاریک و مکدر تھی نظر اے اکبر — اب جھکا جھک کے سبب سے ہے چکاچوند مجھے

۳۱ر دسمبر ۱۹۰۹ء

ڈاکٹر مینارڈ ہیں اپنے ہنر میں لاجواب — ہاتھ ان کا برق ہے نشتر شعاع آفتاب
ہفت سالہ تھا مرض اک پل میں زائل ہو گیا — آنکھ روشن ہو گئی جاتا رہا سارا حجاب
پانچ ہی دن میں نہ پٹی تھی نہ وہ بستر کی قید — حسن کلکتہ تھا اور میری نگاہ انتخاب

ڈاکٹر مینارڈ کو اللہ رکھے شاد کام
اور رہے خلق خدا ان کے ہنر سے شاد کام

یہ نظم ڈاکٹر صاحب موصوف کے فرمایش سے لکھی گئی اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں فریم میں لگا ہوا ہے۔

غیر مطبوعہ کلام

یکم اپریل ۱۹۲۸ء۔ از بیاض سید اکبر حسین صاحب ریٹائرڈ سب رجسٹرار

تغزل

تری ترچھی نظر سے ہم کو ڈر کیا
محبت کی تو پھر دل کیا جگر کیا

شب فرقت سے مر مر کے بچا ہوں
مگر سچ ہے تمہیں میری خبر کیا

عنایت دل سے بس کافی ہے مجھ پر
ادھر کے بیٹھنے میں کیا ادھر کیا

چلا جاتا ہے اک میلا ادھر سے
خدا جانے تماشے ہیں ادھر کیا

لبوں تک سو جگہ آتی ہیں رک کر
ان آہوں میں بھلا ہو گا اثر کیا

زباں سے کیا کہوں خود دیکھ لینا
ابھی دونوں کی الفت کا اثر کیا

سادگی

واللہ خوب ہی ہوئے یاروں کے جمگھٹے
مطلب یہ تھا سرور بڑھے اور دم گھٹے

کھانے بھی خوب کھائے اڑیں پنجیں بھی خوب
لیکن ہوا یہی کہ بڑھے آپ ہم گھٹے

انقلاب

وہ دل ہی اب نہ رہا عشق کی تھی جس میں امنگ
طبیعت اب وہ کہاں جس میں تھا مذاق کا رنگ

ستم رسیدہ ہوں میرے لئے خوشی کیسی
جو دل ہی ٹوٹ گیا ہو تو دل لگی کیسی

کسی زمانہ میں ہاں ہم بھی رند مشرب تھے
اسیر گیسوئے پیچاں تھے کشتۂ لب تھے

اکڑ کے ملتے تھے یاران سرو قامت سے
غضب کا جوش تھا ڈرتے نہ تھے قیامت سے

خیال شام ہی رہتا تھا کچھ نہ فکر سحر
ہمیشہ رہتی تھی گیسو و رخ پہ اپنی نظر

خوش ہی رہتے تھے دن رات غم سے کام نہ تھا
میان کوچہ افسردگی مقام نہ تھا

جو بزم رقص میں پہنچے تو رات بھر بیٹھے جدھر حسینوں کا جھرمٹ ہوا ادھر بیٹھے
جگت مذاق سے خالی کوئی کلام نہ تھا وہ رنگ تھا کہ تکلف برائے نام نہ تھا
نگاہ پڑتی تھی ہر اک کی اپنی صحبت پر تمام شہر کو تھا رشک اپنی عزت پر
کہاں تلک کوئی باغ جہاں کی سیر کرے دعا یہ ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے

معاشرت

کہا یہ حضرت واعظ نے مجھ سے آج اے اکبر عبث شوق تن آسانی و جاہ و حکمرانی ہے
قناعت پیشہ ہو یاد الٰہی میں بسر کر دے یہ سب شور ظہور عالم ایجاد فانی ہے
جواب اس کا دیا میں نے کہ بیشک بات تو سچ ہے
مگر حضرت یہ طرز زندگی ہندوستانی ہے

تہذیب

کہتے ہیں اکبر یہ میری عقل کا کیا پھیر ہے طبع تیری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ حاضر ہوں گا میں بھی عنقریب ہو چکا ہوں پیر بس نابالغی کی دیر ہے

تغزل

لے گئے لحد سے تبرک سمجھ کے خاک مٹی خراب کی مرے اعمال نیک نے

سیاست

کمیٹی میں نہایت سچ کہا کل شیخ چھیدی نے کہ ٹرکی کو مصیبت میں پھنسایا گھر کے بھیدی نے

ممبری

کیا خبط ہے کہ شان ریاست ہے ممبری پبلک میں ایک ذریعۂ شہرت ہے ممبری

ہاں بے زروں کے واسطے دولت ہے ممبری　　بے عزتوں کے واسطے عزت ہے ممبری
سچ پوچھئے تو قابل نفرت ہے ممبری

ایام انتخاب کے آئے قریب جب　　ہونے لگیں خوشامدیں ووٹر کی روز و شب
بھائی چچا کا پھر انہیں دینے لگے لقب　　کہنے لگے تمہیں پہ ہے دار و مدار سب
اپنی تو بس تمہاری بدولت ہے ممبری

موٹر فٹن کی ڈاک ہے اکثر لگی ہوئی　　ایک ایک کے سواری ہے گھر گھر لگی ہوئی
ہے ووٹروں کی جان بلا میں پڑی ہوئی　　یاروں کی بھیڑ جن کے ہے در پر کھڑی ہوئی
جنجال ہے وبال ہے آفت ہے ممبری

طرہ یہ ہے کہ اس پہ ہے سارا زمانہ لوٹ　　ملّی مخالفوں میں ہے باہم غضب کی چوٹ
ہر ایک چاہتا ہے کہ مل جائے ہم کو ووٹ　　پروا نہیں ہے۔ شوق سے بک جائے ہیٹ کوٹ
فاقہ سے گر ملے تو غنیمت ہے ممبری

ممبر جو ہو گئے کہیں بھولے نصیب سے　　پھرتے ہیں اینٹھتے ہوئے شکل عجیب سے
گذرا جو راہ میں کوئی ووٹر قریب سے　　لیتے نہیں سلام بھی اب اس غریب سے
ناز و غرور و کبر و رعونت ہے ممبری

اس ممبری کو دور سے بس کیجئے سلام　　ممبر وہ ہے خوشامدی ٹٹو کا دے جو کام
دانہ ہے اور نہ گھاس کھریرا ہے صبح و شام　　بیگاری اہل شہر کا حکام کا غلام
بیٹھے بٹھائے مفت کی خدمت ہے ممبری

پر چارہ کار بھی نہیں اس کے سوا ہمیں　　کچھ انتظام کا نہیں ملتا پتہ ہمیں
بھائی یہ ممبر و جو کمیٹی سدا ہمیں　　جی ہاں حضور کہنا مکرر بدا ہمیں
اس واسطے ذریعۂ شہرت ہے ممبری

قطعہ

دشمن دین مبین ..... بدکیش لعین　　حیدر آباد سے جب کفر کا جمّال آیا

اکبر زار بھی اسرو زپئے استقبال — ریل تک ہانپتا اور کانپتا بد حال آیا
غیب سے آئی صدا سال ورود مردود — عیسوی سن کی قسم نائب و جال آیا

ممبری

ہاروں ہزار بار نہ آئے حیا مجھے — تیوری پہ بل بھی آئے تو دینا سزا مجھے
دشمن کے آگے لاش بھی گر ہو پڑی ہوئی — اک بار پھر میں اینٹ اکھاڑوں گڑی ہوئی
ساقی کتاب خانہ قانون کی قسم — دو کا نہا ہے غلہ و پرچون کی قسم
کاکا کو جو ہوا اسی طاعون کی قسم — بھاگوں نہ لالہ جی کی قلمدون کی قسم
ہٹ جاؤں دو ہی لاتوں میں بکیں نہیں موں میں — سمجھا ہے کیا ایل ہوں گھاگس نہیں موں میں
اس ممبری کے واسطے سب گھر بھی ہے نثار — زر کیا ہے اس محلہ کا زرگر بھی ہے نثار
گھوڑا نثار اونٹ بھی خچر بھی ہے نثار — یہ پونے چھ ہزار کا موٹر بھی ہے نثار
جب بات آپڑی ہے تو دو کان بھی فدا — دو کان کون چیز ہے ایمان بھی فدا
دیکھیں ہرائے جائیں وہ کب تک ہرائیں گے — اب ہم کو بھی یہ ضد ہے کہ ہر بار جائیں گے
کتنا ہی زور ہم کو مخالف دکھائیں گے — تم دیکھنا کہ باز نہ ہم ہرگز آئیں گے
ہم سر پہ ایسی کتنی ہی چوٹیں اٹھا چکے — پچیراسیوں کے ہاتھ سے دھکے بھی کھا چکے
اکبر یہ غور کرکے ذرا دل میں دیکھئے — تھکنے پہ بیٹھتے نہیں محفل میں دیکھئے
غیرت نہیں ہے آنکھ کے بھی تل میں دیکھئے — امسال پھر بھی دوڑتے ہیں کونسل میں دیکھئے

از بیاض مشتاق احمد صاحب ایم اے فائنل

تصوف

ملو گاندھی سے اے اکبر اگر سڑکوں پہ سجے چاہو — جھکو سلطاں کے آگے اگر فرمانِ رے چاہو
شریک بزم رند عافیت جو اکے ہو جاؤ — جو ذوق بیخودی ہو اور دور جام مے چاہو

حالات حاضرہ

آپ نے واپس یہ کیا کیوں خطاب — بیٹھے ہیں کیوں گوشہ میں مغموم و ست

کہنے لگے اس کا اثر ہوگا کیا ۔۔۔ نازبراں کن کہ خریدار تست

غلامی

شوخیٔ غرب سے گھبرائی جو شرقی رندی ۔۔۔ بت نے انگڑائیاں لیں دیر میں جھکی ہندی
لب پہ آیا یہ سخن کیسی اُٹھی ہے آندھی ۔۔۔ لہجۂ صبر و متانت میں یہ بولے گاندھی
ذہن عالی سے ترشنے لگے قانون نئے ۔۔۔ عاجزی ہم کو سجھانے لگی قانون نئے

تعلیم جدید

خوب ہنگامہ ہے جس کی ہر طرف تائید ہے ۔۔۔ آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے
مستحقان ادب نے آپ کو رسوا کیا ۔۔۔ آپ کے دعوی عظمت کی بھی اب تردید ہے

انگلش کو خدا نے بادشاہی دی ہے ۔۔۔ رفتار زمانہ نے گواہی دی ہے
مدو بھی لگاتے ہیں مدریا کا دم ۔۔۔ ہندو کو چلم جو لالہ شاہی دی ہے

اثر دور فلک کا پڑ رہا ہے جو زمانے پر ۔۔۔ تمہارے یہ ریزولیوشن اسے کم کر نہیں سکتے
کریں گے وہ ترقی ہم جو ہے ذاتی و روحانی ۔۔۔ تمہارے ساتھ اس ذلت کا ماتم کر نہیں سکتے

Resolution = تجویز۔ تحریک۔

نشان شوکت گاندھی کجا بود ۔۔۔ کہ اکبر صرف کشف ماجرا بود
بجاے ملک لیکن مدعا یش ۔۔۔ خدا بود و خدا بود و خدا بود

کس سوچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں ۔۔۔ گاندھی تو وجد میں ہیں یہ کیوں اچھل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپیلیں فریاد اور دلیلیں ۔۔۔ اور کبر مغربی کے ارمان نکل رہے ہیں

ستیاگرہ

شب وصال میں گاندھی کا وعظ آفت ہے　　یہ حکم ہے کہ نہ بڑھئے مساس کی حد سے
ہر اک کی رگ میں نہیں ہے سکون روحانی　　یہ ضبط سہل نہیں جذبہ مجرد سے
نگاہ دور ہی رکھو خیال کافی ہے　　بجز فساد کے حاصل نہیں کچھ اس کد سے

گاندھی سے کیوں ہو وحشت باطن کی مسٹری ہے　　شوکت سے کیوں کھسکیں ان کی تو ہسٹری ہے

شیخ جی کو ذرا کھلانا ہے　　لالہ صاحب کو دیکھے بھالے ہیں

دھوتی کے پیچ میں ہیں تہمد میں تن رہے ہیں　　صاحب بنا رہے ہیں ہم لوگ بن رہے ہیں

تیغ زباں کی دیکھو ہر سو برہنگی ہے　　بابو کی ہیں کلیلیں صاحب کی دل لگی ہے

طلبِ گاندھی و گورنمنٹ کو برہم نہ کرو　　ہاتھا پائی سے شب وصل کی کچھ غم نہ کرو

آسمانی توپ چلتی ہے کمیں صدیوں کے بعد　　لیکن اُڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

جو گرہ میں تھا حریفوں نے اُڑایا اس کو مفت　　اب فقط اخبار میں اور من چہ گویم او چہ گفت
وہ اُٹھنے دیتے ہیں خود فتنہائے بے حقیقت کو　　کہ تا حاصل کریں اس کے فرو کرنے کی لذت کو
نہیں کہتا کہ چھوڑیں شغل ملکی دردمندی کا　　بس اک نظارہ کر لیں آ کے شملہ کی بلندی کا

اظہار جوش طبع میں وقت اپنا کھو چکے　　اُمنگھے جناب شیخ بھی گاندھی بھی ہو چکے
پنڈت سکھائیں پیچ میں پڑ کے تو کیا کریں　　کابل کے بل سے گائے جو بھڑکے تو کیا کریں

دور گردوں میں نیا ہر روز اک ہنگامہ ہے　　شاہنامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے

مرگ ہاشم

الہ آباد ۲۲ مئی ۱۳ء صفحہ ۸۴ مکاتیب اکبر بنام حضرت عزیز لکھنوی

"ہاشم سلمہ اصرار کر کے بمبئی دیکھنے گئے تھے۔ میں بسبب گرمی اور اپنی ناتوانی کے نہ جا سکا لیکن ان کا انتظام اور ان سے مراسلت قائم رکھنے کے لئے الٰہ آباد میں قیام ضروری تھا۔ ہاشم چوتھے روز بمبئی میں بیمار ہو گئے، یہ دانشمندی کی کہ فوراً واپس آئے۔ تپ میں بیہوش پہنچے۔ اس وقت چیچک میں مبتلا ہیں غافل پڑے ہیں۔ اللہ شفا دے۔

۹ جون ۱۹۱۳ء صفحہ ۸۵

آپ کس طرح اس خبر کو سننے کو تیار ہوں گے کہ میرے نور نظر زندگی کے سہارے ہاشم نے ۵ جون کو دنیا سے رحلت کی۔ بیس دن علیل رہا چیچک نکل کر دانے ڈھل گئے تھے۔ لیکن پھر تپ آئی اور بالآخر سرسام ہو گیا۔ جو حالات موجودہ تھے ان سے آپ آگاہ ہیں اسی لڑکے سے گھر تھا۔ میرے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ بہت کچھ ترقی کی تھی۔ افسوس کہ چودھویں سال میں یہ مہ پارہ غروب ہو کر نظر کو تیرہ و تار کر گیا میں زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ ایسے ہونہار بچے کا اُٹھ جانا اور میرا دل شکستہ ہو جانا اس کی توضیح کے لئے مذہبی فلسفہ میں بہت تعمق چاہئے۔ میں اس وقت مضطرب ہوں، ضبط تو کر رہا ہوں لیکن ابا ابا کی صدا کانوں میں گونجتی ہے۔ اس لڑکے نے شعر اور اُردو لٹریچر میں بہت بصیرت حاصل کی تھی۔

۱۶ جون ۱۹۱۳ء صفحہ ۸۷

معیار میں اندراج خط کیا ضرور۔ حسرت و اندوہ کا بڑھانا ہے۔ خدا صبر دے اور حکمت و معرفت عطا فرمائے۔

یکم جولائی ۱۹۱۳ء صفحہ ۸۷ و ۸۸

ابتداءً طبیعت میں ایک سخت ہیجان پیدا ہوا۔ خدا جانے کیا خیالات تھے اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا اور دنیا ہی کیا۔ زندگی بھی حیرت انگیز ہے۔ جو افسردگی پیدا ہو گئی ہے وہ فقط فقدان غفلت ہے۔ مجھ کو معلوم نہیں میں نے خط میں کیا لکھا تھا

اگر زیادہ بے صبری اور خدا فراموشی نہ ٹپکتی ہو تو شایع ہو سکتا ہے اصل یہ ہے کہ مجھ کو اب اس خیال کا بھلا دینا ہی جہاں تک ممکن ہو مناسب معلوم ہوتا ہے۔

الہ آباد ۲۸ر اگست ۱۹۱۳ء صفحہ ۸۹

دنیا کی بے ثباتی نظر سے اس قدر قریب ہو گئی ہے کہ حواس کو قائم رکھنے میں تکلف محسوس ہوتا ہے ؎

زندگی کی انجمن ہیں وہ نہو اور میں رہوں ‏ اللہ اللہ یہ مصیبت بس اب آگے کیا کہوں
روکتا ہوں دل کو لیکن اس کی خواہش ہے یہی ‏ خون ہو کر آنسوؤں کے ساتھ ہی میں بھی بہوں
مقتضا قانون فطرت کے ادب کا ہے سکوت ‏ آرزو تو ہے یہی جب وہ نہیں میں بھی نہ ہوں
خیر جو کچھ ہو خدا سے ہے یہ اکبر کی دعا
امر طاعت پر رہوں قائم سہوں جو کچھ سہوں

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۹۲

طبیعت پر غم مستولی ہے۔ رات بے ساختہ یہ اشعار کہے۔

ناصحا آخر میں دل کی پاسداری کیا کروں ‏ یہ تو بتلا کر کے ترک آہ و زاری کیا کروں
وہ چمن ہی جل گیا جس میں لگائے تھے شجر ‏ اب تجھے پا کر میں اے باد بہاری کیا کروں
جان ہی کا جسم میں رہنا ہے مجھ کو ناگوار ‏ دوستوں سے ادعائے دوستداری کیا کروں
(شکل ہاشم سامنے ہے)
یاس ہے آنکھوں کے آگے نظر ہے برق دل ‏ ایسی صورت میں علاج بے قراری کیا کروں

خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی

الہ آباد ۱۰ر جون ۱۳ء صفحہ ۱۴

بیشک نازک وقت ہے اور آپ میرے پاس ہوتے تو اچھا ہوتا آپ شریک غم ہیں اور اہل دل میرے تمام خیالات اور فلسفہ پر ہنوز شدت الم غالب ہے۔ سینہ میں الجھن دماغ میں گرمی محسوس ہوتی ہے۔ بہت کم روتا ہوں لیکن دل ہر وقت بھرا ہوا اور آنکھیں

آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہیں کوشش کرتا ہوں کہ ہاشم کے بدلے ہاشم آفرین کا تصور کرکے اس سے فریاد کروں۔ مدد چاہوں لیکن وہ بھولی صورت اور پیاری آواز چشم و گوش پر ہنوز محیط ہے۔ پھر اس بچے کے ارمان اس کی بے بسی اس کا اللہ اللہ کرتے رہنا نازوں کو چھوڑ کر اس چودھویں سال کی عمر میں بیکسانہ اور عاجزانہ فریاد پر آجانا۔

معاذ اللہ ان باتوں کی یاد دل پر بجلی گراتی ہے۔ میں تو اس کا مذہبی فلسفہ تلاش کرتا ہوں یا قرآن و حدیث سے کوئی توضیح تاکہ دل کو فی الجملہ تسکین ہو۔ وہ لڑکا میری طبیعت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کے معانی پر پیشتر سے غور کر کے ان حوادث کے لئے تیار نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ کون تیار ہوتا ہے انا للہ کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی خدا کے لئے لڑکا بھی خدا کے لئے۔ میں سمجھتا تھا لڑکا میرے لئے"۔

مکاتیب اکبر بنام عبدالماجد صاحب بی اے

۱۴ ستمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۶

میرا لڑکا سید ہاشم جو نہایت ذہین۔ ہونہار۔ توانا۔ بالا بلند، موزوں طبع، عاقل، خدا پرست، شعر فہم۔ میرا خادم و مشیر تھا اور جس نے چودھویں سال میں قدم رکھا تھا ایک مرض سرسام میں مبتلا ہو کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ بی بی پہلے مر چکی تھیں۔ وہی لڑکا دنیاوی زندگی کا سہارا تھا۔ مذہب اور فلسفۂ تصوف نے دیوانگی سے محفوظ رکھا لیکن بے حد افسردہ اور دنیا سے بے تعلق ہو گیا ہوں ہوش و حواس سے مجبوری ہے۔

مرگ ہاشم ۵ رجون ۱۳ء

اک زمانہ تھا کہ مجھ کو اپنے دل پر ناز تھا
ہر مصیبت میں وہ میرا مونس و دمساز تھا

بزم ہستی میں کدورت سے رہا کرتا تھا پاک
گو حوادث کے لئے اک فرش پا انداز تھا

میرے ہر اندیشہ مضطر کا تھا وہ غمگسار
ہر نفس میرے لئے وہ گوش بر آواز تھا

انقلاب دہر سے بے اعتنائی تھی اسے
اس میں حیرت آفرینی تھی تو وہ طناز تھا

پیش آیا ناگہاں وہ اک فراق روح سوز — برق بیتابی بنا جو صبر میں ممتاز تھا
اب وہی آرام جاں اک زخم پہلو ہو گیا — کیا یہی وہ دل ہے اکبر مجھ کو جس پر ناز تھا
ہاں وہی دل ہے کہے گا تجھ سے اک دن نالہ سے — تیر صدمہ خوبی انجام کا آغاز تھا

فریاد مجنونانہ

جس سے میری زندگی تھی مر گیا۔ کیوں مر سکا — چرخ نے یارب ستم مجھ پر کیا۔ کیوں کر سکا
واقعات جانگزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع — کیوں نہ میری آہ سے قانون فطرت ڈر سکا

صدمۂ فرقت میں کر کے مبتلا — آج ہاشم عازم جنت ہوا
قوت بازوے عشرت چل بسی — اور مرا نور نظر رخصت ہوا

بڑے بھائی کے لئے چھوٹا بھائی قوت بازو ہوتا ہے ———

آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا — ابا سنائیے تو کیا آپ نے کہا ہے
اشعار حسرت آگیں کہنے کی تاب کس کو — اب ہر نظر ہے نوحہ ہر سانس مرثیہ ہے

مرگ ہاشم

دست بستہ پا شکستہ دل فسردہ لب بہ مہر — کچھ نہ کچھ کرتا ہے ہر اک اے خدا میں کیا کروں
یہ دل بیتاب مجھ کو کر رہا ہے کیوں تباہ — ہو گئی اک بات تھا حکم قضا میں کیا کروں
نزع میں پیک اجل سے کہہ رہا تھا اک حسیں — تو قضا لایا ہے سر پر میں ادا اب کیا کروں
شکوۂ بیداد کرتا ہوں تو کہتا ہے فلک — خود بخود مجھ سے ٹپکتی ہے جفا میں کیا کروں

آخری لمحات زندگی

از شفق رضوی عماد پوری

۹ محرم ۱۳۴۰ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) ۳ بجے دن کو حضرت لسان العصر نے داعی اجل کو لبیک کہی آٹھ روز مرض پیچش میں مبتلا رہ کر رحلت سے دو دن پہلے بیہوشی طاری ہو گئی کسی کو نہ دیکھتے تھے نہ پہچانتے تھے زندگی کی آخری رات سنبھالا تھا۔ ہوش آیا تو اُٹھ بیٹھے اور فرمایا عینک لاؤ قرآن شریف پڑھوں گا کہا گیا رات ہے صبح کو تلاوت فرمائیے گا نگاہ پر زور پڑے گا ارشاد ہوا اب تک میری کوئی نماز تہجد سمیت قضا نہیں ہوئی اور نہ تلاوت ناغہ ہوئی اب بھی پڑھنا چاہتا ہوں یہ کہتے کہتے پھر غشی طاری ہوئی۔

حسن نظامی صاحب لکھتے ہیں

جمعہ کے دن گیارہ بجے میں دہلی سے الہ آباد پہنچا اس وقت حضرت کے فرزند عشرت حسین کے سوا کوئی اور احباب و اقربا میں موجود نہ تھا حضرت گاؤ تکئے کے سہارے لیٹے تھے آنکھیں نیم باز تھیں پتلیاں اوپر کو چڑھ چکی تھیں ناک کا بانسہ ڈھل گیا تھا آخری پسینہ آرہا تھا پاؤں سمٹے ہوئے تھے قریب بیٹھا تو عشرت میاں نے کہا خواجہ صاحب دلی سے آگئے ہیں اس کا جواب نہ دیا میں نے ہاتھ کو اُٹھا کر چوما اور آنکھوں سے لگایا جب بھی بظاہر ان کو خبر نہ ہوئی اس کے بعد حزب البحر آواز سے پڑھنے لگا اور جب یہ فقرہ پڑھا نعم الربُّ ربی و نعم الحسب حسبی (اچھا خدا میرا خدا اور اچھا ٹھکانا میرا ٹھکانا) عَین اللہ ناظرۃٌ الینا (خدا کی آنکھ ہماری طرف دیکھ رہی ہے) تو اسی طرف ہاتھ کر دیا اور میں نے کئی بار تکرار کی حزب البحر کے بعد میں کلمہ پڑھنے لگا اور جب میں نے پڑھا لا موجود الا اللہ تو حضرت کے ہاتھ میں رعشہ کی جنبش ہوئی اور میں نے دیکھا ہونٹوں کو بھی جنبش ہے کچھ پڑھ رہے ہیں اسی طرح رفتہ رفتہ سانس ہلکی ہونے لگی اور تین بجنے میں ۳ منٹ باقی تھے کہ سانس ختم ہو گئی اور زندگی پوری ہو گئی ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

تجہیز و تکفین

جناب مولانا عبد الکافی صاحب دام فیضہٗ نے غسل دیا شہر الٰہ آباد خسرو باغ کے قریب دہلی والی سڑک کے متصل جو قبرستان ہے کالے ڈانڈے کے نام سے مشہور ہے اس قبرستان میں اپنے والد ماجد کے بائیں جانب دفن کئے گئے بارش زیادہ ہونے کے سبب شہر میں عام خبر نہ ہوئی اور رات کے دس بج گئے تھے اس لئے آدمیوں کا مجمع نہ ہو سکا تقریباً پچاس آدمی جنازہ اُٹھانے اور دفن میں شریک تھے قبر میں جب مرحوم کی لاش اُتاری گئی اور کفن کھولا تو آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں اس وقت حاضرین کو ان کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

قبر میں آئی تجلی روے جاناں کی نظر　　زہر سمجھا تھا جسے وہ شربت دیدار تھا

تاریخ وفات

"لسان العصر" سید اکبر حسین صاحب الٰہ آبادی

گفت با عقل اسد چوں بشنید　　خبر ختم حیات اکبر
چیست تاریخ وفات اکبر؟　　گفت "تاریخ وفات اکبر"

۱۹　۲۱

محمد اسد اللہ خاں بی۔ اے ملتان

خواجہ حسن نظامی

موت نے ۱۰ر محرم ۱۳۴۰ھ کو جمعہ کے دن خود حضرت اکبر کی زندگی کا مباحثہ ختم کر دیا (خطوط حضرت اکبر الٰہ آبادی)۔

سب سے آخری دو شعر

موت کی غشی طاری ہونے سے پہلے بیاض خاص میں دو شعر لکھے تھے جو کئی آدمیوں کی مدد سے بمشکل پڑھے گئے ؎

صاحب میں سب بُرائی لیکن وہ خوب چوکس — گاندھی میں سب بھلائی لیکن وہ محض بے بس

دنیا تو چاہتی ہے ہنگامہ پرو جن — اور یاں ہے جیب خالی جو مل گیا وہ بھوجن

عمر

قمری حساب سے ۱۲۶۱ھ سے ۱۳۴۰ھ تک = ۷۹ ۳۹/۴۰ برس ایک دوست کو ۱۳۳۷ھ میں خود لکھا تھا کہ میری عمر ۷۵ سال قمری سے تجاوز کر چکی ہے۔

انگریزی حساب سے ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۱ء تک = ۷۵ ۵۴/۲۱ برس

نوحۂ اکبر

ہائے اکبر تاجدار کشور ہندوستاں
ایک مدت سے زبانِ قوم تھی جس کی زباں
تیرے گلشن میں بھی آخر آگئی فصل خزاں
کیوں نہوں اہل الہ آباد سرگرم فغاں

آج ملک ہند میں کوئی ترا ہمتا نہیں
ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اور کوئی تجھسا نہیں

مختصر لفظوں میں کہہ دینا ترا ہی کام تھا
بات بھی ہوتی تھی اور پیغام کا پیغام تھا
بس یہی اک مشغلہ دن رات صبح و شام تھا
جو کہا تونے زباں سے وہ صلائے عام تھا

لوگ آیا کرتے تھے کوسوں سے سننے کے لئے
باغ سے تیرے گل امید چننے کے لئے

نکتہ رس شیریں کلام و صاحب ذہن و ذکا
ہمصفیران چمن میں بلبل رنگیں نوا
تھا چلن فریاد کا تیری زمانے سے جدا
ہے ترا دیوان اک آئینہ عبرت نما

یوں تو کل دیوان گویا اک سراپا درد ہے
سمجھے گا اتنا وہ جس کے دل میں جتنا درد ہے

تیرے ہاتھوں پردہ داروں کی حمیت رہ گئی
گھر کی عزت رہ گئی بہنوں کی عصمت رہ گئی
پردہ در جو ہوگئے ان میں بھی علت رہ گئی
کھل کر آئیں سامنے ایسی نہ ہمت رہ گئی

ڈوبتی کشتی سنبھالی تونے اس طوفان میں
ورنہ رہ جاتی حمیت کچھ نہ ہندوستان میں

کنج تنہائی سے قومی کام تو کرتا رہا
سرد آہیں بستر غم پر پڑا بھرتا رہا
پھونک کر میدان قومی میں قدم دھرتا رہا
قوم ہی کے ساتھ تو جیتا رہا مرتا رہا

نالے کرتا تھا مگر لئے اور ترانہ دیکھ کر
ساتھ چلتا تھا مگر رنگ زمانہ دیکھ کر

کام کی باتیں بتانا کوئی تجھ سے سیکھتا
عیب اخلاقی جتانا کوئی تجھ سے سیکھتا

خود نہ ہنسنا اور ہنسانا کوئی تجھ سے سیکھتا   اور ہنسا کر پھر رُلانا کوئی تجھ سے سیکھتا
شعر تیرے یوں تو گویا کھیل ہیں اطفال کے
ہیں سران دہر قائل پر ترے اقوال کے
روز و شب یہ کام ہی ہے لیڈران قوم کا   دیکھتے ہیں ہو چکا کیا اور آگے ہو گا کیا
آئے دن وہ اک سنا دیتے ہیں افسانہ نیا   ہے مگر سچ اب بھی برسوں پہلے جو تو کہہ گیا
"اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا"
بات کل کی ہے جو تو زینت دہِ کاشانہ تھا   مجمع اہل سخن تھا جلسۂ رندانہ تھا
سامنے تیرے لئے ہر میکش اک پیمانہ تھا   آج دیکھا تو وہی گھر ایک ماتم خانہ تھا
آگئی فصل خزاں اکبر گئی دل کی بہار
ساتھ اپنے لے گیا تو اپنی محفل کی بہار
ماجد محزوں کی بھی دل سے یہی ہے اب دعا   گلشن جنت میں تجھ کو حق کرے مسکن عطا
قوم دے گی اس طرح خدمات کا تیرے صلہ   بزم اہل دل میں ہو گا ورد تیرے نام کا
لوگ سب چیزوں سے پیاری جانتے ہیں جان کو
جان سے بڑھ کر وہ جانیں گے ترے دیوان کو

ماجد بی۔اے

آئینۂ اکبری

قطرہ قطرہ سے نازک تر عین حباب ہستی ہے　　ذرہ ذرہ ہے سب فانی دنیا ایسی بستی ہے
پتہ پتہ کو اے ہمدم تیغ اجل کی کستی ہے　　بوٹہ بوٹہ کی رگ رگ میں بستی موت کی بستی ہے

ناممکن ہے تبدیلی لیکن جوہر اصلی میں
دھبہ نام کو آ نہیں سکتا آب گوہر اصلی میں

سب کا عقیدہ ہے عالم میں فانی ہرگز روح نہیں ہے　　میں یہ کہوں گا روح ہے خاتم اور خیال پاک نگیں ہے
حضرت اکبر آج کہیں ہیں جسم کہیں ہے روح کہیں ہے　　خاتم دل میں لیکن اب تک ان کا نگیں خیال کہیں ہے

برہم ہو گیا نظم عناصر لیکن وہ اب تک زندہ ہیں
مطلع اُردو پر شعراں کے بدر کی صورت تابندہ ہیں

دائرۂ شاہان مغل میں یکتا شاہ اکبر تھے　　دور حاضر میں اکبر بھی ملک سخن کے افسر تھے
اُن کے پاس خزانے تھے اور اُن کے تابع لشکر تھے　　ان کے دل میں گنج سخن تھے ان کے تحت سخنور تھے

اُن کے حکومت کے ڈنکے بجتے تھے کابل سے دکن تک
ان کے فصاحت کے سکے بیٹھے تھے تا تار و ختن تک

ان کی فطانت نے کھولا تھا تازہ باب دین الٰہی　　ان کی بلاغت نے سلجھائے پیچ و تاب دین الٰہی
اُن کے وقت میں زہد شکن تھا کیف شباب دین الٰہی　　ان کے وقت میں زاہد گر تھا دور شراب دین الٰہی

ان کی بزم میں تھیں زناریں اور ماتھے پر قشقہ تھے
ان کی بزم میں تھیں تسبیحیں اور زمیں پر سجدے تھے

شاہ اکبر کو کہتے ہیں سب وہ تھے تلوار کے سچے　　گھاٹ کے سچے باڑھ کے سچے اور اپنے کردار کے سچے
ہم یہ کہتے ہیں اکبر تھے ذہن گوہر بار کے سچے　　بات کے سچے فہم کے سچے اور اپنے اشعار کے سچے

ان کی نگاہیں تھیں سب سچی تھا ہر ایک نشانہ سچا
ان کی آنکھیں تھیں سچی اور آنکھوں کا پیمانہ سچا

اکبر کو جس شان میں دیکھو اکبر تھے ہر شان میں اکبر　　کنج قناعت میں اکبر تھے اور تھے ہر میدان میں اکبر

فہم میں اکبر ذہن میں اکبر طرز میں اکبر آن میں اکبر نظم میں اکبر نثر میں اکبر روح میں اکبر جان میں اکبر

عصمت کوش فصاحت ان کی پردہ پوش ظرافت ان کی

حاصل جوش بلاغت ان کی مایۂ ہوش متانت ان کی

روز بتاتے رہتے تھے وہ اپنی ہنسی میں کام کی باتیں آئینہ کردیتے تھے آغاز میں سب انجام کی باتیں

لطف حقیقت آجاتا تھا کرتے تھے جب جام کی باتیں صبح وطن میں کہہ دیتے تھے غربت والی شام کی باتیں

ہوگئی قسمت اپنی طالب ایسی اچھی محفل اُجڑی

ساری دنیا ہوگئی سونی جب سے عشرت منزل اجڑی

سنہ ۱۸۸۴ کے قریب قطعہ زمین معہ لگان خام خریدا گیا سنہ ۹۳ء کے قریب موجودہ صورت میں نئی تعمیر ہوئی۔

لسان العصر

اے لسان العصر اکبر ترجمان حسب حال　　تیرا رنگ قال مصداق زبان حسب حال
تھا سخن دانوں میں تو ہی نکتہ دان حسب حال　　ختم تجھ پر ہو گیا گویا بیان حسب حال
ہے عیاں تہذیب ماضی سے تمدن حال کا
تیرا مضموں آئینہ ہے حال و استقبال کا

جن کا لٹریچر ہے انگلش جن کی انگلش بول چال　　وضع انگلش قطع انگلش اور انگلش چال ڈھال
اُن کا ہادی ان کا مصلح ان کا ناصح حسب حال　　دوسرا تیرے سوا تھا کون اے روشن خیال
ظلمت افگن تھی نئی دنیا نرالی روشنی
تو نے ہر پہلو سے تاریکی پہ ڈالی روشنی

نور وحدت سے ہے عالم میں فروغ جزو و کل　　شمع ایماں پھونکنے سے بھی کہیں ہوتی ہے گل
دھوم ہو سائنس کی یا فلسفے کا شور و غل　　آسماں تک دوربینوں کے اگر بندھ جائیں پل
ہیچ ہیں مذہب کی عقل دوربیں کے سامنے
کیا ہے ذروں کی چمک مہر مبیں کے سامنے

دور ہو جس دیدۂ بینا سے ظلمت کا حجاب　　دیکھ لے جو ملت بیضا کا روشن آفتاب
غیب پر ایمان ہو آگے کھلی رکھی کتاب　　کیوں نہ ہو اس کا سخن سعدی و حافظ کا جواب
ہے بشر ناچیز اک ذات خدا بے عیب ہے
تو مگر اپنے زمانے کا لسان الغیب ہے

یوں تو ہر فطری سخنور کا سخن الہام ہے　　بادۂ الہام سے لبریز تیرا جام ہے
کس قدر برجستہ و مقبول خاص و عام ہے　　ساتھ شہرت کے قبولیت اسی کا نام ہے
کون ہے اک بیت بھی جس کو تری ازبر نہ ہو
کون ہے جس کی زباں پر تیرا شعر تر نہ ہو

ہوں یہاں دو چار تضمینیں ترے اشعار کی　　دیکھ کر جس کو کھلیں آنکھیں اُولُوالابصار کی

کد ہے حجت کی عبث جب حد نہیں اسرار کی — عقل نے تفتیش، ہمت فہم نے بیکار کی
"ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا"

راز اس کا کھل گیا تو ہم میں اس میں فرق کیا — تہ کو پہنچے کس طرح، دریا کجا قطرہ کجا
اپنی ہستی کی بتا سکتے نہیں جو ابتدا — کس سمجھ کس عقل پر پائیں گے اس کی انتہا
"ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

ایک ہے اس کا سا کوئی دوسرا ملتا نہیں — کوئی موقع ہی تحیر کے سوا ملتا نہیں
فلسفہ گم ہے اُسے بھی راستہ ملتا نہیں — کس کو ڈھونڈے جس کو اپنا ہی پتا ملتا نہیں
فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

مان لیں سائنس اگر دن کو بھی کہدے رات ہے — دیکھنے کا ہے یہ نکتہ سوچنے کی بات ہے
چشم ظاہر بیں فقط پابند محسوسات ہے — پا کے دو شیشیوں کے ٹکڑے زعم تحقیقات ہے
منزلوں دوران کی دانش سے خدا کی ذات ہے
دوربین و خوردبیں پر ان کی بس اوقات ہے

شفق رضوی

رسالہ اکبر

میرے معزز دوست ڈاکٹر اعظم کریوی کی تحریک سے انھیں کے بالاخانہ پر ۲۲ ستمبر ۱۹۲۵ء میں نوجوانان الہ آباد کی ایک مجلس ہوئی۔ دس بارہ حضرات تھے مگر سب کے سب پڑھے لکھے۔ سب کے سب جوشیلے اور ہمت والے تھے نہایت پراثر تقریریں ہوئیں اور آخر میں یہ طے پایا کہ

(۱) حضرت اکبر الہ آبادی کی یادگار قائم رکھنے کے لئے انھیں کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جلد سے جلد نکال دیا جائے۔

(۲) ہر موجودہ ممبر اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں دس روپیہ فنڈ میں داخل کردے۔

(۳) رقم اعانت یا عطیہ کسی سے نہ لیا جائے۔

(۴) جب رسالہ کو کامیابی ہو جائے تو ممبران کی رقم مع منافعہ رسدی کے واپس کردی جائے۔

(۵) مدیر جناب شرقی بی۔اے۔ معاونین مدیر حسین احمد کشفی بی۔اے۔ افضال احمد۔ طالب الہ آبادی۔ اسرار احمد اور خازن و ناظم اعظم کریوی مقرر ہوئے۔

یہ سب تھا مگر ایک گوشہ سے حضرت اکبر ایسے پیمبر سخن کا مصرعہ زباں بے زبانی سے فضا میں گونج رہا تھا۔ آخر احباب کے دوالے نکلے۔

انجمن کا نام دار الادب رکھا گیا۔ پہلا رسالہ اکتوبر کی آخر تاریخوں میں نکل گیا۔ انتخاب و معیار مضامین بہت بلند تھا ہر مضمون اور ہر شعر دار الادارہ کے اراکین کے سامنے پیش ہوتا تھا اور کافی بحث مباحثہ رد و قدح کے بعد مناسب ترمیم و تبدیلی کے ساتھ شایع کیا جاتا تھا۔

لوگوں نے اکبر کا خیر مقدم بہت اچھی طرح کیا۔ رسائل و اخبار نے خوب خوب تنقیدیں لکھیں۔ مضمون نگار بھی بہت بلند مرتبت حضرات مل گئے۔

قبولیت عامّہ کی تو معمولی سی مثال یہ ہے کہ ڈائرکٹر اور پبلک انسٹرکشن نے اس کو ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے تمام کتب خانوں اور دار المطالعوں کے لئے منظور کر لیا تھا اور باوجودیکہ اکبر سنہ ۲۶ء میں بند ہو گیا تھا مگر ابھی تک طلبی کے خطوط چلے آتے ہیں آج ۱۸ اپریل ہے، ۱۶ اپریل سنہ ۲۹ء کو شملہ سے داس صاحب کا خط اکبر کی طلبی میں مع ۱۰؍ ٹکٹ کے آیا تھا۔

معاصرین میں اکبر عزیز بھی تھا ممتاز بھی۔

اولیں مقصد یہ تھا کہ حضرت اکبر مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط و کلام شایع ہوتے رہیں اور مطبوعہ خطوط و کلام کی حکیمانہ اور بالغانہ تنقیدیں ہوتی رہیں۔

دوسرے ہی مہینہ میں سائز بھی بڑھا دیا گیا صفحات بھی ۹۶ کر دئے گئے اور زریں صفحات بھی شایع ہوئے تصویریں بھی ۱ سادہ چھپتی رہیں مگر نگاہ سوز اور اخلاق کش نہیں اور نہ غیر متعلق ہوتی تھیں۔

شذرات کی جگہ در بار اکبری کی مستقل سرخی تھی۔ اس کے کچھ اقتباسات دئے جاتے ہیں تاکہ مجلۂ مذکورہ کی رفتار حیات کا پتہ چل سکے۔

ہم نے ایک انجمن دارالادب کے نام سے قائم کی ہے اور اسی کے تحت میں رسالہ اکبر شایع کیا جا رہا ہے ہم اس رسالہ میں زندگی کے مختلف شعبوں پر آزادی سے بحث کریں گے ایک طرف اگر دور حاضرہ کا خیال ہوگا تو دوسری طرف عہد گذشتہ کا تذکرہ۔

مئی ۱۹۲۲ء سے ادارہ میں تبدیلی ہوگئی۔ اراکین بزم ادب ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ مالی مدد ہم کو بہت کم ملی اور ناچیز مرتب کے سر تمام اصراف آپڑے۔ چیف ایڈیٹر آغا علی خاں صاحب رئیس دریاباد ہوئے مدیر اعظم صاحب ہوئے اور نائب مدیر راقم الحروف ہوا۔

میں نے اپنی وسعت کے لحاظ سے اپنے نزدیک ایک خاص رقم اکبر کے لئے الگ کر لی تھی جب تک اس نے کفایت کی اکبر برابر نہایت شان سے نکلتا رہا جب وہ رقم ختم ہوگئی تو سید سجاد صاحب مالک، الکٹرک پریس الہ آباد نے اکبر کو لے لیا مگر افسوس کہ وہ بھی صرف ایک نمبر نکال سکے جو جولائی تا دسمبر تھا اس کے بعد سے بہت سے اہل دل کی داستانیں سننے میں آئیں مگر اب تک اکبر نہیں نکلا۔ میں نے اکبر کو حوالہ کر دینے کے بعد اپنے رقم کی کوئی خواہش نہیں کی تھی۔ پھر بھی لوگ سرمایہ لگانے کے لئے راضی نہیں ہوئے ہمارے ہاتھ سے رسالہ اکبر اس وجہ سے بھی نکل گیا کہ اعظم کریوی کا تبادلہ یکایک کوئٹہ بلوچستان کا ہوگیا اور اس طور پر نظام اکبر بالکل درہم برہم ہوگیا۔ اب ذیل میں دربار اکبری کے چند اقتباسات

اور دے کر روح فرسا معاملہ کو ختم کرتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہمت افزائی ہوئی اور پرستاران اکبر نے واقعی مدد دی تو رسالہ بھی دوبارہ نکالا جائے گا اور اکبر الٰہ آبادی کی موجودہ اشاعت میں جو خامیاں رہ گئی ہوں گی وہ بھی دور کر دی جائیں گی۔

دربارِ اکبری

ہم بار ہا کہہ چکے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ اجرائے رسالہ سے اراکین دارالادب کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں محض اس بھلائے ہوئے رہبر کی یاد تازہ کرنی مقصود ہے جو پردۂ شعر وسخن میں ہندوستان کا اکبر اعظم بن کر آیا تھا۔ اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہمدردان اُردو اپنی پیاری زبان کے محسن کو نہیں بھولے۔

رسائل کے معیار مذاق کی شکایت وغیرہ

ہم نے اکبر کی اشاعت اوّل میں عرض کیا تھا کہ اکبر کا مقصود کسی خاص قسم یا صنف کے مضامین کی اشاعت نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح لسان العصر مرحوم حادثات گذشتہ اور واقعات حاضرہ پر آزادی سے اظہار خیال فرمایا کرتے تھے وہی شان رسالہ میں بھی موجود رہنی چاہئے ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہے کہ بعض اصحاب رائے اکبر کے اجرا کو کسی خاص مصلحت پر مبنی سمجھتے ہیں ہم ان کی خدمت میں بادب گذارش کرتے ہیں کہ اکبر کا مشرب صلح کل اور اس کا مسلک تالیف قلوب ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ جب اکبر لسان العصر مرحوم کی یادگار میں جاری کیا گیا ہے تو اس میں چند صفحات سنجیدہ ظرافت کے لئے بھی وقف ہونے چاہئیں افسوس ہے کہ اس رنگ کے لکھنے والے اُردو میں بہت کم ہیں۔۔۔ جو حضرات اس قسم کے مضامین ارسال فرمائیں گے شکریہ کے ساتھ درج کئے جائیں گے۔

دیگر علمی رسالوں کی خدمات سے ملک کو اطلاع کرتے رہنا اکبر کا عین مقصد ہے۔

اکبر کی ہر دلعزیزی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہندی اور بنگالی رسالوں میں بھی اکبر کے مختصر فسانوں کے ترجمے اعزاز کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔

رسالہ اکبر کی اجرا کے بعد خیال تھا کہ جن لوگوں کو لسان العصر مرحوم کے تعارف کا شرف حاصل ہے جو خلد آشیاں کی شگفتہ مزاجی۔ بذلہ سنجی اور محبت کا دم بھرتے ہیں، جو مرحوم کی حکیمانہ باتوں فلسفیانہ

بحثوں مذہبی اور وطنی بحثوں پر سر دھنتے ہیں اور بقول عزیز ہمعصر "نہارستان" مرحوم کی ذات سے ارادت کا ادعا ہے اور جو ان کی زندگی میں اسی تعلق کی بدولت اپنی گرمی بازار کا سامان بہم پہنچاتے رہے، وہ رسالہ اکبر کی جو مرحوم کی یادگار میں جاری ہوا ہے توسیع اشاعت میں ضرور کوشش کریں گے لیکن

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

سوائے چند اصحاب کے جن کے مرحوم سے کوئی خاص مراسم بھی نہ تھے اور کسی زندہ دل "مسٹر" "مولانا" "سیدی" یا "مولائی" نے کوئی مدد نہیں کی۔ مدد تو بڑی چیز ہے۔ خطوط جو ان کی خدمت میں بھیجے گئے رسائل جو ان کی نذر کئے گئے ان کی رسید بھی نہ بھیجی۔ ایسے تمام بھائی بندوں کو اگر کوئی غلط فہمی ہوئی ہو تو معلوم ہونا چاہئے کہ اکبر کو مضامین لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ روپیہ کی ضرورت نہیں وہ تو صرف نظر لطف کا امیدوار ہے اگر اس کو افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ خیر تو اس فلسفی شاعر کو یاد کر لیتے ہیں مگر آپ لوگوں نے خلد آشیاں کے ساتھ ان کی وفات کے بعد جو قدردانی کا ثبوت دیا ہے اس پر دنیا مذاق اُڑا رہی ہے۔

میرے الٰہ آبادی و نیز دیگر احباب کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ میرا تبادلہ الٰہ آباد سے کوئٹہ (بلوچستان) کا ہو گیا ہے اور عنقریب میں ان سے جدا ہو جاؤں گا۔ الٰہ آباد میرا وطن تھا یہاں اگر کوئی تکلیف بھی تھی تو وہ میرے لئے راحت تھی۔ میں کوئٹہ ترقی پر جا رہا ہوں وہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے لیکن "حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر" کوئٹہ میں اپنے اعزا و احباب سے دور ہو جاؤں گا۔ یہاں کی صحبتیں یاد آئیں گی۔ سب سے زیادہ قلق اس کا ہے کہ اکبر، جس کی میں نے شروع ہی سے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے خدمت کی تھی مجھ سے چھوٹ رہا ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی معلوم ہوتی ہے کہ انجمن دارالادب میں علم دوست اصحاب کی کمی نہیں ہے اور اطمینان ہے کہ میرے بعد اکبر، اسی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔ مجھے قوی امید ہے کہ سید سجاد حسین صاحب۔ بھیا طالب۔ عزیزی مولوی اسرار احمد کے علاوہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے مایۂ ناز قابل قدر ہستیاں پروفیسر نعیم الرحمٰن مولوی سید ضامن علی۔ مسٹر حفیظ اور مولانا زبید احمد اپنے گراں قدر علمی اور ادبی مضامین سے اکبر، کی زینت بڑھاتے رہیں گے اور میں وطن سے دور کوئٹہ میں بیٹھا ہوا اکبر، کی روز افزوں ترقی پر اظہار مسرت کرتا رہوں گا۔

Talib Allahabadi

Akbar Allahabadi